مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

سیارہ ڈائجسٹ

جولائی 2012

PDFBOOKSFREE.PK

چیف جسٹس کے بیٹے پر الزامات

سازش یا حقیقت

فائدہ کس کا... اور نقصان کون اٹھائے گا؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

القرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ المائدہ

اے پیغمبر! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔ اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے۔ یقین رکھو کہ وہ کافروں کو (تمہارے مقابلے میں) کامیابی کی راہ ہرگز نہ دکھائے گا۔ صاف کہہ دو کہ "اے اہلِ کتاب! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ توراۃ اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔ ضروری ہے کہ یہ فرمان جو تم پر نازل کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھا دے گا[1]۔ مگر انکار کرنے والوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو۔ (یقین جانو کہ یہاں اجارہ کسی کا بھی نہیں ہے) مسلمان ہوں یا یہودی، صابی ہوں یا عیسائی، جو بھی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، بے شک اس کے لیے نہ کسی خوف کا مقام ہے اور نہ رنج کا۔

ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور ان کی طرف بہت سے رسول بھیجے مگر جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی خواہشات نفس کے خلاف کچھ لے کر آیا تو کسی کو انہوں نے جھٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا اور اپنے نزدیک یہ سمجھے کہ کوئی فتنہ رونما نہ ہوگا، اس لیے اندھے اور بہرے بن گئے۔ پھر اللہ نے انہیں معاف کیا تو ان میں سے اکثر لوگ اور زیادہ اندھے اور بہرے بنتے چلے گئے۔ اللہ ان کی یہ سب حرکات دیکھتا رہا ہے۔

(آیات ۶۷ تا ۷۱) (حوالہ تفہیم القرآن از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

(۱) یہ بات سن کر ٹھنڈے دل سے غور کرنے اور حقیقت کو سمجھنے کی بجائے وہ ضد میں آ کر اور زیادہ شدید مخالفت شروع کر دیں گے۔

الحدیث

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نفلی نمازیں دو دو رکعتیں کر کے پڑھنی چاہئیں

سیّدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں تمام کاموں میں استخارہ کی تعلیم فرمایا کرتے تھے (اور اس اہتمام کے ساتھ کہ) جس طرح ہمیں آپ ﷺ قرآن کی کسی سورت کی تعلیم فرماتے تھے۔ آپ ﷺ فرماتے تھے کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی کام کا قصد کرے تو اسے چاہیے کہ نمازِ فرض کے علاوہ دو رکعت نماز پڑھے اور نماز کے بعد کہے (ترجمہ) "اے اللہ! میں تیرے علم سے طلبِ خیر کرتا ہوں اور تیری قدرت سے طاقت مانگتا ہوں اور تجھ سے تیرا فضلِ عظیم چاہتا ہوں، بیشک تُو قدرت رکھتا ہے اور میں قدرت نہیں رکھتا اور تُو جانتا ہے اور میں نہیں جانتا، تُو چھپی باتوں کو جاننے والا ہے۔ اے اللہ! اگر تُو جانتا ہے کہ یہ کام میرے دین اور دنیا میں اور میرے کام کے آغاز اور انجام میں بہتر ہے تو اس کو میرے لئے مقرر کر دے اور اس کو میرے لئے آسان کر دے اور اگر تُو جانتا ہے کہ یہ کام میرے لئے مضر ہے، میرے لئے دین میں یا دنیا میں اور میرے کام کے آغاز میں اور انجام میں تو اس کو مجھ سے علیحدہ کر دے اور مجھ کو اس سے علیحدہ کر دے اور جہاں کہیں بھلائی ہو وہ میرے لئے مقدر کر دے اور اس سے مجھ کو خوش کر دے" آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اور اپنی حاجت کو (اللہ سے) عرض کر دے۔

(بحوالہ: مختصر صحیح بخاری)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس شمارے میں

2	القرآن	ضیاء القرآن	قرآن ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے!
3	الحدیث	ادارہ	نفلی نمازیں دو دو رکعتیں کر کے پڑھنی چاہئیں!
14	دستک	کامران امجد خان	"روشن پاکستان کی نوید"
49	خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں	قلندر حسین سید	ایسی بے مثال تحریروں کا گلدستہ جنہیں چننے کیلئے درجنوں کتابوں کی عرق ریزی درکار ہوتی ہے!
67	پھپھو نے کہا.....	پروفیسر محمد ظریف خان	عمروں کے بھید ٹٹولتی طنز و مزاح سے بھرپور شگفتہ تحریر!
79	آئینے کا جھوٹ	صلاح الدین شیخ	ایک خود بین اور خود آگاہ عورت کا فسانہ..... وہ آئینے کے جھوٹ کو سچ سمجھتی تھی!
90	یہ قربتیں۔۔یہ فاصلے	زاہدہ یوسفی	ایک شخص کا فسانہ.....وہ منزل پا کر بھی تشنۂ گام رہ گیا!
97	ظالم مہمان	نواز خان	جرم و سزا پر مبنی خصوصی کہانی، انسپکٹر نواز کی زندگی کا ایک ناقابل فراموش تجربہ!
122	زرگزیدہ	محمد سلیم اختر	بوڑھے جوڑے کی کہانی..... دولت کی چمک نے ان کی آنکھیں چندھیا دی تھیں!
17	چیف جسٹس کے بیٹے پر الزامات سازش یا حقیقت.....؟ فائدہ کس کا.....نقصان کون اٹھائے گا؟		
133	خون آشام محافظ شکار بعض اوقات منطق کے بل بوتے پر بھی کھیلے جاتے ہیں.....!		
141	مچھروں سے بچاؤ کی آسان تراکیب ڈاکٹر محمد طارق اپل		
129	نکولس آگسٹ اوٹو	مائیکل ہارٹ	جدید موٹر کاروں کے لیے بنیاد فراہم کرنے والے موجد کی داستانِ حیات!
149	دعویدار	لطیف کاشمیری	ایک شخص کی محرومیوں کی کہانی..... تنہائی ہی اس کا واحد "اثاثہ" تھی!
155	سیارہ مشورہ کلینک	ڈاکٹر ندیم چوہدری	آپ علامات لکھ کر بھیجیں، ڈاکٹر صاحب نسخہ تجویز کریں گے!
163	میزبان دوشیزہ	عذرا اصغر	ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کا المناک المیہ..... جسے گھریلو ذمہ داریوں کے بوجھ نے عشرت کدے کی رونق بنا دیا!
173	اپنے حصے کی روشنی	عرفان جاوید	ایک بچے کی کہانی..... جس کے سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا!
182	بزم شاعری	ادارہ	باذوق قارئین کے کلام و انتخاب پر مبنی مقبول ترین سلسلہ!
187	گردے کے امراض	حکیم راحت نسیم سوہدروی	پاکستان میں تیزی سے پھیلتے مرض اور اسکے علاج بارے معلوماتی تحریر!
193	اجنبی مہربان	جاوید راہی	پراسرار میزبانوں کے ساتھ گزاری ایک یادگار رات کا قصہ!
197	صاحب جی	ڈاکٹر درخشاں انجم	ایک عورت کی کتھا جس نے کسی کے لیے اپنا سب کچھ تیاگ دیا تھا!
209	زندہ قبر	ایس امتیاز احمد	دوسری جنگ عظیم کی خوفناک کہانی..... ہیروشیما جل کر خاکستر ہو گیا مگر وہ لوگ زندہ رہے!
84	ہتھیار بند مچھلیاں سید آفتاب امین		مختلف ہتھیاروں سے لیس مچھلیوں کے بارے میں دلچسپ مضمون!
177	سیارہ کچن کارنر جویریہ کامران		رمضان المبارک اور موسم گرما کی مناسبت سے جلد تیار ہو جانے والی ہلکی پھلکی ذائقہ دار ڈشز کی تراکیب
75	سپنوں کا اڑن کھٹولا		سراب کو منزل سمجھ کر توقعات وابستہ کر لینے والی لڑکیوں کے بارے میں اثر انگیز تحریر! عارف محمود اپل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

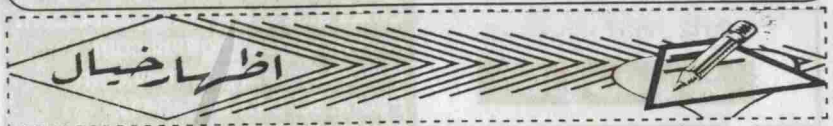

غیر فطری کہانیوں کے تراجم

مکرمی جناب! امجد رؤف خان صاحب!

السلام علیکم۔ میرا نام عبدالرؤف ہے اور میں قریب 20 سال سے دبئی میں مقیم ہوں تاہم ان برسوں میں سیارہ ڈائجسٹ سے میری رفاقت کا یہ عالم ہے کہ آج تک کبھی کوئی شمارہ میں نے اس کا مس نہیں کیا بلکہ میرے پاس پرانے شماروں کا ایک وسیع سٹاک موجود ہے جس کو وقتاً فوقتاً استعمال میں لاتا رہتا ہوں۔ بہرحال اس بار خط لکھنے کا مقصد آپ کی توجہ ایک اہم چیز کی طرف مبذول کرانا ہے اور وہ یہ کہ گزشتہ چند ماہ سے میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کے شمارے میں کچھ غیر فطری اور ہمارے کلچر سے قطعی مختلف کہانیاں شائع ہو رہی ہیں بالخصوص جو لوگ ترجمہ شدہ کہانیاں آپ کو ارسال کرتے ہیں وہ انتہائی عجیب اور مافوق الفطرت واقعات پر مبنی ہوتی ہیں پھر انہیں پڑھ کر ایک عجیب وحشت سی طاری ہو جاتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ غیر ملکی ادب سے انتخاب نہیں ہونا چاہیے لیکن براہ کرم ایسا مواد شائع کریں جس سے پڑھنے والوں کے ذہنوں پر یاسیت اور افسردگی طاری نہ ہو۔ بہت اچھی اور اعلیٰ پایہ کی تحریریں بھی عالمی ادب میں موجود ہیں جن سے مواد منتخب کیا جا سکتا ہے لہٰذا میری بالخصوص ایس امتیاز احمد اور محمد سلیم اختر صاحب سے درخواست ہے کہ ترجمہ شدہ کہانیوں کا انتخاب کرتے ہوئے میری گزارش کو مدنظر رکھیں۔

(عبدالروف، دبئی)

.....

نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی

محترم کامران امجد خان صاحب! السلام علیکم۔ ماشاء اللہ سیارہ ڈائجسٹ تیزی سے مقبولیت اور کامیابیوں کی منزلیں طے کر رہا ہے جس میں آپ کی ادارت اور کاوشوں کا بے حد دخل ہے۔ بالخصوص جس طرح آپ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کر کے انہیں اچھی تحریریں تخلیق کرنے کا حوصلہ بخشتے ہیں وہ لائق تحسین ہے۔ فاطمہ چودھری، ایمان خان، عاصمہ تمنا چودھری اور دیگر کئی نئے لکھنے والے خوب تخلیقات کر رہے ہیں۔ میں بالخصوص عاصمہ تمنا کی تحریروں سے متاثر ہوئی ہوں۔ اپنی تحریر ''ضد'' میں انہوں نے بہت ہی پختگی سے کہانی کو بیان کیا ہے۔ اللہ انہیں مزید زور قلم عطا فرمائے (آمین)۔ سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور خوبی اسے دیگر میگزینز سے ممتاز بناتی ہے کہ اس میں ہر ماہ تحقیقی مضامین اور نئی تحقیق کے حوالے سے دلچسپ تحریروں کو جگہ دی جاتی ہے، اس سے قارئین کو ہر ماہ نئی چیزیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ امید ہے کہ آپ اس معیار کو برقرار رکھتے ہوئے ہماری امیدوں پر پورا اُتریں گے!

(خالدہ حامد، کراچی)

.....

جادو، خواتین اور اسلام

محترم جناب مدیر اعلیٰ سیارہ ڈائجسٹ! السلام علیکم۔ سیارہ ڈائجسٹ ہر سال جو خصوصی نمبر شائع کرتا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ آپ کا ہر خاص نمبر

ایک ایسی دستاویز ہوتا ہے جو ہر گھر کی ضرورت اور ہر مسلمان کے لیے لائق مطالعہ ہوتا ہے۔ اس برس آپ جادو، خواتین اور اسلام کے عنوان سے خصوصی نمبر شائع کر رہے ہیں جو غالباً ماہ جولائی میں دستیاب ہوگا۔ یہ خصوصی نمبر یقیناً وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اور اس سے لاکھوں ایسے لوگوں کا بھلا ہوگا جو اپنی کم علمی اور سمجھ بوجھ نہ رکھنے کے سبب پیشہ ور عاملوں اور جاہل جادوگروں کے ہتھے چڑھ کر دین و دنیا خراب کر بیٹھتے ہیں۔ مجھے اس خصوصی نمبر کا ذاتی طور پر بے چینی سے انتظار ہے۔

(علی احمد، گوجرانوالہ)

.....

روح میں تازگی محسوس ہوئی

جناب ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم۔

تازہ شمارہ موصول ہوا۔ سرورق خطرناک تھا (دنیا کے پراسرار واقعات کے حوالے سے تو ٹھیک ہی تھا)۔ جون کی زبردست گرمی، مہنگائی کا سیلاب، لوڈشیڈنگ کا عذاب، اوپر سے خطرناک سرورق دیکھ کر موڈ مزید بگڑ گیا (یہ میری ذاتی رائے ہے، دیگر قارئین کی رائے مختلف ہوسکتی ہے)۔

''چن لیا میں نے تمہیں'' بے حد اچھی تحریر تھی۔ اختتام بڑا دلپسند تھا۔ ''راہِ عشق میں'' بے حد اچھی تحریر تھی۔ آخری جملہ میں نے اسلام صرف اللہ کے لیے قبول کیا، بڑا اچھا لگا۔ روح میں تازگی محسوس ہوئی۔ نواز خان کی کہانی ہمیشہ کی طرح اچھی تھی۔ اس میں یاسمین کا کردار بڑا اچھا تھا۔ ایس امتیاز احمد کی ''ہیروئن کا قتل'' مختصر مگر دلچسپ تحریر تھی۔

خرم احمد خاں کی بوانا سمبا بھی اچھی لگی۔ میں شکاریات پر مبنی تحریر کبھی نہیں پڑھتی مگر آج پڑھی تو اچھی لگی۔ شیر اور شرنی کا مقابلہ صاحب تحریر نے خوب کیا۔ تحریر ذرا مختصر تھی۔ تشنگی محسوس ہوئی۔ ذرا تفصیل ہونی چاہیے تھی (زیادہ نہیں)۔ عارفہ صبح خاں کی ''رقیب روسیاہ'' قابل ستائش ہے، پڑھ کر مزا آیا۔ مسکرانے پر مجبور ہو گئے۔ رونی خاں نے انٹرویو میں کامیابی کے گر بھی اچھے بتائے ہیں۔ نوجوانوں کو عمل کرنا چاہیے۔ ''بزمِ شاعری'' میں آسناتھ کنول کی حمد بے حد بھلی لگی۔ اقبال نسیم کی نظم ''خالی ہاتھ'' حالات حاضرہ کی بہترین عکاس ہے۔ میری غزل شامل فرمانے کا بے حد شکریہ۔

(یاسمین کنول، پسرور)

.....

خصوصی توجہ کی ضرورت

محترم ایڈیٹر صاحب!

جون 2012ء کا سیارہ ڈائجسٹ اپنی تمام تر خوبصورت تحریروں اور متنوع رعنائیوں سمیت موصول ہوا..... آپ کا اداریہ پڑھ کر وزیراعظم صاحب کے لندن کے انٹرویو کے تمام مناظر ذہن میں دوبارہ تازہ ہو گئے اور ساتھ ہی قومی اسمبلی میں بجٹ پیش ہوتے وقت ہمارے بہت سے سیاستدانوں نے دنیا بھر کے سامنے اپنی مار پیٹ اور گالم گلوچ کا جو منظر پیش کیا وہ بھی یاد آ گیا..... خدا کا شکر ادا کیا کہ اب میں سعودی عرب میں نہیں ہوں ورنہ جب بھی پاکستان میں کوئی ایسا واقعہ (بلکہ اسے تو سانحہ کہنا چاہیے) پیش آتا تو ہمارے سعودی اور دوسرے عرب ممالک سے تعلق رکھنے والے دوست اور ہم کار ہمیں دکھ بھری اور کسی حد تک طنزیہ نظروں سے بھی دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ تم پاکستانی اپنے ملک کا کیا حشر کر رہے ہو؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پروفیسر ڈاکٹر فضل کریم کی کتاب میں سے دنیا کے مشہور پراسرار واقعات کے اقتباسات بہت دلچسپ بلکہ حیرت میں ڈالنے والے تھے لیکن اڑن طشتریوں اور برمودا تکون کے موضوعات پر اس کتاب کے بعد مزید بہت کچھ سامنے آچکا ہے اور اردو میں بھی ماضی قریب میں ان پر بہت سارا تازہ ترین مواد موجود ہے اس لیے یہ حصے کچھ ''آؤٹ آف ڈیٹ'' محسوس ہوئے۔

محترمہ نسرین اختر نینا کی کہانی ''رہِ عشق میں'' عشق مجازی سے عشق حقیقی کی جانب بتدریج انقلابی سفر کی خوبصورت داستان ہے۔

''بزمِ شاعری'' آپ کی مزید اور خصوصی توجہ چاہتی ہے۔ جو چیز ذوق شعر کو مجروح کرتی ہے وہ بے وزن اور بے سروپا سطریں ہیں جنہیں غزل یا نظم کہہ کر شائع کیا گیا ہے۔ پھر معروف اور سینئر شاعرہ محترمہ ادا جعفری کی عمدہ نظم، سعد اللہ شاہ، بشیر نواز، آسناتھ کنول، خادم حسین خاکسار، یاسمین کنول اور ابراہیم اشک کی شعری تخلیقات بھی جو کہ فنی لحاظ سے اچھی اور معیاری ہیں، دوسری بے وزن مبتدیانہ ''شعری تخلیقات'' میں شامل کر دینا اچھا نہیں لگا۔ اگر ''مبتدیانہ'' تخلیقات شائع کرنے کی کوئی مجبوری ہے تو انہیں الگ طور پر شائع کریں۔

''ایک سو ستاون مینڈھیوں والی دلہن'' کا عنوان آپ نے ''مینڈھیوں'' کو ''مینڈھوں'' میں بدل کر دلہن بے چاری کو چرواہن بنا ڈالا! ستار طاہر مرحوم کی یہ کہانی شاید پہلے بھی کہیں پڑھ چکا ہوں۔ بہت عمدہ اور ایک تہذیبی ورثے کی عکاس ہے۔

محترمہ شوکت افضل کی کہانی ''چن لیا میں نے تجھے'' بھی دلچسپ اور کسی حد تک تجسس کی حامل کہانی ہے جس میں دلہا کو اپنی ماں کا حکم مان لینے پر اس کا اپنا من مانا ''تحفہ'' اپنی محبوبہ کو دلہن کے روپ میں دیکھ کر ملتا ہے۔

(نسیم سحر، راولپنڈی)

.....

مبارکباد

جناب محترم کامران امجد خان صاحب!

السلام علیکم۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ماہ رواں کا ''سیارہ ڈائجسٹ'' ہمارے سامنے ہے۔ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ کہانیوں اور غزلوں کا انتخاب لاجواب رہا۔ ہماری تحریریں شائع کرنے کا شکریہ۔ مزید مواد ارسال خدمت ہے۔ براہ کرم قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ آپ کو اور دیگر سٹاف اور ''سیارہ ڈائجسٹ'' کے تمام قارئین کو ماہ رمضان کی ایڈوانس مبارکباد!

(ایس۔ امتیاز احمد، کراچی)

.....

اعزاز

محترم جناب ایڈیٹر صاحب! سیارہ ڈائجسٹ لاہور!

مجھے اعزاز حاصل ہے کہ پچھلے سال میرے افسانے اور نظمیں سیارہ ڈائجسٹ میں چھپ چکے ہیں جس کے لیے ادارے کا شکرگزار ہوں۔ اب میں ایک نثری نظم ''ماں کی میت پر'' کے عنوان سے بھیج رہا ہوں۔ امید ہے ضرور پسند آئے گی۔ آئندہ شمارے میں شائع فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

(ابن انعام علی رضا)

☆ انعام علی رضا صاحب! آپ کی نظم طوالت کے باعث شائع نہیں ہو سکی جس کے لیے ہم

معذرت خواہ ہیں!

.....

کوئی پرسان حال نہیں

محبی جناب کامران امجد خاں صاحب! السلام علیکم۔

سیارہ ڈائجسٹ شمارہ جون اعزازی موصول ہوا۔ شکریہ قبول فرمائیں۔ ''خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں'' معزز قارئین میں مقبول چلا آتا ہے۔ چشم بددور! اس بار کمپوزر نے غلطی سے صفحہ 50 پر جناب شورش کاشمیری کی کتاب ''بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل'' کو ''بوئے گل نار دل دود چراغ محفل'' کمپوز کر دیا ہے!

ہم دعا لکھتے رہے وہ دغا پڑھتے رہے
ایک نقطہ نے محرم سے مجرم کر دیا

کہاں نالہ دل اور کہاں نار دل؟

ہم نے پہلے ہی غلطی کر کے غلط حکمرانوں کو اپنے اوپر مسلط کر لیا ہے۔ وہ بڑے وثوق سے کہتے ہیں کہ عوام نے ہمیں پانچ سال کے لیے منتخب کیا ہے! انہیں اپنی اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں کا احترام بھی نہیں۔ ملک میں لوڈشیڈنگ نے عوام کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ ہم کہتے نہیں تھکتے کہ ہمارا ملک ایٹمی ٹیکنالوجی کا حامل ہے۔ وہاں ایٹمی طاقت کا بھلا کیا عمل دخل جہاں الیکٹرک پاور نہ ہو اور شدید گرمیوں میں 12 تا 14 گھنٹے کی طویل لوڈشیڈنگ ہو۔ وہ ملک بھلا خاک ترقی کرے!

ہمارے ملک میں ہر نیا سورج ایک نیا المیہ لے کر طلوع ہوتا ہے۔ ابھی ہم کراچی میں ایک ریلی پر اندھا دھند فائرنگ سے ہلاک ہونے والوں کا غم نہ بھول پائے تھے کہ نواب شاہ میں کراچی سے اٹک جانے والی بس پر فائرنگ سے 18 افراد قسمۂ اجل بن گئے۔ آخر ان کا قصور؟ کیا ترقی یافتہ ملکوں میں بھی ایسے ہی ہوتا ہے؟

کہیں فرقہ بندی ہے تو کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اس ملک کا کوئی پرسان حال نہیں۔ حکمران اقتدار کے نشے میں نہرو کی طرح سب اچھا ہے کا راگ الاپ رہے ہیں اور روم جل رہا ہے۔

''آخر بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی؟''

دل خون کے آنسو روتا ہے۔ آخر کبھی تو کسی کو رحم آئے گا۔ غالب نے کہا تھا۔

دل کو روؤں یا جگر کو پیٹوں
مقدور ہو تو ساتھ نوحہ گر کو رکھوں میں

(قلندر حسین سید، احمد پور شرقیہ)

.....

شمع کی صورت

محترم ایڈیٹر سیارہ ڈائجسٹ لاہور!

جناب عالی! گزشتہ تین ماہ سے کوئی مہربان مسلسل مجھے یہ رسالہ یعنی سیارہ ڈائجسٹ بھیج رہا ہے اور خود ابھی تک ایک معمہ بنا ہوا ہے مگر مجھے ڈائجسٹ کی تحریریں پڑھ کر حیرانی ہوئی کہ اس ادب کے زوال عہد میں یہ ایک شمع کی صورت روشنی دکھا رہا ہے۔ اللہ اسے مزید کامیابیاں نصیب کرے۔ غزل اور نظم کے صفحات بڑھائیں تاکہ مزید کلام زینت صفحات بن سکے۔ آپ سب کو سلام۔ ایک غزل بھیج رہا ہوں امید ہے مایوس نہیں کریں گے۔

(زاہد محمد علی، شکرگڑھ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

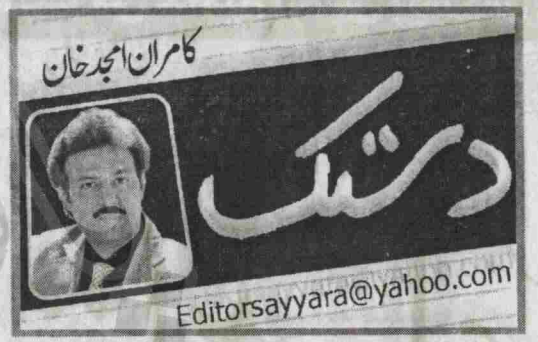

”روشن پاکستان کی نوید“

ہمارے ملک میں اس وقت اگر کوئی ادارہ اس قابل ہے کہ جس کی عظمت اور احترام کی گواہی پوری قوم دے سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف سپریم کورٹ آف پاکستان ہے۔ یہی وہ ادارہ ہے جس پر ہر پاکستانی کو اعتماد ہے اور وہ اسے اُمید کی آخری کرن نظر آتا ہے..... مگر ظالموں نے اسی ادارے پر انتہائی کاری ضرب لگانے کی کوشش کی ہے۔ میرے ملک کے عوام کی واحد اُمید کو مٹی میں ملانے کی ناپاک کوشش کی گئی ہے۔ ان وطن دشمنوں نے اپنے راستے کی واحد رکاوٹ کو گرانے کی اپنی سی مذموم سازش کی ہے..... لیکن وہ بھول گئے تھے کہ یہ ادارہ اور اس کی عظمت پاکستانی قوم کے لیے ہر چیز سے بڑھ کر ہے، پوری قوم سپریم کورٹ کے پیچھے سہارا بن کر کھڑی ہے۔ شاطروں نے اپنے تئیں بڑا زبردست جال بُنا تھا اور انہیں یقین تھا کہ اس بار وہ ضرور کامیاب ہو جائیں گے، عدل و انصاف اور شفاف نظام کی علمبردار عدلیہ کو ہٹا کر ایک بار پھر اپنے مطلب کی عدالتیں لانے میں کامیاب ہو جائیں گے تاکہ ان کی کرپشن پر ہاتھ ڈالنے والا کوئی نہ رہے اور وہ کھل کر من مانیاں کرتے پھریں لیکن اعلیٰ عدلیہ نے کیا خوب کہا کہ سپریم کورٹ پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت اور نظر کرم ہے اس لیے اس کے خلاف سازشیں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔

ذرا غور کیجئے..... سازشیں رچانے والوں کو کیسی ذلت و رسوائی کا منہ دیکھنا پڑا ہے، انکا خیال تھا کہ چیف جسٹس کے پیٹے کو ملوث کریں گے تو عدل و انصاف قائم نہیں رہ سکے گا اعلیٰ عدلیہ کو جھکنا ہی پڑیگا لیکن یہ ان کی بھول تھی، انصاف بھی ہوا اور عدلیہ نے ہر ایک کے خلاف تادیبی کارروائی کا حکم دیکر واضح کر دیا کہ یہاں ہر ایک کے لیے ایک جیسا قانون ہے۔ پھر وہ وزیراعظم کا بیٹا ہو یا چیف جسٹس کا۔

قارئین خوب جانتے ہیں کہ سپریم کورٹ کیوں کچھ لوگوں کو کانٹے کی طرح چبھتی ہے..... اس کی وجہ ہے کہ یہ سپریم کورٹ ہی ہے جو این آر او کا کیس کھول کر سوئس اکاؤنٹس سے قوم کے اربوں روپے واپس لانے کے لیے ڈٹ جاتی ہے، سپریم کورٹ ہی رینٹل پاور میں ”سرکاری ڈکیتیوں“ کو بے نقاب کرتی ہے، پھر حج سکینڈل میں اربوں روپے ہڑپ کرنے والوں کو پابند سلاسل کرتی ہے اور کبھی این ایل سی کیس کے مجرموں کے خلاف فیصلہ سناتی ہے۔ کبھی روڈک کمپنی کیس میں ملک کے نایاب ذخائر کو کمیشن کھا کر غیر ملکیوں کو سونپنے والوں کا راستہ روکتی ہے تو کبھی بلوچستان میں ہونیوالی زیادتیوں پر ظلم کے خلاف واحد آواز بن جاتی ہے۔ یہ جرأتمند ادارہ ہی سیاستدانوں کی کرپشن پر گرفت کرتا ہے اور یہی ادارہ ہے جو آئی ایس آئی، آئی بی اور فوج کو بھی براہ راست ماورائے قانون اقدامات پر زچ کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہی ادارہ ہے جو عوام سے ہونے والی زیادتیوں کا نوٹس لے کر جواب طلبی کرتا اور سزا دیتا ہے۔ سپریم کورٹ ہی وزیراعظم اور جرنیلوں کو کٹہرے میں کھڑا ہونے پر مجبور کر دیتی ہے..... الغرض گزشتہ ساڑھے چار برس میں سپریم کورٹ نے اس ملک میں عدل و انصاف کا نظام قائم کرنے اور قانون کی بالادستی کے لیے ہر ممکن اقدام کیا ہے۔ بڑے سے بڑے مجرم کو قانون کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا ہے۔ سو یہی بات ان ”مگرمچھوں“ کو ہضم نہیں ہوئی جو اس ملک کی تاریخ کی چھ دہائیوں میں کرپشن اور ماورائے قانون اقدامات کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ انہیں سپریم کورٹ اپنی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ محسوس ہوتی ہے۔ یہ لوگ برداشت ہی نہیں کر پا رہے کہ ایک ایک کر کے ان کی لوٹ مار، کرپشن اور عوام کے استحصال کی راہیں بند ہوتی جا رہی ہیں۔

بعض لوگوں نے اس سارے معاملے میں ایک عجیب منطق سے خود کو اعلیٰ و ارفع خیالات کا مالک بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں کسی کی ذات کو نہیں بلکہ ادارے کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ سپریم کورٹ کے احترام اور عزت پر حرف نہیں آنا چاہیے۔ افراد تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ لوگوں نے یہ منطق پیش کی کہ سپریم کورٹ کے باقی جج یہ فیصلہ کریں کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ..... یعنی یہ عدلیہ کو تقسیم کرنے اور جناب چیف جسٹس کی ذات کو متنازعہ بنانے کی ایک بھونڈی کوشش تھی۔ بدقسمتی سے ایسی رائے رکھنے والوں میں عدلیہ بچاؤ تحریک کے سرگرم راہنما اعتزاز احسن بھی شامل تھے..... خیر نتیجہ کیا ہوا، سب کے سامنے ہے، یہ رائے رکھنے والوں کو منہ کی کھانی پڑی۔ عدلیہ تقسیم ہوئی اور نہ سازشیوں کی سازش کو کامیاب ہونے دیا بلکہ آج اعتزاز احسن اور زاہد بخاری کی بار رکنیت معطل ہے اور ان کے بارز میں داخلے پر پابندی لگ چکی ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ چیف جسٹس کی ذات اتنی اہم نہیں بلکہ سپریم کورٹ کی بحیثیت ادارہ اہمیت زیادہ ہے، میرا ان سے سوال ہے کہ جناب افتخار محمد چودھری سے قبل یہی عدلیہ تھی اور سپریم کورٹ کا ادارہ بھی یہی تھا..... کیا اس وقت کی عدلیہ اور آج کی عدلیہ میں کوئی فرق نہیں۔ ان لوگوں

Coudesy www.pdfbooksfree.pk

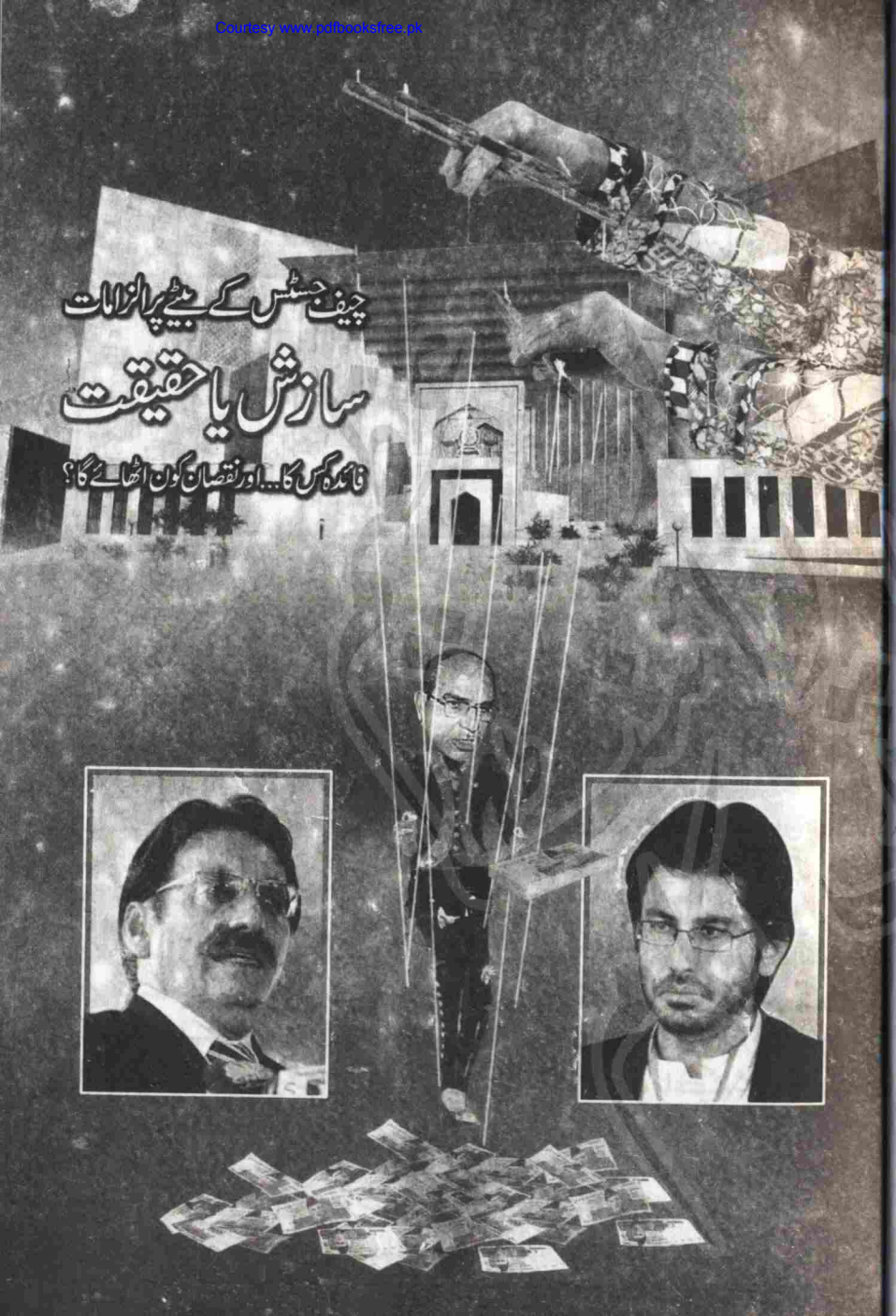

سے پوچھا جائے کہ وہ کون تھا جس نے حاضر سروس جرنیلوں کے نرغے میں حق سچ کی راہ ترک کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ کون تھا جس نے ملکی تاریخ میں ایسے سوموٹو ایکشن لیے جن کی ملک کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ وہ کون تھا جو عوام کی دولت لوٹنے والوں کے خلاف سینہ سپر ہو گیا اور وہ کون ہے کہ جس نے کبھی نہ جھک کر اور کبھی نہ بک کر اس عدلیہ کے لیے ایک مثال قائم کر دی ہے اور اس ملک کو عدل و انصاف کی راہ پر گامزن کر دیا ہے..... مجھے کہنے دیجئے کہ یہ صرف اور صرف چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی ذات تھی اور ہے جو حقیقت میں پاکستانیوں کے لیے اصل امید ہیں۔ چیف جسٹس نے اس موجودہ عدلیہ کی ٹھوس بنیادیں استوار کی ہیں اور خود مثال بن کر اپنے ساتھی ججوں کو بھی اس اعلیٰ ترین منصب کے تقاضوں سے روشناس کرایا ہے اور سپریم کورٹ کو ملک توڑنے والوں کے لیے ایک ڈراؤنا خواب بنا دیا ہے۔

ملک ریاض اور اسے کٹھ پتلی بنا کر استعمال کرنے والے ایسی سازشیں رچاتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ایسا کرتے رہیں گے لیکن انشاء اللہ کبھی اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب نہیں ہو پائیں گے کہ اللہ تعالیٰ حق سچ کی راہ میں چلنے والوں کو اور اس پر قائم رہنے والوں کی مدد کرتا ہے۔ سپریم کورٹ نے جس طرح اپنے خلاف بُنے جال کو واپس ''شکاریوں'' کی طرف موڑ دیا ہے اس سے یہ شاطر لوگ خود اپنے دام میں پھنس چکے ہیں اور راہ فرار تلاش کر رہے ہیں۔ سپریم کورٹ نے اپنے قابل تحسین فیصلے سے پاکستان کو ایک بہت بڑے بحران سے نجات دلا دی ہے۔ سپریم کورٹ نے نہ صرف اس سازش کو ناکام بنا دیا ہے بلکہ اس کو ایک مثبت سمت دیدی ہے جس کے خوش آئند اثرات سامنے آنے لگے ہیں۔ اب ملک میں کرپشن کرنے والے ہر شخص کو کئی بار سوچنا ہوگا..... پھر چاہے وہ صحافی ہو، جرنیل ہو، سیاستدان ہو، جج ہو یا کسی بھی اور اعلیٰ عہدے پر براجمان شخص اس کے لیے کرپشن کرتے ہوئے یہ ضرور سوچنا ہوگا کہ ایک ادارہ اس ملک میں ایسا ضرور ہے جو خود کرپشن کرتا ہے اور نہ کسی کو کرنے دیتا ہے اور اس کے نزدیک کوئی بھی قانون سے بالاتر نہیں۔ ملک ریاض کے الزامات نے بہت بڑا بحران پیدا کیا لیکن اس کی وجہ سے اب پہلی بار صحافیوں، ججوں اور جرنیلوں کے اثاثوں کی چھان بین اور سب کے احتساب کی باتیں ہونے لگی ہیں۔ یہ ایک مثبت اور درست سمت کی طرف سفر کا آغاز ہے جو دراصل سپریم کورٹ کی ملک میں قانون کی حکمرانی کیلئے جدوجہد کا ثمر ہے۔

سپریم کورٹ نے اس ملک کے عوام کو یہ خوشخبری عطا کی ہے کہ کرپشن کرنے والوں، ملک توڑنے والوں اور عوام پر ظلم کرنے والوں کے خلاف سپریم کورٹ کے انقلابی اقدامات جاری رہیں گے اور اس ملک میں عدل و انصاف اور قانون کی حکمرانی قائم ہو سکے گی۔ مجرم خواہ کتنے ہی شاطر، کتنے ہی بااثر اور طاقتور ہوں بالآخر قانون کے کٹہرے میں آئیں گے..... اور یہی مستقبل کے روشن پاکستان کی نوید ہے!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چیف جسٹس کے بیٹے پر الزامات سازش یا حقیقت.....؟

سیارہ رپورٹ

آج کل پوری قوم چیف جسٹس آف پاکستان جناب جسٹس افتخار محمد چوہدری کے صاحبزادے ڈاکٹر ارسلان افتخار کے کیس میں اُلجھی ہوئی ہے اور ہر جگہ اس حوالے سے اندازے قائم کیے جا رہے ہیں کہ یہ معاملہ کیا رُخ اختیار کرے گا۔ سپریم کورٹ آف پاکستان نے اس ازخود نوٹس کیس کا تاریخی اور انصاف کے تقاضوں پر مبنی فیصلہ سنا کر سازشیوں کی سازش کو بہت حد تک ناکام بنا دیا ہے لیکن یہ سازشی قوتیں آسانی سے ہار ماننے والی نہیں اور آزاد عدلیہ کے پر کاٹنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔

صرف یہی ایک کیس نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی کیس ایسے تھے جنہوں نے قوم کو ہیجان اور بے چینی سے دوچار کیے رکھا اور اسے اپنے اصل مسائل کے بارے میں سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ کبھی یہ محسوس ہوا کہ صدر مملکت اپنے منصب پر فائز نہیں رہ سکیں گے۔ کبھی یہ نظر آنے لگا کہ وزیراعظم کی چھٹی ہو جائے گی۔ کبھی یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ عدلیہ اور سکیورٹی کے ذمہ دار ادارے ایک دوسرے کے سامنے آ جائیں گے اور کبھی یہ خطرہ منڈلانے لگا کہ مقننہ (پارلیمان) اور عدلیہ کے مابین ٹکراؤ ہو جائے گا۔ اب چیف جسٹس آف پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں۔ پوری قوم ایسے ہی کیسوں میں طویل عرصے سے اُلجھی ہوئی ہے۔ اسے سمجھ میں ہی نہیں آ رہی کہ آخر کیا ہو رہا ہے البتہ بیرونی قوتیں ہماری اس صورتحال کو اداروں کے درمیان محاذ آرائی سے تعبیر کرتی رہی ہیں۔ اس الجھاؤ میں کسی نے اس بات پر توجہ ہی نہیں دی کہ پاکستان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ہمیں پتہ ہی نہیں ہے کہ پاکستان کس قدر سنگین بحرانوں کی لپیٹ میں آتا جا رہا ہے۔

بظاہر کہانی یہ ہے کہ بحریہ ٹاؤن کے مالک ملک ریاض حسین نے اپنے درجنوں مقدمات سے نجات پانے یا اپنے من پسند فیصلے حاصل کرنے کے لیے پاکستان کے چیف جسٹس عزت مآب افتخار

چیف جسٹس اکیلے کئی محاذوں پر لڑ رہے ہیں اور کئی طاقتور گروپ ان کے دشمن ہیں، ان کے مخالفوں نے یہ سازش تیار کی ہے۔

محمد چوہدری پر بھی وہی نسخہ آزمانے کی کوشش کی جو وہ راولپنڈی اور گردونواح کے پٹواریوں، گرداوروں اور تحصیل داروں پر آزماتے رہے ہیں۔ فائل کو پہیے لگانے کی حکمت عملی سے ملک صاحب نے کبھی انکار نہیں کیا۔ وہ نجی محفلوں میں ہی نہیں، ٹی وی پروگراموں میں بھی عملیت پسندی کے اس فلسفے کا کھلا اظہار کرتے رہے ہیں۔ ان کی اس بات میں خاصا وزن بھی ہے۔ کرپشن سے لت پت اس ملک میں جہاں پٹواریوں سے سیکرٹریوں اور وزراء یا شاید ان سے بھی ذرا اوپر کی سطح تک چھوٹے بڑے دہانوں والی ''شارک مچھلیاں'' اپنے بھیانک جبڑے کھولے جھپٹ رہی ہوں، بحریہ ٹاؤن جیسے منصوبے کو صاف شفاف طریقے سے آگے بڑھانا آسمان میں تھگلی لگانے کے مترادف ہے۔ یہاں تو فٹ پاتھ پر ریڑھی لگانے اور گلی کی نکڑ پر کھوکھا چلانے والے کو بھی کوچہ و بازار کے ارباب و اختیار کی مٹھی گرم کرنا پڑتی ہے۔ سو ملک صاحب نے جو کچھ پایا، بنایا اور کمایا، سب زمینی حقائق کے گہرے شعور اور ان کی عملیت پسندی کا ثمر ہے۔

درجنوں مقدمات سے زچ، بحریہ ٹاؤن نے برسوں پر محیط اپنی آزمودہ اور کامیاب حکمت کار کے تحت جسٹس افتخار محمد چوہدری کے قلعے میں نقب لگانے کے لیے ان کے صاحبزادے ارسلان افتخار کو شیشے میں اُتارا (اگرچہ ملک ریاض کے مطابق انہوں نے ایسا مسلسل بلیک میل ہوتے رہنے کے بعد مجبور ہو کر کیا)۔ بعد کی کہانی کے خاصے اجزاء منظر عام پر آ چکے ہیں۔

بحریہ ٹاؤن کے مالک ملک ریاض حسین نے ملک کے چند نامور صحافیوں کو علیحدہ علیحدہ بلا کر تفصیل سے بتایا کہ چیف جسٹس کے صاحبزادے ڈاکٹر ارسلان پر کم و بیش چونتیس کروڑ کی سرمایہ کاری کی گئی مگر ارسلان کی طرف سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تو پیمانۂ صبر چھلک پڑا۔ جس پر ملک صاحب نے اس سرمایہ داری کے ثبوت صحافیوں اور اعتزاز احسن کو دکھائے۔ سنڈے ٹائمز کی کرسٹینا لیمب کو بھی یہ سٹوری دی گئی۔ پہلے یہ سوچ تھی کہ یہ دھماکہ اس دن کیا جائے گا جس دن جسٹس افتخار محمد چوہدری ایک بڑا عالمی اعزاز وصول کرنے لندن میں موجود ہوں گے لیکن یہ منصوبہ ترک کر دیا گیا۔ یہی بات لوگوں کے دلوں میں اس کو سازش کہنے کا محرک بنی۔ اس کا صاف مطلب یہ نکلتا تھا کہ یہ سازش صرف چیف جسٹس کو بدنام کرنے کی ہے۔ اس سے اس بات کو بھی تقویت ملی کہ اس کے پیچھے کئی پردہ نشینوں کے نام پنہاں ہیں۔ چیف جسٹس جو اکیلے کئی محاذوں پر لڑ رہے ہیں اور کئی طاقتور گروپ ان کے دشمن ہیں، ان کے مخالفوں نے یہ سازش تیار کی ہے۔ جب میڈیا کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سینئر صحافی کو کال کر کے کہا گیا کہ آپ صدر اور وزیراعظم کی کرپشن کی بات کرتے ہیں، چیف جسٹس کا بیٹا بلیک میلنگ میں ملوث ہے۔ کہا گیا کہ ارسلان افتخار بحریہ ٹاؤن کے سربراہ کو بلیک میل کر رہے ہیں۔

لوگوں نے ٹی وی پر اس کیس کے سلسلہ میں اپنے اپنے ٹاک شوز کیے اور یہ بات پورے ملک میں آگ کی طرح پھیلنے لگی اور افواہوں کے بازار گرم ہو گئے تو چیف جسٹس نے سوموٹو نوٹس لیتے ہوئے اگلے دن کے لیے میڈیا کے لوگوں اور اپنے بیٹے کو سپریم کورٹ میں طلب کر لیا جہاں پر میڈیا کے لوگوں نے اپنے اپنے بیانات ریکارڈ کروائے۔ ان میں جناب کامران خان کا بیان مندرجہ ذیل ہے:

مجھے ایک کال کر کے کہا گیا کہ آپ صدر اور وزیراعظم کی کرپشن کی بات کرتے ہیں، چیف جسٹس کا بیٹا بلیک میلنگ میں ملوث ہے۔ کہا گیا کہ ارسلان افتخار بحریہ ٹاؤن کے سربراہ کو بلیک میل کر رہے ہیں۔ مجھے اس پر پروگرام کرنے پر زور دیا گیا لیکن میں نے اس کو چیف جسٹس اور عدلیہ کے خلاف سازش سمجھ کر نظرانداز کر دیا۔ کامران خان نے مزید بتایا کہ ضمیر مطمئن کرنے کے لیے ملک ریاض سے رابطہ کیا۔ نامعلوم کال میں کہا گیا تھا کہ ملک ریاض کے پاس اس کے کافی ثبوت ہیں۔ کراچی آ کر ملک ریاض نے مجھ سے ملاقات کی۔ ملک ریاض نے ابتدائی طور پر کہا کہ یہ الزام درست ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ انہیں بلیک میل کیا جا رہا ہے۔ ملک ریاض کے بقول ڈاکٹر ارسلان ان کے بیٹے اور داماد کے ساتھ رابطے میں تھے۔ ملک ریاض نے دوسری ملاقات میں دستاویزات کا پلندہ دکھایا۔ ان دستاویزات کی نقل بنانے کی اجازت نہیں دی گئی، وہ دستاویزات ارسلان سے متعلقہ تھیں۔ ڈاکٹر ارسلان سے برطانیہ میں کرایہ داری کا معاہدہ اور دوسری دستاویزات شامل تھیں اور ان کے پاسپورٹ کی نقل بھی اس کے ہمراہ تھی۔ ایک ہزار پاؤنڈ یومیہ سے زیادہ کا اپارٹمنٹ تھا۔ شاپنگ کے لیے کریڈٹ کارڈز سے ادائیگی کا ریکارڈ بھی دیا گیا۔ خریداری کی رسیدیں بھی دکھائی گئیں خریداری کی رسیدوں میں ڈاکٹر ارسلان کا نام بھی لکھا تھا اور ادائیگی ملک ریاض کے داماد کے ذریعے کی گئی تھی۔ کامران خان نے کہا کہ ملک ریاض نے بتایا کہ چیف جسٹس نے ایک ہی دن میں میرے خلاف 49 مقدمات کے فیصلے دیئے۔ پیسے دینے کے باوجود انہیں فائدہ کی بجائے نقصان ہی پہنچا ہے۔ کامران خان نے مزید بتایا کہ بقول ملک ریاض اتنے سارے ثبوت دیکھ کر بیرسٹر اعتزاز احسن بھی آبدیدہ ہو گئے تھے کہ جس عدلیہ کے لیے اتنی کوششیں کیں آج اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ علاوہ ازیں کامران خان کو بیان تحریری طور پر عدالت میں جمع کروانے کا کہا گیا جو انہوں نے

تمام پاکستانی اس بات پر متفق ہیں کہ چیف جسٹس کی ذات اس کیس میں ملوث نہیں اور اگر ڈاکٹر ارسلان پر الزامات سچے بھی ہیں تو اس بات کا چیف جسٹس کو پتہ نہیں۔

جمع کروا دیا۔

پہلے دن کی کارروائی میں چیف جسٹس نے کہا کہ وہ حلفاً یہ کہتے ہیں کہ انہیں اپنے بیٹے ارسلان کے کاروبار کے متعلق کچھ علم نہیں۔ ان کا بیٹا 34 سالہ جوان اور خودمختار ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو بنچ سے الگ کر لیا کیونکہ ان کے مخالفین کی طرف سے یہ تنقید کی جا رہی تھی کہ ان کو اپنے بیٹے کے کیس میں خود بنچ کی سربراہی نہیں کرنی چاہیے۔ سپریم کورٹ نے حکم دیا کہ ملک ریاض اور ارسلان دو دن کے اندر اندر اپنا بیان ریکارڈ کروائیں اور ملک ریاض کے انکم ٹیکس گوشوارے اور حسابات سپریم کورٹ میں داخل کیے جائیں اور ساتھ ساتھ ہی کمپنی کے تمام حسابات بھی پیش کئے جائیں۔

میڈیا میں چھپنے والے مواد کے مطابق ملک ریاض کے بیانات میں کافی تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ کہتے ہیں کہ چیف جسٹس کے خلاف ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں اور وہ اس ملک میں امید کی واحد کرن ہیں جو کرپشن اور دیگر کئی محاذوں پر اکیلے لڑ رہے ہیں اور دوسری طرف وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے ڈاکٹر ارسلان پر رقم اس لئے خرچ کی تا کہ بحریہ ٹاؤن کے مقدمات میں ریلیف مل سکے اور یہ بھی کہا کہ ان کو مقدمات میں بجائے ریلیف ملنے کے ان کے خلاف سخت اقدامات کئے گئے۔ آخر جب ان کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو رہا تھا تو وہ کیوں ارسلان پر رقم خرچ کرتے چلے گئے!

پورے ملک میں تمام پاکستانی اس بات پر متفق ہیں کہ چیف جسٹس کی ذات اس کیس میں ملوث نہیں اور اگر ڈاکٹر ارسلان پر الزامات سچے بھی ہیں تو اس بات کا چیف جسٹس کو پتہ نہیں۔ وہ کورٹ میں بھی حلفیہ بیان دے چکے ہیں کہ ان کے پاس اپنا نہ تو کوئی گھر ہے اور نہ ہی ذاتی گاڑی۔ آج بھی اگر ان سے سرکاری رہائش گاہ لے لی جائے تو ان کے پاس رہنے کو کوئی گھر نہیں۔ ایک آدمی جو ملک کا چیف جسٹس ہو اگر اس کے پاس رہنے کے لیے اپنا گھر بھی نہ ہو تو اس سے بڑھ کر اس کی سچائی اور ایمانداری کی کیا گارنٹی ہو سکتی ہے۔ کچھ لوگوں کی یہ رائے بھی ہے کہ چیف جسٹس کو تو پتہ نہیں چل سکا مگر ان کا بیٹا چیف جسٹس کے دشمنوں کی سازش کا شکار ہو گیا ہے اور اسے ضرور ٹریپ کر لیا گیا ہے۔ ایک بات جو بڑی حیران کن ہے بلکہ اسے چیف جسٹس پر اللہ کا خاص کرم کہنا چاہیے کہ بحریہ ٹاؤن پر اتنے زیادہ مقدمات چل رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کا بھی فیصلہ بحریہ ٹاؤن کے حق

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ان کی بیٹیوں نے پندرہ سو پچاس روپے اور بارہ سو اسی روپے کے دو ٹاپس پسند کئے تھے، یہ رقم بھی چھوٹے چھوٹے نوٹوں کی شکل میں تھی اور یہ بچیوں کی پاکٹ منی تھی؛ میں اس خریداری پر حیران رہ گیا اور میرا جی چاہا میں اپنی جگہ سے اُٹھوں اور جج صاحب کا ہاتھ چوم لوں....."

میں ابھی تک نہیں آیا۔ ہو سکتا تھا کہ بحریہ ٹاؤن کے کسی مقدمہ میں میرٹ پر ہی ان کے حق میں فیصلہ آ جاتا مگر لوگ تو یہی کہتے کہ چیف جسٹس نے حمایت کی تھی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی تھی چیف جسٹس پر۔ چیف جسٹس کے بارے میں ابھی تک صحافیوں کی اکثریت اخباروں اور چینلوں پر ان کے اچھے کارناموں اور ان سے وابستہ امیدوں کے چراغ جلائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں جاوید چوہدری اپنے کالم میں اس سارے واقعہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

کیا چیف جسٹس بھی قصور وار ہیں؟

(جاوید چوہدری)

میاں زاہد سنار ہیں، یہ پٹیالہ کے مشہور سنار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، قیام پاکستان کے بعد ان کا خاندان یہاں شفٹ ہوا، ایک شاخ راولپنڈی آ گئی اور دوسری منڈی بہاؤ الدین چلی گئی۔ میاں زاہد 1994ء میں منڈی بہاؤ الدین سے اسلام آباد شفٹ ہو گئے، انہوں نے سپر مارکیٹ میں دکان کھول لی، یہ کل میرے پاس تشریف لائے اور انہوں نے ایک دلچسپ داستان سنائی۔ ان کا کہنا تھا، 2002ء میں کسی دوست نے فون کیا اور سپریم کورٹ کے ایک جج صاحب کو ان کی دکان پر بھجوایا، یہ جج صاحب اپنی بیگم اور دو بچیوں کے ساتھ ان کی دکان پر تشریف لائے، میاں زاہد کے بقول "میرے پاس بریگیڈیئر امتیاز کے برادر نسبتی کی فیملی آئی ہوئی تھی، میں نے جج صاحب کو اپنے دفتر میں بٹھا دیا اور گاہکوں کے ساتھ مصروف ہو گیا، گاہکوں نے ڈیڑھ گھنٹہ لگا دیا، جج صاحب اس دوران اخبار پڑھتے رہے، میں فارغ ہوا تو میں نے جج صاحب سے معذرت کی لیکن جج صاحب نے مسکرا کر جواب دیا، میں آپ کے رویے پر خوش ہوں، آپ نے فرسٹ کم فرسٹ کی بنیاد پر کام کیا اور ہمیں ملک میں اسی رویے کی ضرورت ہے۔" میاں زاہد کے بقول "میرے لیے یہ رویہ حیران کن تھا، میرا خیال تھا جج صاحب ناراض ہوں گے لیکن وہ خوش تھے، میں نے ان کی فیملی کو زیورات دکھائے تو میں مزید حیران ہو گیا کیونکہ ان کی بیٹیوں نے پندرہ سو پچاس روپے اور بارہ سو اسی روپے کے دو ٹاپس پسند کئے تھے، یہ رقم بھی چھوٹے چھوٹے نوٹوں کی شکل میں تھی اور یہ بچیوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جو شخص سپریم کورٹ کا جج ہونے کے باوجود اپنی بچیوں کو پندرہ سو روپے کے ٹاپس لیکر دیتا ہو اور جس کے پاس بیٹی کی چوڑیوں کے لیے 5 ہزار 8 سو 50 روپے کی اضافی رقم نہ ہو وہ ملک ریاض سے رقم نہیں لے سکتا!

کی پاکٹ منی تھی، میں اس خریداری پر حیران رہ گیا اور میرا جی چاہا میں اپنی جگہ سے اُٹھوں اور جج صاحب کا ہاتھ چوم لوں، جج صاحب نے اس کے بعد مجھ سے کہا، آپ کے پاس اگر بیس ہزار روپے تک کی پرانی چوڑیاں آئیں تو میرے لئے رکھ لیجئے گا، میں نے ان سے وعدہ کرلیا، وہ جانے لگے تو میں نے ان سے عرض کیا، منڈی بہاؤ الدین کے کالج چوک میں میرے والد کی پراپرٹی تھی، قبضہ گروپ نے اس پراپرٹی پر قبضہ کر رکھا ہے، ہم 38 سال سے عدالتوں میں دھکے کھا رہے ہیں، اگر آپ مہربانی فرمائیں تو میرے خاندان کو انصاف مل سکتا ہے۔'' جج صاحب نے فرمایا ''میں آپ کا کیس تلاش کرتا ہوں، آپ حق پر ہوئے تو آپ کو انصاف ضرور ملے گا۔'' جج صاحب نے ہاتھ ملایا اور میری دکان سے نکل گئے۔

میاں زاہد کے بقول وہ جج آج کے چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری ہیں اور میں نے ان کی بچیوں کے دیئے ہوئے پیسے لفافے میں ڈالے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے پاس محفوظ کر لیے کیونکہ میرے نزدیک یہ متبرک رقم تھی۔ میاں زاہد کے بقول ''مجھے چند دن بعد سپریم کورٹ سے افتخار محمد چوہدری صاحب کی کال آئی، چوہدری صاحب نے بتایا، میں نے آپ کا کیس تلاش کر لیا ہے، میں اس بنچ کا حصہ ہوں جس نے یہ مقدمہ سننا تھا لیکن کیونکہ اب آپ سے میری ملاقات ہو چکی ہے لہٰذا میں اس بنچ سے الگ ہو رہا ہوں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو انصاف ضرور ملے گا۔'' میاں زاہد کے بقول ''دو ہفتے بعد ہمارا کیس لگا اور 38 سال بعد ہمارے حق میں فیصلہ ہو گیا اور یوں منڈی بہاؤ الدین کی تاریخ میں پہلی بار کسی غریب خاندان کو مافیا سے قبضہ واپس ملا۔'' میاں زاہد کے بقول ''تھوڑے عرصے بعد میرے پاس پچیس ہزار آٹھ سو پچاس روپے کی چوڑیاں آگئیں، اس زمانے میں سونے کی قیمت ساڑھے چار ہزار روپے تولہ تھی، میں نے چودھری صاحب کو فون کیا اور انہیں بتایا کہ میرے پاس پچیس ہزار آٹھ سو پچاس روپے کی چوڑیاں ہیں۔ آپ اگر حکم دیں تو میں آپ کو بھجوا دوں۔ جج صاحب نے فرمایا میں صرف 20 ہزار روپے کی چوڑیاں خرید سکتا ہوں۔ آپ کے پاس اگر کبھی 20 ہزار کی چوڑیاں آئیں تو آپ مجھے بتا دیجئے گا۔ بقول میاں زاہد ''چوہدری صاحب نے کہا، آپ اچھے انسان ہیں، آپ نے مجھے چوڑیوں کی اصل قیمت بتا دی ورنہ آپ مجھے زیر بار کرنے کے لیے یہ چوڑیاں بیس ہزار روپے میں بھی دے سکتے

سٹوری میکرز کا خیال تھا کہ چیف جسٹس لندن اُتریں گے تو انہیں انٹرنیشنل میڈیا گھیر لے گا اور یوں یہ بُری طرح بدنام ہو جائیں گے!

تھے، آپ کا شکریہ آپ نے اپنا اور میرا ایمان بچا لیا۔'' یہ بتانے کے بعد میاں زاہد کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور انہوں نے کہا ''مجھے یقین ہے کہ جو شخص سپریم کورٹ کا جج ہونے کے باوجود اپنی بچیوں کو پندرہ سو روپے کے ٹاپس لے کر دیتا ہو اور جس کے پاس بیٹی کی چوڑیوں کے لیے 5 ہزار 8 سو 50 روپے کی اضافی رقم نہ ہو وہ ملک ریاض سے رقم نہیں لے سکتا، میں گواہی دیتا ہوں کہ چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کرپٹ نہیں ہیں۔''

میاں زاہد سچ بول رہے ہیں لیکن ڈاکٹر ارسلان سے متعلق حقائق بھی غلط نہیں ہیں، میں نے یہ ثبوت خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ میری دو جون کی رات ملک ریاض سے ملاقات ہوئی تھی۔ ملک صاحب نے مجھے فون کر کے اپنے گھر بلایا، میرے ملک ریاض سے 1996ء سے تعلقات ہیں اور میں نے 16 برس کے ان قریبی تعلقات میں ملک ریاض کے بے شمار رنگ دیکھے ہیں۔ ملک ریاض میں اگر خامیاں ہیں تو اُن میں چند نمایاں خوبیاں بھی ہیں۔ سردست میں ان سے ملاقات کی طرف آتا ہوں۔ میں رات نو بجے ملک ریاض کے گھر پہنچا تو اس وقت ملک کے ایک عدلیہ کے حوالے سے مشہور اور سینئر صحافی کی گاڑی گھر سے نکل رہی تھی۔ یہ ملک ریاض کے ساتھ ارسلان سکینڈل پر مشہور اور سینئر صحافی کی پانچویں ملاقات تھی۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ ڈاکٹر ارسلان کی سٹوری 28 مئی کی شام اس وقت ریلیز ہونا تھی جب چیف جسٹس نے انٹرنیشنل کانفرنس آف جیورسٹس میں شرکت کے لیے لندن پہنچنا تھا۔ سٹوری میکرز کا خیال تھا کہ چیف جسٹس لندن اُتریں گے تو انہیں انٹرنیشنل میڈیا گھیر لے گا اور یوں یہ بُری طرح بدنام ہو جائیں گے اور اس سے حکومت کو فائدہ ہوگا۔ سینئر صحافی اس سازش سے واقف تھے اور انہوں نے ملک ریاض کو اس سے منع کیا تھا، میں نے آج تصدیق کے لیے انہیں فون کیا تو انہوں نے نہ صرف اس کا اعتراف کیا بلکہ انہوں نے انکشاف کیا کہ چوہدری اعتزاز احسن بھی پوری طرح پکچر میں تھے اور انہوں نے بھی ملک ریاض کو 28 مئی کو سٹوری ریلیز کرنے سے منع کیا تھا، چوہدری صاحب کا خیال تھا کہ چیف جسٹس ملک سے باہر ہوں گے تو عدلیہ اور وکلاء اکٹھے ہو جائیں گے اور یوں ایک بار پھر مارچ 2007ء کی تحریک شروع ہو جائے گی۔ میں واپس دو جون کی طرف آتا ہوں۔ مجھ سے پہلے مذکورہ مشہور سینئر صحافی یہ پروف دیکھ چکے تھے، ملک ریاض نے ان کے بعد مجھے یہ پروف دکھانا شروع کر دیئے۔ ملک صاحب نے اسی دوران ایک بڑے میڈیا گروپ کے چیف ایگزیکٹو کو فون کیا،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چیف جسٹس نے بیٹے کو کٹہرے میں کھڑا کر کے تاریخ کی آنکھیں چندھیا دی ہیں، انہوں نے شطرنج سجنے سے پہلے ہی سیاسی کھلاڑیوں کو مات دے دی ہے اور اگر ڈاکٹر ارسلان کو سزا ہوئی تو حکمرانوں کے لیے بچنا محال ہو جائے گا!

ملک ریاض نے مجھے بتایا کہ وہ ثبوت دو اور مشہور صحافیوں کو بھی دکھا چکے ہیں اور چوہدری اعتزاز احسن چیف جسٹس کو بھی اس کی اطلاع دے چکے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم دیوار کے ساتھ لگ چکے ہیں اور میں اب اپنے آپ کو اور اپنے کاروبار کو بچانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہوں۔ ملک ریاض نے کہا ''ڈاکٹر ارسلان ہماری رقم سے برونی اور کنالی کے سوٹ خریدتے اور گفٹ کرتے رہے ہیں۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ برونی یا کنالی کا سوٹ کتنے میں آتا ہے؟'' میں نے کہا ''ملک صاحب یہ تو کوئی دلیل یا ثبوت نہیں، پاکستان کے ننانوے اعشاریہ ننانوے فیصد لوگوں کو برونی اور کنالی کا علم نہیں، برانڈز سے ناواقف لوگوں کے لیے سوٹ محض سوٹ ہوتا ہے اور انہیں اس کی قیمت کا کبھی اندازہ نہیں ہوتا۔'' ملک صاحب کا کہنا تھا ''میں وقت آنے پر ہر چیز ثابت کروں گا۔'' اس دوران ایک دوسرے میڈیا ٹائی کون کا فون آ گیا۔ ملک صاحب نے ان سے ایک وفاقی وزیر کی سفارش کی اور عنقریب ملاقات کا وعدہ کیا۔ اس دوران گورنر سندھ عشرت العباد کا فون آیا اور انہوں نے برے حالات کے شکار ایک اینکر کی نئی نوکری کی خوشخبری سنائی۔ ملک صاحب نے اس کے بعد ثبوتوں کی فائل دوبارہ میرے سامنے رکھ دی اور ایک ایک کاغذ دکھاتے چلے گئے۔ کاغذات بظاہر جینوئن دکھائی دیتے تھے کیونکہ ان میں ہوٹلز، رینٹ اے کار، کیسینو اور ایئر ٹکٹ کے وہ بل شامل تھے جن پر باقاعدہ ارسلان افتخار کا نام چھپا تھا جبکہ پے منٹ سلمان ملک کے کریڈٹ کارڈ سے ہوئی تھی، کریڈٹ کارڈ کا بل سلمان ملک کی رہائش گاہ پر ڈیلیور ہوا تھا، اس کی کاپی ریکارڈ کا حصہ تھی، یہ ڈاکٹر ارسلان کے خلاف ایک ثبوت تھا، ملک ریاض نے ویڈیو ریکارڈنگ کا ذکر بھی کیا، میں نے ان سے ریکارڈنگ دیکھنے کی خواہش کی تو انہوں نے بتایا کہ یہ ریکارڈنگ لندن کے لاکر میں ہیں اور یہ کرسٹینا لیمب ریلیز کرے گی۔

ملک ریاض نے دس دنوں میں مشہور اور سینئر صحافی سے پانچ میٹنگز کیں، یہ صحافی ڈاکٹر ارسلان سے بھی رابطے میں تھے لیکن یہ آج ان رابطوں اور ان ملاقاتوں پر خاموش ہیں، یہ کیوں خاموش ہیں؟ میرا خیال ہے وہ جب تک سامنے نہیں آتے، یہ کہانی اس وقت تک مکمل نہیں ہو گی اور پیچھے رہ گئے ملک ریاض تو یہ جلد پاکستان آئیں گے اور اس کے بعد سیاسی واقعات کی رفتار تیز ہو جائے گی،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملک ریاض کا دعویٰ تھا کہ ڈاکٹر ارسلان نے ساڑھے تین کروڑ روپے نقد لئے، اس کے کچھ عرصہ بعد مزید ساڑھے تین کروڑ روپے لئے گئے اور رقم وصول کرنے کی باقاعدہ ویڈیو ریکارڈنگ بھی موجود ہے!

ان واقعات کے آخر میں کیا ہوگا؟ حکومت رہے گی یا فارغ ہوگی، الیکشن ہوں گے یا پھر کوئی نیا فارمولہ آئے گا، ہم سردست کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن مجھے یقین ہے کہ چیف جسٹس اس معاملے میں بے قصور ہیں، انہوں نے بیٹے کو کٹہرے میں کھڑا کر کے تاریخ کی آنکھیں چندھیا دی ہیں، انہوں نے شطرنج سجنے سے پہلے ہی سیاسی کھلاڑیوں کو مات دے دی ہے اور اگر ڈاکٹر ارسلان کو سزا ہوئی تو حکمرانوں کے لیے بچنا محال ہو جائے گا۔

ابھی یا کبھی نہیں

چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کے صاحبزادے ڈاکٹر ارسلان کا ایشو دو ہفتوں سے اسلام آباد میں گردش کر رہا تھا۔ سیاسی جماعتوں کے اراکین، میڈیا کے سینئر کارکن اور بزنس کمیونٹی کے لوگ محتاط الفاظ میں اس کا ذکر کرتے تھے اور پریشان ہو جاتے تھے لیکن کل اس سے پوری قوم پریشان ہو گئی۔

میں نے یہ ایشو سب سے پہلے کس کے منہ سے سنا یہ مجھے یاد نہیں تاہم معلومات میرے ذہن میں رہ گئیں۔ ان معلومات میں بعد ازاں مزید افواہیں ملتی چلی گئیں اور یوں ایک عجیب بلکہ ناقابل یقین کہانی بن گئی۔ ملک ریاض کے حوالے سے افواہ سازوں نے انکشاف کیا، ملک ریاض نے میڈیا کے چند سینئر لوگوں کو الگ الگ اپنے گھر بلوایا اور ان کے سامنے ارسلان افتخار کے حوالے سے چند پریشان کن ثبوت رکھ دیئے۔ یہ ثبوت سب سے پہلے کراچی کے ایک سینئر اینکر پرسن کو دیئے گئے۔ اینکر پرسن نے یہ ثبوت چینل کے مالک کو دے دیئے اور اس نے تصدیق کے لیے ملک ریاض کو فون کیا۔ ملک ریاض نے خبر کی تصدیق کر دی۔ یہ ثبوت اس کے بعد لاہور کے ایک سینئر صحافی کو دیئے گئے۔ یہ صاحب انگریزی میں کالم بھی لکھتے ہیں۔ ٹی وی پر پروگرام بھی کرتے ہیں اور ان کا لاہور میں کتابوں کا ایک مشہور شوروم بھی ہے۔ یہ ثبوت اس کے بعد واشنگٹن میں شاہین صہبائی کو بھجوائے گئے اور اس کے بعد اسلام آباد کے سینئر صحافیوں اور اینکر پرسنز کی باری آئی۔ ملک ریاض ایک ایک صحافی کو گھر بلاتے اور انہیں ایک فائل دکھاتے، اس فائل میں 2009ء کے آخر سے 2012ء کے شروع تک کریڈٹ کارڈز کے بل، ہوٹل کے کمروں کے بل، شاپنگ سنٹرز کے بل اور انٹرنیشنل ٹکٹوں کی کاپیاں لگی ہیں، اس فائل میں ارسلان افتخار کے پاسپورٹ کی کاپیاں بھی ہیں، ملک ریاض کا دعویٰ تھا کہ ڈاکٹر ارسلان نے ان سے ساڑھے تین کروڑ روپے نقد لئے، اس کے کچھ عرصہ بعد مزید

ملک ریاض ڈاکٹر ارسلان کو رقم اپنے حق میں فیصلے کروانے کے لیے دیتے رہے ہیں تو پھر ملک ریاض کے حق میں فیصلے کیوں نہیں ہوئے؟

ساڑھے تین کروڑ روپے لئے گئے اور رقم وصول کرنے کی باقاعدہ ویڈیو ریکارڈنگ بھی موجود ہے تاہم ملک صاحب نے کسی کو یہ ریکارڈنگ نہیں دکھائی۔ ملک صاحب نے دعویٰ کیا کہ ڈاکٹر ارسلان اس کے بعد بھی مالی فوائد حاصل کرتے رہے۔ یہ فیملی کے ساتھ ملک سے باہر جاتے تھے تو ان کے ائیر ٹکٹ ملک صاحب خرید کر دیتے تھے، یہ ملک سے باہر جن ہوٹلز میں رہتے تھے ان کے بل بھی ملک صاحب کے داماد سلمان ملک اور ان کی صاحبزادی کے کریڈٹ کارڈز سے ادا ہوتے تھے، یہ لندن کے میریٹ ہوٹل کے مہنگے ترین سویٹ میں رہے، انہوں نے لندن کے انتہائی مہنگے علاقے کے ایک اپارٹمنٹ میں قیام کیا، یہ بل بھی سلمان ملک نے کریڈٹ کارڈ کے ذریعے جمع کرائے۔ یہ مانٹی کارلو بھی گئے اور ان کے ٹریول اور رہائش کا یہ بل بھی سلمان ملک نے ادا کیا، یہ لندن کے انتہائی مہنگے سٹورز سے شاپنگ بھی کرتے رہے اور یہ بل بھی سلمان ملک اور ملک ریاض کی صاحبزادی کے کریڈٹ کارڈز سے ادا ہوئے۔ ملک ریاض کے پاس شاپنگ کی وڈیو ریکارڈنگ بھی موجود ہے (ملک صاحب نے یہ فلم بھی کسی کو نہیں دکھائی)۔ ملک ریاض نے دعویٰ کیا کہ ان تین برسوں میں ارسلان پر 35 کروڑ روپے خرچ ہوئے اور اس میں وہ رقم بھی شامل ہے جو انہوں نے ڈاکٹر ارسلان کو براہ راست ادا کی۔ ملک ریاض نے دعویٰ کیا کہ وہ یہ ثبوت بہت پہلے عوام کے سامنے لانا چاہتے تھے لیکن صدر آصف علی زرداری نے انہیں روک دیا تھا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ ڈاکٹر ارسلان کے فیملی پیر "حکیم صاحب" بھی اس ڈیل میں شامل ہیں اور یہ بھی تین چار مرتبہ ملک صاحب سے مل چکے ہیں۔ ملک ریاض کا کہنا تھا، ان کے پاس ٹھوس ثبوت ہیں جن میں کریڈٹ کارڈز کے بل، شاپنگ کے بل، ہوٹلز کے بل، انٹرنیشنل ٹریول کی ٹکٹس، رینٹ اے کار کے بل، ڈاکٹر ارسلان کے انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس کی کاپی اور منی ٹرانسفر کی انوائس شامل ہیں۔ ملک ریاض نے اس کارروائی کی فلمیں بھی بنائیں اور ان کے پاس یہ فلمیں بھی موجود ہیں۔ ملک ریاض نے دعویٰ کیا کہ وہ یہ ثبوت اور فلمیں مشہور عالمی صحافی کرسٹینا لیمب کے حوالے کر چکے ہیں، ثبوت لندن کے ایک لاکر میں ہیں، یہ لاکر ملک ریاض، سلمان ملک اور کرسٹینا لیمب کھول سکتی ہیں، اس لاکر اور ان ثبوتوں کی انشورنس ہو چکی ہے اور کرسٹینا لیمب کسی بھی وقت اس پر تہلکہ خیز سٹوری کرے گی، وغیرہ وغیرہ۔

یہ ملک ریاض کے وہ دعوے ہیں جو پچھلے چند ہفتوں سے اسلام آباد میں گردش کر رہے تھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاکستان آج ایک بار پھر دوراہے پر ہے، یہ دوراہا بھی اس ملک سے ''ابھی یا کبھی نہیں'' کے فیصلے کا تقاضا کر رہا ہے اور یہ فیصلہ اب چیف جسٹس نے کرنا ہے۔

لیکن کسی نے ابھی تک ان کی تصدیق نہیں کی۔ صحافیوں نے یہ ثبوت دیکھے ضرور مگر ملک ریاض نے یہ ثبوت کسی کو دیئے نہیں چنانچہ کوئی صحافی اس سٹوری کی تصدیق نہیں کر سکتا (تاہم اب ملک ریاض ان ثبوتوں کو عدالت اور میڈیا کے سامنے پیش کر چکے ہیں)۔ یہاں پر تین دلچسپ سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ اگر ملک ریاض ڈاکٹر ارسلان کو یہ رقم اپنے حق میں فیصلے کروانے کے لیے دیتے رہے ہیں تو پھر ملک ریاض کے حق میں فیصلے کیوں نہیں ہوئے؟ چیف جسٹس اور سپریم کورٹ ملک ریاض کے خلاف ایک ایک دن میں باون باون فیصلے دیتے رہے ہیں، اگر رقم دی گئی اور وصول کی گئی تھی تو فیصلے ملک صاحب کے حق میں ہونے چاہیے تھے چنانچہ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ثبوت جعلی ہوں اور ان کے ذریعے واقعی چیف جسٹس کو بدنام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ دوم یہ کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ تمام ڈاکومنٹس اصلی ہیں؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ڈاکٹر ارسلان کے نام سے کوئی اور شاپنگ کرتا رہا ہو، کوئی اور ہوٹلوں اور کیسینوز وزٹ کرتا رہا ہو اور بل ڈاکٹر ارسلان کے نام سے بنتے رہے ہوں یا کسی نے ایف آئی اے اور ٹریولنگ ایجنسی سے ڈاکٹر ارسلان کے انٹرنیشنل سفر کا ڈیٹا حاصل کر لیا ہو اور یہ ڈیٹا اب چیف جسٹس کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہو۔ سوم یہ کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ ڈاکٹر ارسلان ٹریپ ہو گئے ہوں اور چیف جسٹس کو کانوں کان خبر نہ ہوئی ہو کیونکہ چیف جسٹس نے اس دوران ملک ریاض اور بحریہ ٹاؤن کو کسی قسم کی ''فیور'' نہیں دی لہٰذا امکان موجود ہے کہ ڈاکٹر ارسلان کو گھیر لیا گیا ہو اور یوں چیف جسٹس کو بدنام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو لہٰذا اس معاملے کی انتہائی اعلیٰ سطح پر تحقیقات ہونی چاہئیں۔ چیف جسٹس نے اس سکینڈل کے سامنے آنے کے بعد ڈاکٹر ارسلان کو گھر سے بھی نکال دیا اور ان کے خلاف سوموٹو ایکشن بھی لے لیا۔ یہ ایک بروقت اور اچھا فیصلہ ہے کیونکہ چیف جسٹس نے اس فیصلے کے ذریعے اپنی نیک نیتی ثابت کر دی ہے۔ چیف جسٹس اگر مستقبل میں اس کیس کی تحقیقات بھی کرا دیتے ہیں اور ان تحقیقات میں ان کے صاحبزادے واقعی مجرم ثابت ہو جاتے ہیں اور چیف جسٹس اسلامی روایات کے مطابق ڈاکٹر ارسلان کو سزا سنا دیتے ہیں تو یہ پاکستان بلکہ دنیا کی تاریخ کا انوکھا واقعہ ہوگا اور یہ واقعہ آگے چل کر پورا سیاسی سیناریو تبدیل کر دے گا کیونکہ حکومت کو اس فیصلے کے بعد وزیراعظم کو بھی فارغ کرنا پڑے گا، صدر آصف علی زرداری کے خلاف سوئس حکام کو خط بھی لکھنا پڑے گا، فوج کو بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مگر کیا ملک ریاض اتنے بیوقوف ہو سکتے ہیں کہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیں اور اس کا فائدہ کسی اور کو پہنچے؟

مسنگ پرسنز عوام کے سامنے پیش کرنا پڑیں گے، آزاد الیکشن کمیشن بھی قائم ہوگا اور آزادانہ اور ایماندارانہ الیکشن بھی ہوں گے اور یہاں سے ایک نیا پاکستان جنم لے گا لیکن اگر خدانخواستہ چیف جسٹس اپنے صاحبزادے کو بچا لیتے ہیں یا عوام اور وکلاء کو اس کیس میں چیف جسٹس جانبدار دکھائی دیتے ہیں تو پھر اس ملک سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قانون اور انصاف کا جنازہ نکل جائے گا اور ہم بربادی کے ایک ایسے موڑ پر آ جائیں گے جس سے واپسی کے لیے ہماری کئی نسلوں کو سینکڑوں سال انتظار کرنا پڑے گا لہٰذا پاکستان آج ایک بار پھر دوراہے پر ہے، یہ دوراہا بھی اس ملک سے ''ابھی یا کبھی نہیں'' کے فیصلے کا تقاضا کر رہا ہے اور یہ فیصلہ اب چیف جسٹس نے کرنا ہے۔ میں ذاتی طور پر اس معاملے میں جیف جسٹس کو بے گناہ سمجھتا ہوں کیونکہ چیف جسٹس نے اگر مالی فائدہ اٹھانا ہوتا تو انہیں حکومت سے اچھا خریدار کوئی نہیں مل سکتا تھا، یہ شوکت عزیز اور پرویز مشرف کی بات مان لیتے اور اگر یہ ممکن نہیں تھا تو یہ صدر آصف علی زرداری اور وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کے ساتھ سودے بازی کر لیتے اور اس وقت لندن میں کسی مہنگے فلیٹ کے مالک ہوتے۔ چیف جسٹس اگر حکومتوں کے ہاتھ نہیں بکے تو پھر انہیں ملک ریاض سے فائدہ اٹھانے کی کیا ضرورت تھی! لہٰذا مجھے یہ الزام قرین قیاس نہیں لگتا۔

☆.....☆.....☆

بعض جرنلسٹ حضرات ملک ریاض کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کہہ رہے ہیں کہ وہ ملک کے ٹائی کون بنے ہی اس طرح کے ہتھکنڈوں کو استعمال کر کے ہیں۔ ایک بات جو لوگوں میں بہت زیادہ مشہور ہے وہ یہ کہ ملک ریاض صدر زرداری کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے ہیں اور صدر زرداری کے چونکہ چیف جسٹس سے اختلافات ہیں اس لیے صدر زرداری نے اپنے دوست ملک ریاض کو استعمال کیا ہے مگر کیا ملک ریاض اتنے بیوقوف ہو سکتے ہیں کہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیں اور اس کا فائدہ کسی اور کو پہنچے۔ ملک کے ممتاز کالم نگار ہارون الرشید اپنے کالم میں ملک ریاض کے بارے میں کیا کہتے ہیں آیئے دیکھتے ہیں:

پنڈورا بکس

(ہارون الرشید)

ایک کالم اور ٹاک شو نہیں بلکہ یہ ایک کتاب کا موضوع ہے۔ کیا یہ کتاب کبھی لکھی جا سکے گی؟

اس تعلق کی بہت بھاری قیمت مجھے اس وقت ادا کرنا پڑی جب میرے خاندان کی زمین ہتھیا کر ملک کو بیچ دی گئی۔ وہ مسکراتا اور صورتحال کا لطف اُٹھاتا رہا۔

کون جانتا ہے، آنے والے کل کی کون جانتا ہے! والی اللہ ترجع الامور

پرانی لینڈ کروزر سے ملک ریاض حسین نے گردوپیش پر نگاہ ڈالی اور کہا ''بحریہ ٹاؤن کے ساتھ میں نے اپنے اکلوتے بیٹے علی سے کم محبت نہیں کی۔'' یہ خاموش ہو جانے کا لمحہ تھا۔ اب مزید کسی سوال کی گنجائش کہاں تھی۔ وہ ایک خبطی آدمی ہے۔ میں نے سوچا، ایک خواب اس نے دیکھا ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اس کا راستہ روک نہیں سکتی۔

ملک ریاض حسین سے میرا تعارف وزیراعظم معراج خالد نے کرایا تھا۔ میری عدم موجودگی میں۔ چنانچہ میرے ساتھ وہ محتاط رہا۔ نگران وزیراعظم سے میری دوستی ایک طویل تلخی کے بعد خود ان کے ایما پر ہوئی تھی۔ یہ دو کروڑ روپے پر دو بھائیوں کا جھگڑا تھا اور میں نے ان میں سے ایک کی سفارش کی تھی۔ ملک نے میری سفارش مان لی اور میں نے اس کی خواہش پر دو اڑھائی ماہ تک ایک منصوبے پر کام کیا۔ معاوضے پر اور یہ بڑا ہی حقیر معاوضہ تھا مگر مجھے روپوں کی ضرورت تھی۔ ایک شام جب ایک شادی میں شرکت کے لیے مجھے فیصل آباد جانا پڑا اور ملک کو میں نے مطلع کیا تو ایک بڑے کاروباری آدمی کے لہجے میں اس نے کہا، اپنی ڈیوٹی کے ساتھ آپ انصاف نہیں کر سکتے۔ مجھے صدمہ ہوا لیکن میں خاموش رہا اور اسے موقع دیا کہ وہ کسی اور کا انتخاب کر لے جو ذہنی طور پر اسے آسودہ رکھ سکے۔ اس شخص نے کئی گنا معاوضہ وصول کیا مگر حیرت انگیز طور پر ملک خوش رہا۔ وہ ایسا ہی آدمی ہے۔ روپیہ نہیں، اس کے لیے اطاعت اہم ہے۔ ایک لینڈ رولر کی طرح، ترقی کے لیے بے تاب سرمایہ کار اپنا راستہ خود بناتا ہے اور پوری بے رحمی کے ساتھ۔ انسانی احساسات کی بہت پرواہ کا وہ متحمل نہیں ہوتا۔ راستے الگ ہو گئے۔ بس ایک ذرا سا معاملہ باقی رہ گیا جسے اس نے خوش اسلوبی بلکہ فراخ دلی سے نمٹا دیا۔ اگرچہ اس تعلق کی بہت بھاری قیمت مجھے اس وقت ادا کرنا پڑی جب میرے خاندان کی زمین ہتھیا کر ملک کو بیچ دی گئی۔ وہ مسکراتا اور صورتحال کا لطف اُٹھاتا رہا۔ وہ قصوروار نہ تھا۔ اگرچہ مدد کر سکتا تھا کہ مشرف کا دور آ پہنچا تھا اور عتاب کے اولین مہینوں کے بعد، اب وہ ایک بادشاہ کی طرح بروئے کار تھا۔ چاہتا وہ یہ تھا کہ میں اس سے التجا کروں مگر میں التجا کیسے کرتا۔ عتاب کے دنوں میں، میں بھی اتنا ہی بے نیاز رہا تھا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کے باب میں غیر جانبدار تھے، بڑی حد تک لاتعلق۔ ایک کو دوسرے سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فوج، خفیہ ایجنسیاں، سیاستدان اور صحافی، اس نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے حتیٰ کہ ایک دن چوہدری شجاعت حسین نے کہا، ہم سب پرانے کاروباریوں کو شرم آنی چاہیے۔

شکایت کا کوئی حق نہ تھا۔ زندگی اسی کا نام ہے۔

جنہاں باجھوں جھٹ نہیں سی لنگھدا، اوشکلاں یاد نہ رہیاں (جن کے بغیر ایک لحہ بتانا مشکل تھا، ان کے نقوش تک یاد نہ رہے)۔ اپنے صاحبزادے کی شادی پر ملک صاحب میرے گھر آئے اور میں نے ان کی بات مان لی مگر بس اتنی ہی۔ اس کے بعد ایک آدھ بار کے سوا نہ میں نے کبھی انہیں فون کیا اور نہ کبھی انہوں نے مجھے۔ آرزو اس کی ضرور رہی مگر ملک کی تاریخ میں سب سے زیادہ تیزی کے ساتھ ترقی کرتے۔ ایک بلڈوزر کی طرح سطح ہموار کر دینے والا آدمی انکسار کا مظاہرہ کیوں کرتا؟ برسوں بعد جب اس نے کوشش کی تو زمین بنجر اور بے نتیجہ رہی۔ کھرب پتی کا واسطہ ایک احمق سے آن پڑا تھا۔

جب کسی ٹی وی ٹاک شو میں مجھ سے سوال کیا گیا تو میں نے جواب دے ڈالا اور اکثر یہ اس کے لیے ناخوشگوار تھا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ کبھی بدمزہ ہوا اور نہ شکایت کی۔ وہ ایک عملی آدمی ہے۔ سامنے کی حقیقت یہ تھی کہ دولت اس نے اسی طرح سمیٹی ہے جس طرح اس ملک میں سمیٹی جاتی ہے۔ معاشرے کے فیصلہ کن لوگوں کی تمام تر کمزوریوں سے فائدہ اُٹھا کر۔ بہت پہلے ملک نے دریافت کر لیا تھا کہ ہر آدمی کی ایک کمزوری ہوتی ہے اور اس کمزوری سے فائدہ نہ اُٹھانے والا پیچھے رہ جاتا ہے۔ پیچھے رہ جانا ایسے آدمی کو کسی حال میں گوارا نہیں ہوتا۔ فوج، خفیہ ایجنسیاں، سیاستدان اور صحافی، اس نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے حتیٰ کہ ایک دن چوہدری شجاعت حسین نے کہا، ہم سب پرانے کاروباریوں کو شرم آنی چاہیے۔

سات برس ہوتے ہیں، ملتان کے ہوائی اڈے پر اچانک ملاقات ہوئی۔ دور سے ہم نے ایک دوسرے کو سلام کیا اور ہنسے۔ غالباً وہ اس احساس کے ساتھ کہ اس کا واسطہ ایک احمق رومان پسند کے ساتھ ہے جو دنیا کی محبت کو دل سے نکال نہیں سکا اور با اصول ہونے کا تاثر دیتا ہے۔ میں ہمیشہ کی طرح اس تاثر کے ساتھ کہ ہر سیزر کا ایک آخری دن ہوتا ہے، اس آدمی کا آخری دن کب آئے گا۔ نماز پڑھنے کو جی چاہا تو میں نے مسافر خانے کی کرسی پر نیت باندھی۔ تب میں نے کسی کو عقب میں کھڑے پایا، ”میرے لیے اللہ سے دعا کرنا“ اس نے کہا۔ ”ہاں، ہاں۔“ میں نے اسے جواب دیا اور چاہا کہ وہ ٹل جائے مگر وہ ٹلنے والا کہاں تھا۔ ”کون سی دعا مانگو گے؟“ اس نے پوچھا۔ ”اللہ سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ منکشف ہونے کا لمحہ ہے، ایک شخص نہیں بلکہ دولت کی پوجا کرنے والے ایک پورے معاشرے کا۔'' جرنیلوں، ججوں، صحافیوں اور دوسرے قہرمانوں کا۔

کہنا، وہ ملک ریاض کے لیے ہارون کے دل میں رحم ڈال دے۔'' وہ ایک لمحہ اس نے رائیگاں نہ کیا۔ سرمایہ کار کے لیے وقت بھی دولت کی مانند ہوتا ہے۔

دولت مند نے غلطی کا ارتکاب کہاں کیا؟ جہاں سب کرتے ہیں۔ انسانی اختیار کی ایک آخری حد ہے اور محفوظ وہی رہتا ہے جو اس راز سے باخبر ہو۔ ملک اپنی محدودات سے واقف نہیں۔ کم لوگ ایسے ہوتے ہیں، اس لیے عظیم لیڈر تک، سپر پاورز تک گنوار پن کی موت مرتے ہیں۔

نودولتیوں کی بعض عادات اس میں نہیں پائی جاتیں۔ وہ بدکار ہے اور نہ بادہ نوش اس کی واحد ترجیح دولت ہے اور پھر اس دولت کے بل پر حاصل ہونے والی قوت کو برقرار رکھتے ہوئے مزید دولت۔ زر اور زمین اس کا پہلا اور آخری عشق ہیں۔ وہ اپنے گھر میں آسودہ رہنے والا آدمی ہے اور اپنے ہر روز وسیع ہونے والے رسوخ سے لطف اٹھاتا ہے۔ ایک روایتی مذہبی گھرانے کا فرزند، جسے مذہب کی روح کے ادراک سے کبھی کوئی دلچسپی نہ تھی مگر جبلی طور پر وہ جانتا ہے کہ صدقات سے برکت بہت ہوتی ہے۔ ملک بھوکوں کو کھانا کھلاتا اور حاجت مندوں کی ضروریات پوری کرتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ عدم تحفظ کے شکار اس معاشرے میں آسودہ حال مفلسوں سے زیادہ حاجت مند ہوتے ہیں۔

وہ دن آ پہنچا ہے، بہت پہلے سے مجھے جس کا اندازہ تھا۔ یہ دن موخر تو ہو سکتا ہے مگر ٹل نہیں سکتا۔ ارادہ یہ تھا کہ میں خاموش رہوں مگر ایک اخبار نویس خاموش کیسے رہ سکتا ہے۔ اسے گواہی دینا ہوتی ہے اور اگر اللہ توفیق دے تو سچی گواہی۔ پنڈورا باکس کھل گیا ہے اور بند نہ ہوگا۔ معاملہ موخر ہو سکتا ہے، منسوخ نہیں۔ خوش قسمت حسین نے سچ کہا: یہ منکشف ہونے کا لمحہ ہے، ایک شخص نہیں بلکہ دولت کی پوجا کرنے والے ایک پورے معاشرے کا۔'' جرنیلوں، ججوں، صحافیوں اور دوسرے قہرمانوں کا۔ ایک کالم اور ٹاک شو نہیں بلکہ یہ ایک کتاب کا موضوع ہے۔ کیا یہ کتاب کبھی لکھی جا سکے گی؟ کون جانتا ہے، آنے والے کل کی کون جانتا ہے۔ والی اللہ ترجع الامور (اور معاملات اللہ کی بارگاہ میں پیش کیے جاتے ہیں)۔

.....

تماشا ختم ہونے میں ابھی کچھ دیر لگے گی۔ لوگ کہتے ہیں کیا ارسلان کو ایک منصوبے کے

کاروباری لوگ حکمت کے ساتھ راستہ تراشنے والے مصلحت کیش ہوتے ہیں۔ بارودی سرنگیں بچھانا اور دھماکے کرنا ان کی فطرت میں نہیں ہوتا۔ ملک ریاض حسین کی تو پوری زندگی اس فلسفے سے عبارت رہی ہے، تو کیا ارسلان کی طرح ملک صاحب بھی کسی جال میں آ گئے؟

تحت جال میں پھانسا گیا؟ اس پر نوازشات کی بارش کی گئی، ہر ایک چیز کا ریکارڈ رکھا گیا، یہاں تک کہ وڈیو فلمز بنائی گئیں۔ اتنی محنت مشقت اور سرمایہ کاری اس لئے نہیں ہو سکتی کہ فلم ریلیز کئے بغیر کسی ڈبے میں بند کر دی جائے۔ جڑا ہوا سوال یہ پوچھا جاتا ہے کہ کیا ارسلان افتخار اتنا ہی سادہ و معصوم تھا کہ نوازشات کی اس برسات میں جل تھل ہوتا رہا اور اسے کچھ اندازہ نہ ہو پایا کہ بحریہ ٹاؤن اس پر اس قدر مہربان کیوں ہو گیا ہے؟ آج کل تو جب کوئی آدمی دونوں ہاتھوں سے مسکراتے ہوئے ذرا جھک کر مصافحہ کرے تو ماتھا ٹھنکتا ہے کہ ضرور اسے کوئی کام ہے۔ ارسلان افتخار کیوں نہ بھانپ سکا کہ نوازش ہائے بے جا کا سبب کیا ہے؟ پھر ایک نئے سوال کی کونپل پھوٹتی ہے کہ جب ارسلان کی نااہلی عیاں ہو گئی تھی اور وہ بحریہ ٹاؤن کو کسی طرح کا کوئی ریلیف دینے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا بلکہ چار درجن کے لگ بھگ تمام مقدمات کے فیصلے بحریہ ٹاؤن کے خلاف آئے تو ارسلان پر سرمایہ کاری کا سلسلہ کیوں جاری رہا؟ پاؤ بھر دودھ نہ دینے والی بانجھ بھینس کی کھرلی میں کئی برس تک لذیذ چارہ کیوں ڈالا جاتا رہا؟ ملک صاحب خود بھی کہتے ہیں اور پاکستانی قوم بھی یہ سمجھتی ہے کہ عزت مآب چیف جسٹس کا اس کھیل سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا لیکن پھر یہ چبھتا ہوا سوال کہ ایک زیرک اور جہاں دیدہ شخص اپنے بیٹے کے طور اطوار سے اس قدر بے خبر اور لاتعلق کیسے رہا؟ ہماری تہذیب و معاشرت میں تو والدین بچوں کی آنکھوں میں جھانک کر، ان کے دلوں کی دھڑکنیں تک پڑھ لیتے ہیں۔

پھر یہ سوال کہ اگر ارسلان افتخار کے لئے ایک جال بنا گیا تو کیا ملک ریاض حسین یہ جال بننے والے گروہ میں شامل ہیں؟ اگر شامل ہیں تو ان کا مفاد کیا ہے؟ پاکستان کا سب سے موثر اور سب سے مقتدر کاروباری ہوتے ہوئے، ایک عظیم الشان بزنس رکھنے والا شخص کیوں چاہے گا کہ وہ اپنی ذات اور اپنے کاروبار کو ایک بڑے خطرے سے دوچار کرتے ہوئے اس طرح کی مہم جوئی کا آلہ کار بنے؟ کاروباری لوگ بنیادی طور پر حکمت کے ساتھ راستہ تراشنے والے مصلحت کیش ہوتے ہیں۔ بارودی سرنگیں بچھانا اور دھماکے کرنا ان کی فطرت میں نہیں ہوتا۔ ملک ریاض

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے دور ملازمت میں جاہ و جلال کی حشر سامانیاں دکھانے اور سمندروں میں ایک تلاطم سا اٹھا دینے والے بڑے بڑے فوجی افسران آج بحریہ ٹاؤن کی شاداب چراگاہوں میں منہ مار رہے ہیں۔

حسین کی تو پوری زندگی اس فلسفے سے عبارت رہی ہے، تو کیا ارسلان کی طرح ملک صاحب بھی کسی جال میں آ گئے؟ اگر ایسا نہیں تو پھر یہ سوال کہ ملک ریاض جیسے ہنرکار اور بحریہ ٹاؤن جیسا مثالی جہان نو آباد کرنے والے بہترین منصوبہ ساز نے جس کے لئے 32 کروڑ روپے کا کڑوا گھونٹ بھر کر سب کچھ بھول جانا کوئی مشکل کام نہ تھا، اپنی ذات اپنے خاندان اور اپنے اربوں کھربوں کے کاروبار کو داؤ پر کیوں لگا دیا؟

اور پھر سب سے بڑا سوال کہ کیا پس پردہ بیٹھے کچھ زخم خوردگان کے لئے افتخار محمد چوہدری اسی طرح ناقابل برداشت ہو گیا ہے جس طرح وہ روسیاہ ڈکٹیٹر کے لئے ہو گیا تھا؟

ملک ریاض حسین ایک کشادہ دست اور فراخ دل انسان ہیں۔ غریبوں، مسکینوں، یتیموں،

کراچی میں سیارہ ڈائجسٹ کے سول ایجنٹ

تازہ شماروں، خاص اسلامی نمبروں اور
دیگر کتابوں کی خریداری کے لئے براہ کرم

گلستان نیوز ایجنسی

فریر مارکیٹ۔ فریر روڈ کراچی سے رابطہ کریں۔ 021-32733755

Email: sayyaradigest@gmail.com

پتہ لاہور آفس: 240، مین مارکیٹ ریواز گارڈن۔ 042-7245412

ملک صاحب غیر محسوس طور پر ایک ایسے منطقے میں جا نکلے جہاں انہیں مافوق الفطرت صلاحیتیں حاصل ہو گئیں۔ اب وہ پھونک سے کسی ہاتھی کو مکھی اور کسی مکھی کو ہاتھی بنا سکتے تھے۔ انہیں اپنی اس نو دریافت قوت سے کھیلنے میں مزا آنے لگا.....!

بیواؤں اور حاجت مندوں کی بہت بڑی تعداد ان کے سائبان خیر تلے پرورش پا رہی ہے۔ سیاق وسباق سے قطع نظر، بحریہ ٹاؤن ان کی انتظامی صلاحیتوں، ان کے ذوق اور ان کی ہنرمندی کا ایسا شاہکار ہے جس کی نظریں عالمی سطح پر بھی کم کم ہی ملتی ہیں۔ ان کی فراخ دلی اور کشادہ دستی ہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے راستے کی رکاوٹیں دُور کرنے اور کاروباری معاملات کو رواں رکھنے کے لئے سرکار کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ اہلکار کو منہ مانگی قیمت دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ بڑے بڑے عہدوں پر بیٹھے لوگ ان کی اس کشادہ دستی سے فیض یاب ہوتے اور ان کی راہوں کے کانٹے چنتے رہتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ملک صاحب کی مروت ان کی دست گیری کرتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے دور ملازمت میں جاہ و جلال کی حشر سامانیاں دکھانے اور سمندروں میں ایک تلاطم سا اٹھا دینے والے بڑے بڑے فوجی افسران آج بحریہ ٹاؤن کی شاداب چراگاہوں میں منہ مار رہے ہیں۔ ملک صاحب دوستوں کے دوست ہیں لیکن دشمنوں سے دشمنی کرتے ہوئے بھی کبھی آپے سے باہر نہیں ہوتے۔ قربت، بے تکلفی یا راز و نیاز میں تھوڑے یا زیادہ فرق کے ساتھ تقریباً تمام قد آور سیاسی شخصیات سے ان کا میل جول ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ پاکستان میں سیاسی موسم بڑی تیزی سے بدلتے رہتے ہیں لہٰذا وہ بہار اور خزاں کی ساری رتوں سے رابطے قائم رکھتے ہیں۔

پاکستان میں ایک کامیاب کاروباری شخصیت کے لئے یہ سب کچھ ناگزیر ہے۔ سیاستدانوں اور مقتدر بیوروکریسی کے ساتھ اس تعلق کی بنیاد محبت نہیں، ضرورت ہوتی ہے لیکن بہت سے لوگوں کو محسوس ہوا کہ 2008ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت بننے کے بعد ملک صاحب کسی طور صدر آصف علی زرداری کے بہت قریب آ گئے بلکہ ان کے حلقہ خاص کی سب سے نمایاں کرسی پہ جا بیٹھے۔ ان کا رشتہ و تعلق دوسرے سیاستدانوں بالخصوص میاں شہباز شریف اور کسی حد تک میاں نواز شریف سے بھی رہا لیکن عملاً وہ اپنا روایتی توازن قائم نہ رکھ سکے اور ان کا پلڑا پوری طرح صدر آصف علی زرداری کی طرف جھک گیا۔ بلاشبہ وہ اس عہد کے بادشاہ گر بن گئے ہیں اور اسلام آباد میں ان کا گھر نہ صرف قومی سیاست کی کارگاہ بلکہ ہواؤں کو مرضی کا رُخ دینے والی زور آور ایجنسیوں کا آماجگاہ بھی بن گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر یہ باور بھی کر لیا جائے کہ ملک صاحب نے اپنے کچھ کام نکالنے کے لئے ارسلان افتخار پر کروڑوں کی سرمایہ کاری کی تو بھی ملک صاحب کو جاننے والوں کے لئے یہ بات ناقابل یقین ہے کہ وہ ان نوازشات کی اتنی عمدگی کے ساتھ دستاویز بندی کریں گے۔

ملک صاحب غیر محسوس طور پر ایک ایسے منطقے میں جا نکلے جہاں انہیں مافوق الفطرت صلاحیتیں حاصل ہو گئیں۔ اب وہ پھونک سے کسی ہاتھی کو مکھی اور کسی مکھی کو ہاتھی بنا سکتے تھے۔ انہیں اپنی اس نو دریافت قوت سے کھیلنے میں مزا آنے لگا۔ وہ کھیلتے رہے اور توازن بگڑتا چلا گیا۔ اس سارے عرصے میں شاید وہ بھول گئے کہ جادو نگریاں بڑی بے رحم ہوتی ہیں اور الہ دین کے چراغ والا جن اپنے اہداف و مقاصد بھی رکھتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ لوگ ملک صاحب اور ارسلان افتخار کے معاملے کو دو افراد کے درمیان کاروباری تنازعہ یا لین دین کا مسئلہ نہیں سمجھتے۔ اگر یہ باور بھی کر لیا جائے کہ ملک صاحب نے اپنے کچھ کام نکالنے کے لئے ارسلان افتخار پر کروڑوں کی سرمایہ کاری کی تو بھی ملک صاحب کو جاننے والوں کے لئے یہ بات ناقابل یقین ہے کہ وہ ان نوازشات کی اتنی عمدگی کے ساتھ دستاویز بندی کریں گے۔ پیشہ ور لوگوں سے وڈیوز تیار کرائیں گے اور ایک ایسے وقت میں جب انتہائی اہم مقدمات عدالت کے روبرو ہیں، وہ ایک خاص پلان کے تحت برطانوی اور پاکستانی اخبار نویسوں کو ایسی خوفناک سٹوری لیک کر دیں گے۔ بیس کروڑ روپے ملک صاحب کی تجوری میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ وہ اس زخم کو بھلا کر اپنی افتادِ طبع اور روایت کے مطابق کوئی نیا راستہ نکال سکتے تھے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، ''یہ بات بھی ہضم ہونے والی نہیں کہ ایک دھیلے کا کام نہ کرا سکنے والے ارسلان پر کئی برس پر محیط کروڑوں کی سرمایہ کاری کیوں کی جاتی رہی۔'' سو ملک صاحب کے حوالے سے تمام تر خوش گمانیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بھی نہایت نوکیلے سوالوں کے جواب نہیں مل پا رہے۔ جب واضح اور تسلی بخش جواب نہ ملیں تو بدگمانیاں اُگتی ہیں، شکوک و شبہات سر اُٹھاتے ہیں، سازشوں کی فصل لہلہاتی ہے اور چوپال بھانت بھانت کی بولیوں سے چھلکنے لگتے ہیں۔

بلاشبہ جسٹس افتخار محمد چوہدری کچھ دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں۔ ایک تحریری معاہدے کے باوجود ایک سال تک مشرف کے عتاب کا نشانہ بننے اور آمریت کے قلعے پر پہلی کاری ضرب لگانے والے افتخار محمد چوہدری اور دیگر جج صاحبان کو بحال نہ کرنا اور ڈوگر عدلیہ سے دل لگا لینا، اس

پیپلز پارٹی کو افتخار بیزار حکمت عملی کے لئے بہانہ مل گیا ہے۔ پی پی پی مسلسل عدلیہ کی طرف جھپٹ رہی تھی۔ اب اس نے ایک بودا سا جواز تراش لیا ہے!

حکومت کی سوچ کی ترجمانی کر رہا تھا۔ لانگ مارچ کے نتیجے میں 15 مارچ 2009ء کی شب پچھلے پہر کی ڈوبتی ساعتوں میں ججوں کی بحالی کا اعلان حکومت کا اختیاری فیصلہ نہ تھا۔ اس نے آج تک اس عدلیہ کو کھلے دل سے تسلیم نہیں کیا۔ این آر او سے وزیراعظم کی سزا تک درجنوں فیصلے حکمرانوں کو پسند نہیں آئے اور وہ عدلیہ سے جنگ آزما ہیں۔ اسی دوران لاپتہ افراد کے حوالے سے چیف جسٹس کی حالیہ فعالیت بھی زور آور بارگاہوں پر یقیناً گراں گزری ہے۔ اڈیالہ جیل کے گیارہ قیدیوں کا معاملہ بھی کچھ قوتوں کو آسانی سے ہضم نہیں ہوا۔ کوئٹہ میں بیٹھ کر جناب چیف جسٹس نے یہاں تک کہہ دیا کہ بیشتر لاپتہ افراد کا کھرا ایف سی کی طرف جاتا ہے۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ پی پی پی کی مخلوط حکومت کے دائیں بائیں بیٹھے لوگ وہی ہیں جنہوں نے 12 مئی کا خونیں المیہ رقم کیا تھا اور جو افتخار چوہدری کے خلاف کیلوں جڑے ڈنڈوں والے جلوس نکالتے تھے۔ سو اختیار اور اقتدار کی بارگاہیں اسی طرح کی بوباس سے بھر گئی ہیں جو 9 مارچ 2007ء کو راولپنڈی کے آرمی ہاؤس میں آ بیٹھی تھی۔ تب ڈکٹیٹر بھول گیا تھا کہ تقدیریں قادرِ مطلق کے ہاتھ ہوتی ہیں اور آج تین برس سے بس گھولتی اور افتخار چوہدری کو کسی گرداب کی نذر کر دینے کی آرزومند قوتیں سرگرم ہو گئی ہیں کہ بحریہ ٹاؤن اور ارسلان افتخار کے معاملے کو کھینچ تان کر جسٹس افتخار محمد چوہدری تک لے جائیں اور اس نئی عدلیہ کے قلعے کا وہ مرکزی ستون گرا دیا جائے جس نے کرپٹ، بدعنوان اور بدنظم حکمرانوں اور خودسر قوتوں کو کسی حد تک لگام ڈال رکھی ہے۔

بحریہ ٹاؤن اور ارسلان افتخار کا یہ معاملہ ان افتخار بیزار عناصر کے لئے ایک ''جواز'' بنتا جا رہا ہے۔ پہلے وزیراعظم کے ایک مشیر با تدبیر، جو تب پرویز مشرف کی ہم نوائی میں جسٹس افتخار چوہدری پر کوڑے برسا رہے تھے، گویا ہوئے کہ افتخار چوہدری کو مستعفی ہو جانا چاہیے۔ پھر حامد میر کے کیپیٹل ٹاک میں معقول بات کرنے والے ندیم افضل چن نے ملک صاحب کو اپنا آئیڈیل قرار دیتے ہوئے اسی نوع کا مطالبہ کیا۔ پھر پنجاب کے گورنر سردار لطیف کھوسہ نے یہی راگ الاپا۔ قومی اسمبلی میں، جج سکینڈل کے شہرت یافتہ حضرت حامد سعید کاظمی نے یہی مطالبہ کر ڈالا۔ راجہ ریاض نے بھی بقدرِ توفیق حصہ ڈال دیا۔ کیا یہ سارا کھیل اسی مطالبے کے لئے کھیلا گیا؟ اور کیا ملک ریاض حسین کو استعمال کر لیا گیا؟ ملک صاحب کا دعویٰ ہے کہ جب انہوں نے صدر زرداری کو اعتماد میں لیا تو صدر نے انہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

افتخار چوہدری کے خلاف تازہ یلغار اپنے اندر ایک طوفان سمیٹے ہوئے ہے، اسے تنہا چھوڑ دینا، پاکستان کو منہ زور اور خونخوار عفریتوں کا جنگل بنا دینے کے مترادف ہوگا۔

اس سے روکا۔ ہمارے پاس اس دعوے کی تردید یا تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اگر ملک صاحب کا یہ سارا مقدمہ ان کی ذاتی سوچ اور صرف ان کے اپنے فیصلے پر منحصر ہے تو بھی پیپلز پارٹی کو افتخار بیزار حکمت عملی کے لئے بہانہ مل گیا ہے۔ اردو کا محاورہ ہے ''بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا'' اس کے معنی یہ ہیں کہ محض اتفاق یا خوش قسمتی سے کسی کی مراد بر آئے۔ پی پی پی مسلسل عدلیہ کی طرف جھپٹ رہی تھی۔ اب اس نے ایک بودا سا جواز تراش لیا ہے۔ لیکن جس قادر مطلق نے 9 مارچ 2007ء کو آرمی ہاؤس میں، کئی باوردی جرنیلوں کے نرغے میں آئے ہوئے افتخار چوہدری کو ''حرف انکار'' کا حوصلہ دیا تھا، یقیناً وہ اب بھی اسے تنہا نہ چھوڑے گا۔ ارسلان افتخار اور ملک ریاض کے ساتھ بلا رو و رعایت، دستور و قانون کے مطابق سلوک ہونا چاہیے۔ ہر ایک کو اپنے اپنے قصور کے مطابق سزا ملنی چاہیے لیکن وکلاء برادری اور سول سوسائٹی کو ایک بار پھر اپنا کردار بھی ادا کرنا چاہیے۔ اگر 9 مارچ 2007ء کی مکروہ تاریخ اپنے آپ کو دہرانے چلی ہے تو وکلاء اور سول سوسائٹی کو بھی اپنی تابندہ و درخشندہ تاریخ دہرانے کے لیے کمربستہ ہو جانا چاہیے۔ افتخار چوہدری کے خلاف تازہ یلغار اپنے اندر ایک طوفان سمیٹے ہوئے ہے، اسے تنہا چھوڑ دینا، پاکستان کو منہ زور اور خونخوار عفریتوں کا جنگل بنا دینے کے مترادف ہوگا۔

☆.....☆.....☆

ملک ریاض صاحب پاکستان واپس تشریف لائے اور انہوں نے اپنا تحریری بیان سپریم کورٹ میں داخل کرا دیا۔ سپریم کورٹ میں انہوں نے وہی الزامات ارسلان کے بارے میں دہرائے جو وہ میڈیا کو بتا چکے تھے۔ اس کے ساتھ انہوں نے دستاویزی ثبوت بھی پیش کئے۔ سپریم کورٹ میں بیان میں انہوں نے چیف جسٹس کی تعریف کی اور عدلیہ کے احترام اور اس پر اعتماد کا اظہار کیا۔

لیکن اسی شام 5 بجے ملک ریاض صاحب نے اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں پریس کانفرنس کر کے نیا پنڈورا باکس کھول دیا۔ پریس کانفرنس میں انہوں نے چیف جسٹس کی ذات کو بھی اس کیس میں ملوث کرنے کی اپنی سی کوشش کی اور اخبار نویسوں کے سامنے کھل کر یہ بات کہی کہ اس تمام واقعے کا چیف جسٹس کو علم تھا اور ارسلان انہیں بلیک میل کرتا تھا۔ ملک ریاض کا ارسلان افتخار کے بارے میں کہنا تھا کہ وہ عدلیہ کو ڈان کی طرح چلا رہا ہے۔ اس پریس کانفرنس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک ہی انٹرویو میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ انہیں چیف جسٹس پر اعتماد ہے اور وہ اس ملک کے لیے امید کی واحد کرن ہیں اور پھر ساتھ ہی یہ سوال بھی کھڑا کر دیتے ہیں کہ وہ میرے سوالات کا جواب دیں اور وہ اپنے بیٹے کے کرتوتوں سے کیسے بے خبر رہ سکتے ہیں

میں انہوں نے قرآن مجید کو پکڑ کر چیف جسٹس سے تین سوال کئے: (۱) چیف جسٹس قرآن پاک اٹھا کر بتائیں کہ رات کے اندھیرے میں مجھ سے کتنی ملاقاتیں کیں؟ (۲) کیا انہیں ارسلان کیس کے بارے میں پہلے سے پتہ نہیں تھا؟ (۳) میرے پارٹنر احمد خلیل کے گھر وہ وزیراعظم سے کتنی مرتبہ ملے؟

اس پریس کانفرنس کے بعد ملک میں ایک بھونچال آ گیا ہے۔ ہر پاکستانی ایک دوسرے سے پوچھ رہا ہے کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ صرف چند گھنٹے قبل ملک ریاض سپریم کورٹ اور چیف جسٹس کی تعریف کر رہے تھے لیکن پھر اچانک پریس کانفرنس میں انہوں نے اپنے موقف کو بالکل تبدیل کرتے ہوئے براہ راست عدلیہ اور چیف جسٹس پر الزامات عائد کر دیئے۔ ملک ریاض حسین کے الزامات میں سے دو کا جواب آ چکا ہے۔ یعنی سپریم کورٹ کے رجسٹرار نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ اپنی معزولی کے دوران چیف جسٹس نے ملک ریاض سے دو یا تین ملاقاتیں کی تھیں، جن میں انہوں نے چیف جسٹس سے آصف علی زرداری سے ملاقات کر کے چند غلط فہمیاں دور کر لینے کی درخواست کی جسے چیف جسٹس نے مسترد کر دیا، نیز ملک ریاض نے چیف جسٹس کو انکی حفاظت کیلئے بلٹ پروف گاڑی دینے کی پیشکش کی، جناب چیف جسٹس نے اس پیشکش کو بھی مسترد کر دیا۔ دوسرا الزام جو احمد خلیل کے گھر پر وزیراعظم سے ملاقاتوں کے حوالے سے تھا، اس کے بارے میں بھی یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ صرف ایک ملاقات ہوئی جو محض اتفاقیہ تھی۔

ملک ریاض نے اس کے بعد چند ٹیلی ویژن انٹرویوز میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا، تاہم ان کے خیالات مبہم اور منتشر نظر آئے کیونکہ ایک ہی انٹرویو میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ انہیں چیف جسٹس پر اعتماد ہے اور وہ اس ملک کے لیے امید کی واحد کرن ہیں اور پھر ساتھ ہی یہ سوال بھی کھڑا کر دیتے ہیں کہ وہ میرے سوالات کا جواب دیں اور وہ اپنے بیٹے کے کرتوتوں سے کیسے بے خبر رہ سکتے ہیں۔ بہرحال یہ بات واضح ہے کہ انکی طرف سے جناب چیف جسٹس پر الزامات عائد کرنے اور انکی ذات کو سارے معاملے میں ملوث کرنے کی کوشش سے ملک بھر میں ہیجان برپا

ہو گیا ہے۔ لوگ ملک اور اعلیٰ عدلیہ کے مستقبل کے حوالے سے انتہائی متفکر ہیں۔ اسی ہیجانی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے سپریم کورٹ نے ملک ریاض سے انکی پریس کانفرنس کے حوالے سے جواب طلبی کی اور انہیں پابند کیا ہے کہ جب تک یہ معاملہ عدالت میں زیر سماعت ہے وہ ایسے بیانات دینے سے پرہیز کریں۔

ملک ریاض جس طرح عدلیہ پر الزام لگاتے رہے ہیں اس سے سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہو گیا ہے کہ ملک ریاض کے پیچھے کون سی قوتیں یا چہرے پس پردہ ہیں جو انہیں استعمال کر کے ایک بہت بڑی سازش رچا رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہ وہ طاقت ہے جس کو اس سارے معاملے سے سب سے بڑا فائدہ پہنچا ہے یا پہنچے گا۔ ہر آدمی یہ سوچ سکتا ہے کہ ایک بہت امیر کبیر اربوں پتی آدمی صرف 34 کروڑ کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کو کیوں تیار ہو گیا؟ جس کا صاف مطلب ہے کہ اس کو پوری گارنٹی دی گئی تھی کہ کوئی اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔

سپریم کورٹ آف پاکستان نے اس انتہائی حساس اور اہمیت کے حامل کیس کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک تاریخی فیصلہ دیدیا ہے اور ابتدائی فیصلہ سناتے ہوئے کہا ہے کہ اس کیس کے تینوں مرکزی کرداروں یعنی ارسلان افتخار، ملک ریاض اور ان کے داماد سلمان کے خلاف سخت تادیبی کارروائی عمل میں لائی جائے۔ اعلیٰ عدلیہ نے اپنے فیصلے میں کہا کہ ملک میں کوئی بھی قانون سے بالا تر نہیں، اس حوالے سے وزیراعظم کی سزا کی مثال سب کے سامنے ہے۔ عدالت کے فیصلے میں کہا گیا کہ قانون کے مطابق رشوت دیکر ناجائز کام کروانا جرم ہے اور اس کی سزا ملنی چاہیے۔ سپریم کورٹ نے اٹارنی جنرل پاکستان کو حکم دیا کہ وہ اس کیس کے تینوں کرداروں کے خلاف کارروائی کو یقینی بنائیں اور اس کے لیے ریاستی مشینری کو حرکت میں لائیں۔ سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ انتہائی اہم اور ملک کے عوام کی امنگوں اور انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اس کیس کے جلد اور بروقت فیصلے سے ملک میں جاری بے چینی اور ہیجانی کیفیت کا خاتمہ ہوگا اور ان سازشی عناصر کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا جو اس ساری صورتحال سے فائدہ اُٹھا کر سپریم کورٹ اور جناب چیف جسٹس کے خلاف مہم جوئی کرنا چاہتے تھے۔ سپریم کورٹ نے اب گیند حکومتی کورٹ میں پھینک دی ہے کہ وہ انصاف کے مطابق تاریخی فیصلے پر عمل درآمد کرائے۔

ملک میں ایسی کون سی طاقتیں ہیں جو گاہے بہ گاہے سازشوں کا گھناؤنا کھیل کھیلتی رہتی ہیں۔ ہر پاکستانی کے دماغ میں اس سوال کا جواب جاننے کے لیے ایک ہیجانی کیفیت برپا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ ملک کا کوئی خیر خواہ نہیں اور نہ ہی ملک سے کسی کو ہمدردی ہے۔ سب اپنے اپنے مفاد میں کام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی پاکستان کی حفاظت کرے (آمین)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تنہائی کا زہر

یاسمین چشتی

"مظہر کو حاصل کرنے کے لیے میں نے اپنے بال کٹوا لیے، آستینیں تراش دیں، اس کے پیچھے بھاگی پھری، ماڈلنگ کی، کلب میں رقص بھی کیا مگر پھر بھی وہ میرا نہ ہو سکا۔ ہم ایک بستر پر دو اجنبی ہو گئے۔ اس کے نام کی چوڑیاں جو میرے ہاتھوں میں پڑی تھیں ان کی کھنک سب نے سنی مگر اس نے نہ سنی۔"

صنف سخت کی سنگدلی پر ایک زہریلی اور کٹیلی تحریر

میں دنیا و مافیہا سے بے خبر لکھنے میں محو تھی کہ فون کی گھنٹی بجی اور میں اچھل پڑی۔ فطری طور پر فون اٹھانے کے ساتھ ہی گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کا ایک بجا تھا۔

"ہیلو" میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہیلو، کون ہو؟" نیند میں ڈوبی نسوانی آواز میں کسی نے جواب دیا۔

"جی آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟"

"کیا تم مجھ سے چند لمحے بات کر سکتی ہو؟"

"جی میں؟ اس وقت؟ دیکھیے آپ کو کیا کام ہے اور کس نمبر پر آپ نے فون کیا ہے؟"

"تم نمبر کی بات کرتی ہو ہم خود کو بھول چکے ہیں۔" اس کی آواز میں نمایاں لڑکھڑاہٹ نے ثابت کر دیا کہ میں جسے نیند کا بوجھل پن سمجھ رہی ہوں وہ

شراب کا اثر ہے۔ اس نے سسکتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لیے مجھے تنہا مت چھوڑو میرے کشکول میں چند لمحے ڈال دو۔"

"اچھا آپ روئیں نہیں کیا بات ہے بولیں؟" میں نے نرمی سے کہا۔

"مجھ سے باتیں کرو۔" اس کی آواز میں بچوں کی سی معصوم التجا تھی۔

"کیا باتیں کروں آپ ہی کچھ بتائیں۔"

"اپنے تنہا وجود کے جنگل میں بھٹکنے والے کیا بتا سکتے ہیں؟" اس نے شاید ایک گھونٹ نگل کر جواب دیا۔

"تو پھر ذات میں ڈوب کر نئی دنیا پیدا کر لیں۔"

"میں نرگسیت کا شکار نہیں ہوں اور یہ لہجے کی اجنبیت ختم کرو۔" اس نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

"ہر چیز احساس کی پیداوار ہے، دکھ کا احساس ختم کرو، وہ دکھ جو تمہیں جلا رہا ہے خود بخود ختم ہو جائیگا۔"

"وہ جو اوپر ہے نا....."

"کون اوپر ہے؟" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بیچ میں بات کاٹ دی۔

"ارے وہی جس نے دنیا بنا کر سارے ہنگامے کرائے ہیں۔ اس نے ہمارے ضمیر کو احساس کی تپش دی ہے۔ تمہارا اس کے ساتھ کیسا تعلق ہے؟"

"بھئی ہمارا تعلق تو عام طور پر کشیدہ ہی رہتا ہے۔" میں نے اس کی ذہنی کیفیت سمجھتے ہوئے کہا۔

"اور پھر مجھ سے کہتی ہو احساس ختم کر دوں دکھ ختم ہو جائیں گے۔ میں نے بھی اس سے بڑی توقع رکھی مگر میری راتیں اسی طرح سنسان ہیں۔ مظہر آج بھی ایک نئی لڑکی کے ساتھ کسی ہوٹل یا کلب میں رقص کر رہا ہوگا۔"

اس ایک جملے سے اس کی حالت کا پورا پس منظر میری سمجھ میں آ گیا۔

"کیا سوچنے لگیں؟"

"سوچ رہی ہوں تم مظہر کے لیے روز ایک نئی لڑکی کا روپ کیوں نہیں دھار لیتیں؟"

"بیوقوف تم مجھے ناتجربہ کار لگتی ہو۔" اس کے لہجے میں طنز کا شائبہ تھا۔

"میرے خیال میں تو ہمارے ماحول کی ہر عورت مرد کے معاملے میں ناتجربہ کار ہی ہوتی ہے۔"

"جہاں میں نے جنم لیا تھا وہاں الغوزہ اور رباب کی مدھ بھری تان سنائی دیتی ہے۔ وہاں بھائی اگر بہن کو کھڑکی سے جھانکتا دیکھ لے تو گولی مار دیتا ہے۔ میرا ماحول تمہارے ماحول سے زیادہ معصوم ہے اس لیے میں زیادہ ناتجربہ کار تھی مگر مظہر کو حاصل کرنے کے لیے میں نے اپنے بال کٹوا لیے، آستینیں تراش دیں، اس کے پیچھے بھاگی پھری، ماڈلنگ کی، کلب میں رقص بھی کیا مگر پھر بھی وہ میرا نہ ہو سکا۔ ہم ایک بستر پر دو اجنبی ہو گئے۔ اس کے نام کی چوڑیاں جو میرے ہاتھوں میں پڑی تھیں ان کی کھنک سب نے سنی مگر اس نے نہ سنی۔" لہجے میں آنسوؤں کی گھلاوٹ کے ساتھ اس نے جواب دیا۔

"تم نے اپنا وہ اسرار کیوں نہ قائم رکھا جو اس کو تم میں نئے پن کا احساس دلاتا؟"

"بیوقوف! بیوی ایک ایسی کتاب کا نام ہے جس کے تمام ورق پڑھے جا چکے ہوتے ہیں اور مظہر مجھے پڑھ چکا ہے اس لیے اب نئی لڑکیوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔"

"دیکھو رشتوں کے تقدس کو ذہن میں رکھ کر بات کرو۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"تقدس..... رشتے..... اوہنہ! سنگساری کی سزا خدا کی طرف سے عورت مرد دونوں کے لیے ہے مگر معاشرے میں عورت مجرم سمجھی جاتی ہے۔ مرد پارسا رہتا ہے۔ اب میں بھی مظہر سے انتقام لوں گی۔"

"مگر اس میں تمہارا ہی زیاں ہے۔" میں نے بھی اس پر وار کر دیا۔

"جب ذہن میں انتقام کے انگارے سلگ رہے ہوں تو انسان سود و زیاں سے ماورا ہو کر سوچنے لگتا ہے۔"

"تنہائی کی دوزخ سے نکلنے کے لیے تم نے شراب کا سہارا لیا اور انتقام کی آگ سرد کرنے کے لیے تم آوارگی اختیار کرنے کا سوچ رہی ہو مگر اتنا میں بتا دوں کہ یہ تمہیں مہنگی پڑے گی۔ تم مجھے اس قبیل کی نہیں لگتیں جو آوارگی سے حاصل ہونے والے سکون سے خوش ہو سکیں۔"

"تم پیو گی؟" مہکے مہکے انداز میں اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"اگر تم ساقی گری کا وعدہ کرو۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اس ساقی گری نے ہی تو مجھے میکساروں کی منڈلی میں شامل کر دیا حالانکہ میں نے پلانے میں کبھی خست نہ کی تھی مگر مظہر کا اصرار تھا میں اس کیساتھ پیوں۔"

"اور تم مچھلی کی طرح پینے لگیں؟"

"مچھلی! وہ تو بہت چھوٹی چیز ہے مگر مچھ کہو مگر مچھ۔ میں چاہتی تھی مظہر اگر پیے تو گھر میں پیے کم از کم ساری رات میں تنہا تو نہ رہوں گی۔ کمرے کی دیواریں مجھ پر نہ گریں گی مگر شاید میں ایک اچھی مے خوار بھی ثابت نہ ہوئی۔" اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔

"مے خواری کی بھی قسمیں ہوتی ہیں؟"

"ہاں تم مجھے کنویں کا مینڈک معلوم ہوتی ہو۔ تمہیں اتنا بھی پتہ نہیں پہلے زمانے میں وہ اعلیٰ ظرف تھا جو پی کے نہ بہکے اور آج وہ اچھا ہے جو تن من دھن سب سے بیگانہ ہو جائے۔ میرے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ بقول مظہر میں پی کے فلسفی ہو جاتی ہوں اور اسے فلاسفر کی ضرورت نہیں۔"

"دیکھو اب رات کے پونے تین بج رہے ہیں تم بھی سو جاؤ مجھے بھی سونے دو۔" میں نے بچے کی طرح چمکار کر کہا۔

"اچھا تمہاری مرضی۔" اس نے فرمانبرداری سے کہہ کر فون بند کر دیا۔ وہ تو فون کر کے دل ہلکا کر چکی تھی مگر اس نے میری نیند اڑا دی۔ جانے میرے شہر میں کتنی عورتیں اس المناک دکھ کا شکار ہیں۔ کتنے شوہر اپنی بیویوں سے بے خبر ان کو نظر انداز کر رہے ہیں اور پھر تنہائی مٹانے کے لیے ان کے قدم غلط سمت میں اٹھ جاتے ہیں۔ وہ ایک تنہائی مٹانا چاہتی ہیں اور آبرو کھو دیتی ہیں۔ بلیک میلروں کے چکر میں پڑ جاتی ہیں۔ اگر اس عورت نے اپنے نشے میں کسی ایسے ہی غلط مرد سے بات کر لی تو کیا شوہر کا دکھ اس کو کوٹھی سے کوٹھے پر نہ پہنچا دے گا۔ اس کے اندر چھپا خوف جو شوہر کے رویے کی پیداوار ہے، شراب سے کتنا عرصہ مٹتا رہے گا! اگر اسکے حالات یہی رہے تو ایک دن ایسا آئے گا جب شراب بھی اس کے غم کا مداوا نہ ہو گی۔

آج کا مرد باہر کی دنیا میں اس قدر کھویا رہتا ہے کہ اس نے گھر کو ہی ختم کر دیا۔ وہ اپنے گھر میں اجنبی بن گیا ہے۔ بیوی تنہائی کے غار میں دفن ہے۔ اداسیوں کے اذیت ناک لمحے اس کو ڈس رہے ہیں مگر شوہر کی رنگین دنیا میں نئی تتلیاں رقصاں ہیں۔ کتنی بیویوں نے شوہروں کے پیچھے بھاگتے ہوئے شراب نوشی شروع کی ہو گی۔ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ مردوں کو اپنی بیویاں اب اچھی کیوں نہیں لگتیں؟ اگر واقعی مردوں میں گھریلو عورت کی خواہش ختم ہو گئی ہے تو پھر وہ اپنے رخ روشن سہروں سے کیا صرف اس لیے سجاتے ہیں کہ بہت سے سامان کے ساتھ ایک عدد ملازمہ ان کے گھر آ جائے؟

کوئی تو جواب دے!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں"

قلندر حسین سیّد سیارہ ڈائجسٹ کے دیرینہ قاری اور مستقل قلمکار ہیں۔ گذشتہ کئی ماہ سے وہ ایسی بہترین تحریروں کا مجموعہ قارئین کی نذر کر رہے ہیں جو قارئین میں بے حد پسند کی جا رہی ہیں اور جن کے حصول کے لیے بے شمار کتب، جرائد اور انٹرنیٹ سے استفادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جناب سیّد نے قارئین سیارہ ڈائجسٹ کیلئے اپنے گہرے مطالعہ اور تحقیق کے نچوڑ کیساتھ ساتھ دنیائے ادب کی چنیدہ کتب و جرائد سے اخذ اقتباسات پر مشتمل انتخاب کو زیر نظر سلسلے میں یکجا کر دیا ہے۔ ان تحریروں میں شہد جیسی مٹھاس، لیموں کی کھٹاس، کوڑتما کی کڑواہٹ اور زہر ہلاہل کی آمیزش ہے۔!!

husain_sayyed2001@yahoo.com

جواہر پارے

☆.....انسان کی ایک ایک سانس موت کی طرف ایک قدم ہے۔ (حضرت علیؓ)

☆.....باشعور انسان وہ ہے جو اپنے آج کو گزرے ہوئے کل سے بہتر بنائے۔

☆.....ہمیشہ اپنی چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کرو کیونکہ انسان پہاڑوں سے نہیں پتھروں سے ٹھوکر کھاتا ہے۔

☆.....اگر چڑیوں میں اتحاد ہو جائے تو شیر کی کھال اُتار سکتی ہیں۔ (شیخ سعدی)

☆.....مجلس میں بیٹھ کر قریب تر لوگوں کی مزاج پرسی کرو۔ میزبان کو انتظار میں نہ ڈالو۔ وقت مقررہ پر آنا واجب ہے۔ (امام غزالیؒ)

☆.....دو چیزیں اخلاق کی وضاحت کرتی ہیں: آپ کا "ظرف" جب آپ کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور آپ کا "رویہ" جب آپ کے پاس سب کچھ ہو۔

☆.....دنیا بدترین ہوتی جا رہی ہے۔ بُرے لوگوں کے زیادہ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اچھے لوگوں کی خاموشی کی وجہ سے۔

.....

متشکک کو دعوت عام ہے

بیگم وزیر زادی کو عقل کل سمجھ کر نہایت ادب و احترام کرتی تھی۔ اس کی بات کو قابل پیروی سمجھنے لگی تھی۔ اس لئے اس نے کہا کہ "ہر چند کہ میں

بڑھاپے کو اٹل سا سمجھتی تھی لیکن اب میں اس امر کے ماننے کے لئے تیار ہوگئی ہوں کہ آپ کے پاس فی الواقع ایسا نسخہ ہوگا جو حسن کو لازوال کر دے۔"

وزیرزادی نے کہا کہ ہر متشکک کو دعوت عام ہے کہ حسن ظاہری کو لازوال کر دینے کے نسخے کو آزمائے۔ اس طرح شخصی اور اجتماعی زندگی کو مفید تر بنانے میں مدد دے۔ اس قیمتی نسخے کے اجزاء اس قسم کے ہیں کہ ہر شخص اس ناممکن الواقع دعویٰ کو بادی النظر میں سچ سمجھنے لگے گا۔ بہتر صحت کے لئے پانی، ہوا اور غذا کا بہتر ہونا ضروری ہے۔ اگر ان تینوں چیزوں کے استعمال میں مناسب احتیاط برتی جائے تو دم واپسیں تک حسن قائم رکھا جا سکتا ہے بلکہ روٹھی ہوئی جوانی منائی جا سکتی ہے۔

غذا کے معاملے میں اس زریں اصول کو پیش نظر رکھو کہ دانتوں کا کام آنتوں سے نہ لیا جائے۔ بھوک ہو تو کھانا کھایا جائے، ابھی بھوک باقی ہو تو ہاتھ کھینچ لیا جائے۔ لقمہ کو اتنا چبایا جائے کہ منہ میں چھوٹے سے چھوٹا ریزہ بھی حلق میں اُترتا محسوس نہ ہو بلکہ روٹی کا لقمہ پانی کی طرح اُتر جائے۔ ابتداء میں ذرا عادت ڈالنے میں تھوڑی تکلیف کرنا پڑے گی لیکن ایک ماہ کے اندر صحت میں صاف انقلاب پیدا ہوتا دکھائی دے گا۔ اگر غذا کم از کم کھائی جائے اور اس پر مداومت کی جائے تو تین برس کے بعد اسّی برس کا آدمی بیس سال کا جوان ہو سکتا ہے اور دس برس بعد سفید بال سیاہ ہو جائیں گے۔ رنگ پھول کی پتی کی طرح سرخ ہو جائے گا۔

بس غذا کا اصول یہ ہے کہ کم از کم خوراک زیادہ سے زیادہ چبا کر کھائی جائے۔ ایک پاؤ غذا اوسط درجہ کے آدمی کے لئے کافی ہے۔ اس کے لئے کم از کم آدھ گھنٹہ چبانے کے لئے ضروری ہے۔ یہ خیال نہ کرو کہ چاول یا دوسری ہلکی غذائیں جلدی جلدی نگل لی جائیں بلکہ ان کو بھی تادیر چبانا چاہیے تاکہ وہ بھی لعاب میں حل ہو جائیں۔ غذا کے ساتھ اس اصول کو جتنا بھی پیش نظر رکھیں گے اسی نسبت سے صحت اور حسن میں اضافہ ہوگا۔

غذا کے بعد ہوا خوری کا سوال اہمیت رکھتا ہے۔ کھلی اور صاف ہوا اکسیر ہے۔ صبح کے وقت منہ بند کر کے ناک کے ذریعے اس کو آہستہ آہستہ اندر کھینچو، سینے میں روکو پھر آہستہ آہستہ ناک کے راستے ہی باہر نکال دو۔ یہ عمل پندرہ منٹ روزانہ کافی ہے۔ اس کے بعد سینے کا کوئی مرض ممکن ہی نہیں۔ اس عمل سے جو گی عمر اور صحت کو مدت تک قائم رکھتے ہیں۔

اگر قدرتی چشموں کا پانی میسر آ جائے تو کیا کہنے ورنہ پانی اُبال کر صاف کر لیا جائے۔ اگر ان احتیاطوں کے ساتھ صبح اور شام کی سیر پر مداومت کی جائے تو صحت اور حسن کا بیمہ ہو جاتا ہے۔ عقل ترقی کرتی ہے۔ بیگم صاحبہ! تم آج اپنی صورت کو دیکھو کہ حسن کا آفتاب ہے تاہم تین ماہ کے بعد اگر تم آئینہ رو ہو کر دیکھو گی تو پہلے سے زیادہ حسن میں ترقی ہو گی بشرطیکہ اس عرصہ میں کم غذا، ہوا اور پانی میں احتیاطیں برتو جو میں نے بتائی ہیں۔

بیگم نے کامل تین ماہ صبح و شام کی سیر و تفریح کے ساتھ غذا اور پانی کے معاملہ میں متذکرہ تدابیر کو اختیار کیا۔ خدمت خلق سے دل مطمئن تھا۔ عملی عبادت یعنی خدمت خلق کے ساتھ ان تدابیر نے صورت اور سیرت دونوں کو روشن کر دیا۔ تین ماہ کے بعد اس نے اپنے جمال جہاں آراء کو دیکھا۔ وہ کچھ اور کی اور ہوئی تھی۔ قدرت نے حسن میں اور رنگ بھر دیا۔ آنکھیں پہلے بھی روشن تھیں۔ اب ان میں شراب سی چھلکتی تھی۔ چاندسی پیشانی پر بال بکھر کر بہار پیدا کر رہے تھے۔ جب وہ مسکراتی تھی، دیکھنے والے کے دل کا کنول کھل جاتا تھا۔ خرام اور عظمت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی کہ فرشتے رُک رُک کر دیکھتے تھے۔ وہ ناز و نخرے سے نفور تھی مگر اس کی ہر حرکت میں ہزاروں ادائیں پوشیدہ تھیں۔ ہوا اور غذا کی احتیاط نے اسے صبح بہار کا شگفتہ پھول بنا دیا تھا۔ عمل صالح نے اس میں اپنی متانت پیدا کر دی تھی کہ وہ سچ مچ آسمان کی حور معلوم ہوتی تھی جسے شاہ خدا کی طرف سے خوش نما تحفہ سمجھنے لگا تھا۔

بیگم باوجود اس کے کہ اب اسباب حسن پر پوری نگاہ نہ رکھتی تھی تاہم اپنے فروغ حسن کو دیکھ کر وزیرزادی کی عظمت کی قائل تھی کہ اس نے فی الحقیقت مجھے حقیقی اور ظاہری حسن کی دولت کا نہ ختم ہونے والا خزانہ بخش دیا ہے۔ بیگم نے نواب کو کہہ کر ریاست بھر میں اس مضمون کے بڑے بڑے اشتہار درودیوار پر چسپاں کرائے کہ حسن کی تین قسمیں ہیں:

ایک آنکھ کی جنت ہے۔

دوسرا عوام کے دل کی ٹھنڈک ہے۔

تیسرا اپنے قلب کا اطمینان ہے۔

وہ حسن جو عوام کے دل کی ٹھنڈک ہے، غیر اعتباری چیز ہے۔ ایسے حسن کی طلب ریاکار انسانوں کا شیوہ ہے۔ وہ حسن، جو آنکھوں کے لئے جنت ہے، زندگی بھر قائم رہ سکتا ہے۔

بشرطیکہ: (۱) غذا کو بہت چبا کر کھایا جائے۔

(۲) سانس آہستہ آہستہ لے کر سینے میں روکے رکھا جائے۔

(۳) صبح و شام سیر سے غفلت نہ کی جائے۔

تیسری قسم میں حقیقی حسن ہے جو خدا کی عملی عبادت یعنی خدمت خلق سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ اطمینان کی وہ غیر فانی جنت ہے جہاں خزاں کا گزر نہیں۔

ہر شخص نیک عمل کر کے، غذا کو چبا کر، سانس کو روک کر حسن حقیقی کی غیر فانی دولت حاصل کر سکتا ہے اور حسن ظاہری کو تا زیست قائم رکھ سکتا ہے۔

("جواہرات" چوہدری افضل حق کی کتاب سے اقتباس)

.....

لوڈشیڈنگ، یہ کیا ہوتی ہے

کیمرے کی آنکھ آپ کو دیکھ رہی ہے۔ ایوان صدر، وزیراعظم ہاؤس، سفارت خانوں کے دفاتر و رہائش گاہوں، ائیرپورٹ، ریلوے سٹیشن، بڑے بڑے شاپنگ پلازوں، چاندنی چوک، ترکمان گیٹ، جج منزل، میوزیم، دیگر تاریخی مقامات اور وفاقی وزراء کی رہائش گاہوں پر کیمرے کی حکمرانی ہے۔ لوگوں کے دلوں میں کیمرے کا اتنا خوف ہے کہ شہر کی اہم اور غیر اہم سڑکوں پر پولیس کی عدم موجودگی کے باوجود ٹریفک کا نظم و ضبط اور روانی، قطار میں لگ کر بسوں میں سفر کرنا اور سینما کا ٹکٹ لینا، قانون کی "رٹ" کو آئی ٹی کے ذریعے، جس طرح بھارت میں تسلیم کیا گیا ہے، وہ بلاشبہ بھارتی حکومت کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ بھارت کے دارالخلافہ دہلی میں 11 تا 16 اپریل 2012ء تک ٹریڈ ڈویلپمنٹ اتھارٹی پاکستان کے زیراہتمام سنگل کنٹری نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر پاکستان سے ملک کی تاریخ کا سب سے بڑا تجارتی وفد بھی دہلی گیا۔ جس میں کراچی، لاہور اور اسلام آباد کے تاجروں کی بڑی تعداد شامل تھی۔

دہلی میں قیام کے دوران ٹیکسی ڈرائیور راجن کمار سے ایک مسلمان تاجر شیر محمد نے سوال کیا کہ آپ کے شہر میں بجلی کی لوڈشیڈنگ ہوتی ہے تو اس کا جواب تھا کہ "یہ کیا ہوتی ہے؟" اس کے بعد اس کا دوسرا سوال تھا کہ کیا دو روز سی این جی کی تعطیل ہوتی ہے؟ اس پر اس کا جواب مشترک تھا کہ یہاں ایسا کچھ نہیں ہوتا، نہ بجلی جاتی ہے اور نہ ہی گیس۔ شہر

میں امن وامان کی اتنی بہترین صورتحال ہے کہ بیان کرنا ضروری ہے اور اس لئے بھی کہ کراچی جیسے شہر کے رہائشی کے طور پر جہاں ہر وقت موت کے سائے ہوں اور ٹارگٹ کلنگ نے زندگی کو مفلوج کر دیا ہو، اس پس منظر میں دہلی گیٹ پر موجود عام لوگوں سے کی جانے والی بات چیت سے دل خوش ہو گیا۔ جب ان سے سوال کیا گیا کہ کیا یہاں پر موبائل فون چھیننے کا خطرہ نہیں؟ گن پوائنٹ پر گاڑی چھینی جاتی ہے؟ تو ان کا جواب تھا کہ دہلی ''کرائم فری'' شہر ہے۔ یہاں آپ اطمینان سے گاڑی چلائیں۔ جب دل چاہے آئیں اور جب دل چاہے جائیں، کوئی خوف نہیں۔ دہلی میں قیام کے دوران بہت سے شعبوں کے لوگوں سے بات چیت کی۔ دہلی کے ایک صنعت کار دیپک کمار جو ایل پی جی اور سی این جی کی کٹ بنانے کا کاروبار کرتے ہیں، نے بات کرتے ہوئے کہا کہ ہندو کو دو چیزیں چاہئیں۔ ایک امن اور دوسرا کاروبار۔ یہ دونوں چیزیں حکومت نے فراہم کی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بھارت میں سرمایہ کاری کرنے میں کوئی خوف نہیں ہے۔ پوری دنیا سے کاروبار کر سکتے ہیں لیکن جو حکومتی قوانین ہیں ان پر سختی سے عملدرآمد کیا جاتا ہے۔ خاص طور پر ٹیکس کی ادائیگی ضروری ہے۔ حکومت ٹیکس وصولی پر بہت زور دیتی ہے اور نادہندہ بڑے بڑے لوگ بھی گرفتار ہو جاتے ہیں۔

یہاں پر لگنے والے مینا بازار کے تحت پاک بھارت تجارت کے فروغ کے ساتھ دونوں ممالک کے لوگ قریب آئیں گے اور تلخیاں دُور ہوں گی۔ جب ایک دوسرے کے حوالے سے گمراہ کن سوچ ختم ہو گی تو دونوں ممالک کی حکومتیں سازگار ماحول کے لئے عام لوگوں کو بھی آسانی سے ویزے فراہم کرے گی اور ویزا شرائط میں نرمی برتی جائے گی۔

(''امن کی آشا''، رفیق بشیر کا کالم
جنگ ڈاٹ کام 6 مئی 2012ء سے اقتباس)

.....

محو حیرت ہوں

علامہ اقبال نے پچھلی صدی میں کہا تھا۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

غالباً ان کا اشارہ اس صدی کی طرف بھی تھا جس سے دنیا اب گزر رہی ہے۔ رواں صدی میں جو کچھ ہو رہا ہے بہت تیزی سے ہو رہا ہے۔ اتنی تیزی سے کہ اگلے پل کیا ہو جائے! یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ ایک عمارت وجود میں آتی ہے ''دنیا کی بلند ترین عمارت کہلاتی ہے'' مگر اگلے چند ہی سال میں اس سے یہ اعزاز چھن جاتا ہے۔

آج دبئی کا ''برج خلیفہ'' دنیا کے سب سے اونچے ٹاور کا اعزاز رکھتا ہے مگر صرف آٹھ سال بعد ایک نہیں ایسی بیس عمارتیں وجود میں آ جائیں گی جو باری باری ایک دوسرے سے بلند ترین عمارت کا تاج چھینتی چلی جائیں گی۔

دبئی سے شائع ہونے والے موقر تجارتی جریدے ''عربین بزنس'' کی ایک تحقیقی رپورٹ کے مطابق 2020ء تک دنیا میں آسمان سے باتیں کرتی 20 بلند ترین عمارتیں وجود میں آ چکی ہوں گی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان 20 عمارات میں سے 11 عمارات صرف ایک ملک چین کی ملکیت ہوں گی یعنی دنیا کی تمام بلند ترین عمارات میں نصف سے بھی زائد عمارات چینی سرزمین کا حصہ ہوں گی جبکہ شمالی امریکہ اور خلیجی ممالک کے حصے میں صرف دو دو جبکہ یورپ کے حصے میں ایک بھی عمارت نہیں آئے گی۔

(وائس آف امریکہ ڈاٹ کام سے ماخوذ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

.....

کبھی کبھار للچاتی ہوئی نظروں سے چمچماتی گاڑیوں میں اپنے ہم عمروں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر معاشرتی انصاف کو کوستے ہیں کہ پیدا تو ہم ایک جیسے ہوئے تھے مگر معاشرتی تفریق نے ہمیں کہاں لا کھڑا کیا؟ کسی کو دولت خرچ کرنے کی فکر اور کوئی پائی پائی کو ترس رہا ہے۔

.....

نوجوان نسل جس کو کھیل کے گراؤنڈ میں ہونا چاہیے، بلیئرڈ کلبوں، جوئے کے اڈوں، فلموں، ویڈیو گیموں اور موبائل فون پر مصروف نظر آتی ہے۔

.....

کیا آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان میں لوگ موبائل فون کے غیر ضروری استعمال کی مد میں کروڑوں روپے خرچ کر دیتے ہیں!

.....

ہر بندہ.....

☆نہ سرکاری سکول میں پڑھنا چاہتا ہے۔
☆نہ سرکاری ہسپتال میں جانا چاہتا ہے۔
☆نہ سرکاری بس میں سفر کرنا چاہتا ہے۔
☆تو پھر سرکاری ملازمت کیوں چاہتا ہے؟

.....

عمر کے اعتبار سے بڑا ہو جانے پر تو کسی کا کوئی اختیار نہیں لیکن بڑا بن کر دکھانا آسان نہیں ہوتا۔

(فیس بک ڈاٹ کام سے میری پسند)

.....

بینظیر بھٹو کی کتاب
مفاہمت سے اقتباس

تقسیم نے پاکستان کو معاشی طور پر غیر محفوظ بنا دیا۔ مشرقی پاکستان میں واحد بڑی صنعت پٹ سن کی کاشت تھی۔ مشرقی پاکستان میں پٹ سن کی ایک بھی مل موجود نہ تھی۔ برطانوی دور میں سب ملیں کلکتہ میں تعمیر کی گئی تھیں۔ ایک دوسرے کی مخالفت پر کمربستہ دونوں ممالک میں معاشی تعلقات کی عدم موجودگی میں پاکستان کی پٹ سن کی صنعت کے لئے اپنی پیداوار کو پروسیسنگ کے عمل سے گزارنا ممکن نہ رہا اور مغربی پاکستان میں، کپاس کی کاشتکاری کے حوالے سے ایک ایسا ہی بحران پیدا ہو گیا۔ برصغیر کی 394 کاٹن ملوں میں سے صرف 14 پاکستانی علاقے میں واقع تھیں۔ تقسیم کے وقت برصغیر کی صف اول کی 57 کمپنیوں میں سے صرف ایک کا مالک مسلمان تھا اور اگرچہ برصغیر کی زمین کا چوتھائی حصہ پاکستان کو ملا مگر صنعتی علاقے کے نام پر انہیں صرف دسویں حصے کا حقدار ہی سمجھا گیا تھا۔ تقسیم سے پہلے کے انڈیا کے محصولات کا صرف سترہ فیصد پاکستان کے حصے میں آیا۔ بین الاقوامی سطح پر مسابقت کرنے اور اپنے نوزائیدہ جمہوری اداروں کو پروان چڑھانے کے لئے بھارت کی پوزیشن بہت مضبوط تھی۔

سیاسی مشکلات نے منتقلی کے عمل کو پاکستان کے لئے اور بھی زیادہ دشوار بنا دیا۔ مسلم لیگ کی زیادہ تر سیاسی قیادت کا تعلق موجودہ پاکستان کے اکثریتی علاقوں کی بجائے بھارت کے اقلیتی علاقوں سے تھا۔

ان سب پر مستزاد یہ کہ پاکستان جغرافیائی تقسیم کا شکار تھا کیونکہ اسے ارضی طور پر دو الگ الگ خطوں کی صورت میں تشکیل دیا گیا تھا: مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) اور مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) ان دونوں خطوں کے بیچ دشمن بھارت کی زمین کا ایک ہزار میل طویل ٹکڑا حائل تھا اور ان کی اپنی آبادیاں نسلی اعتبار سے مختلف و متنوع گروہوں پر مشتمل تھیں۔

آج بہت سے لوگ پاکستان اور بھارت کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

درمیان پائے جانے والے معاشی اور جمہوری فرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ دونوں ممالک ایک ہی برطانوی نوآبادیاتی تجربے کا حصہ تھے جنہیں آزادی کی ایک ہی جیسی ابتداء اور حالات میسر آئے، اس لئے پاکستان کی جمہوری ناکامی کا سبب دونوں کے درمیان پایا جانے والا واحد اہم فرق ہی ہوسکتا ہے: مذہب۔ میرے نزدیک یہ سوچ سادہ لوحی پر مبنی اور ناقص ہے۔

پاکستان کو سب سے بڑا دھچکا دہری شکل میں پہنچا۔ پہلے بانی پاکستان آزادی کے ایک سال بعد ہی وفات پا گئے اور ملک میں کوئی ایسا لیڈر باقی نہ رہا جسے جمہوری روایات کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کرنے کا اخلاقی اختیار حاصل ہو۔ دوسرے یہ کہ صوبائی خودمختاری کے اصول کے تحت انڈین نیشنل کانگریس نے بھارت کے کئی صوبوں کی سربراہی کی تھی اور ان کے پاس ایک منظم بنیاد موجود تھی۔ پاکستان کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔

دیگر کلیدی شعبوں میں بھی پاکستان کو دقتوں کا سامنا رہا جن کی بدولت جمہوریت ایک ادارے کے طور پر پروان نہ چڑھ سکی۔ اولاً 1948ء کی جنگ جس کی وجہ سے پاکستان خود کو بھارتی خطرے کے سامنے غیرمحفوظ تصور کرنے لگا اس کے نتیجے میں بجٹ کا زیادہ تر حصہ بھارت کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے دفاعی ضروریات پر خرچ کیا جانے لگا۔ بھارت کی فوج کو یقیناً ایک کہیں زیادہ بڑی آبادی اور معیشت کی اعانت حاصل تھی۔ 1947ء اور 1950ء کے درمیان پاکستانی بجٹ کا تقریباً 70فیصد حصہ دفاع پر ہی خرچ ہوتا رہا جیسا کہ پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خاں نے کہا ''ملکی دفاع ہماری اولین ترجیح ہے..... اور دیگر تمام کارہائے حکومت پر بھاری۔ ہم اپنے ملک کا دفاع کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔'' یہاں سے اس عمل کا آغاز ہوا جس کے نتیجے میں پاکستانی معاشرے میں فوج کو لامحدود رسوخ اور مرتبہ حاصل ہو گیا اور اس کے ساتھ ساتھ معاشی اور معاشرتی ترقی کے لئے مختص رقم میں کمی ہوگئی۔ اس کا سیاسی اثر چونکا دینے والا تھا۔ جمہوری اداروں اور بنیادی ڈھانچے کو تقویت دینے کی بجائے، غیرمنتخب ادارے مثلاً فوج اور انٹیلی جنس ادارے اولین ترجیح بن گئے۔ نئے پاکستان میں انہیں مرکزی اداروں کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

دونوں ممالک کی جمہوری پرواخت میں دوسرا اہم فرق ان کی مرکزی سیاسی شخصیات کی طوالت عمر کے حوالے سے تھا۔ بھارت کو اپنے بابائے آزادی وزیراعظم جواہر لال نہرو کی موجودگی کا یہ فائدہ ہوا کہ انہیں ایک حقیقی روبہ عمل جمہوریت قائم کرنے کا موقع مل گیا۔ پاکستان کی زندگی کے پہلے ہی سال میں پاکستان کے بانی قائداعظم محمد علی جناح کی ستمبر 1948ء میں، ان کا کام مکمل ہونے سے کہیں پہلے بلکہ اس کے آغاز میں ہی وفات ہو گئی۔ عوامی مینڈیٹ کی حامل مضبوط قیادت کسی بھی ریاست کے لئے اور خصوصاً ایک نئی ریاست کے لئے نہایت اہم ہوتی ہے۔ پاکستان کے مضبوط، سحر انگیز قائد جو پاکستانی قوم پرستی اور پاکستانی جمہوری پرواخت کے لئے شیرازے کی حیثیت رکھتے تھے، ملک کی آزادی کے ایک سال بعد ہی وفات پا گئے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اگر قائداعظم کو ایک عشرے تک زندہ رہنے، پاکستان کے جمہوری لیڈروں کی ایک جانشیں نسل کو تربیت دینے اور فوج اور انٹیلی جنس اداروں کو سیاسی اداروں کی حیثیت اختیار کرنے سے روکنے کا موقع مل جاتا تو پاکستان کی تاریخ مختلف ہوتی۔ کوئی نہیں

جانتا کہ بابائے پاکستان کی طرف سے ایک عشرے کی مضبوط جمہوری قیادت مذہبی انتہاپسندی کو روکنے کے لئے کیا معنی رکھتی، جس کا انہوں نے مقابلہ کیا مگر جو پاکستان کی تاریخ کے بعد کے ساٹھ سال میں بار بار سر اٹھاتی رہی۔ کوئی نہیں جان سکتا لیکن اگر محمد علی جناح زندہ رہتے تو یقیناً پاکستان آج ایک مختلف جگہ ہوتا اور اگر وہ آج زندہ ہوتے تو یقیناً اپنے بنائے ہوئے سیاسی نظام کا آمروں اور جابروں کے ہاتھوں بگاڑ ان کے لئے نہایت صدمے کا باعث ہوتا۔

بہرصورت بھارت کو پاکستان کے مقابلے میں یقیناً زیادہ جمہوری آغاز میسر آیا جس سے ان کی جمہوریت کو جڑ پکڑنے کا موقع مل گیا۔ بھارت نے 1949ء میں آئین منظور کیا اور دو سال بعد اپنے پہلے قومی انتخابات منعقد کرائے۔ پاکستان نے اپنا آئین آزادی کے ایک پورے عشرے کے بعد منظور کیا اور صرف دو سال بعد ایک فوجی بغاوت نے پاکستان کو آئینی اعتبار سے ایک بار پھر نکتہ آغاز پر پہنچا دیا۔ انتخابی حوالے سے تقابل اور بھی زیادہ غیرمساوی تھا جبکہ بھارت نے 1949ء میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات منعقد کرا لئے۔ پاکستان میں شفاف اور آزاد انتخابات کا انعقاد 1970ء سے پہلے نہ ہو سکا یعنی بھارت سے ایک نسل کے فاصلے پر۔

حالات کا بدبختانہ امتزاج پاکستان میں جمہوری حکومت اور جمہوری پرداخت کی راہ میں حائل رہا۔ اسلام اس کی وجہ نہ تھا اگرچہ مطلق العنان حکمرانوں کے ایک سلسلے کی طرف سے اسلام کو سیاسی رنگ دینے اور توڑنے مروڑنے کے عمل نے یقیناً ملک میں آمریت کے بار بار ابھرنے والے بحرانوں کو تقویت دی۔

.....

سقراط

سقراط کے مقدمے کے چنیدہ حقائق تو شک و شبہ سے بالا ہیں۔ استغاثہ کے الزام کی بنیاد یہ تھی کہ سقراط ایک بدکار اور عجیب و غریب شخص ہے جو زیرزمین اور آسمان سے بالا اشیاء کی تلاش میں رہتا ہے۔ برائی کو اچھائی بنا پیش کرتا ہے اور ایسا کرنا دوسروں کو بھی سکھاتا ہے۔ اس کی مخالفت کی بنیاد بہت یقینی طور پر یہ تھی کہ اس کا تعلق امراء کے طبقے سے فرض کر لیا گیا تھا۔ اس کے زیادہ تر شاگرد اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے بعض برسراقتدار بھی تھے جنہوں نے خود کو بہت ہی زیادہ کارآمد ثابت کیا تھا لیکن عفو جرم کے باعث یہ بنیاد ظاہر نہ کی جا سکی۔ اکثریت کے ہاتھوں وہ مجرم قرار پایا۔ ایتھنز کے قانون کے مطابق اب اسے یہ اجازت تھی کہ وہ اپنے لئے موت سے کم تر کوئی سزا تجویز کرتا۔ مصففین نے اگر اسے مجرم سمجھا تھا تو یہ انہوں نے فیصلہ کرنا تھا کہ وہ استغاثہ کی مانگی ہوئی یا مدعا علیہ کی تجویز کردہ سزا کو منتخب کریں۔ اس لئے سقراط کا فائدہ اسی میں تھا کہ وہ کوئی بھاری سزا تجویز کرتا جسے عدالت نے کافی سمجھ کر قبول کر لیا ہوتا تاہم اس نے تیس سکے (minac) جرمانہ تجویز کیا جس کے لئے اس کے دوستوں میں بعض (بشمول افلاطون) اس کی ضمانت دینے کے لئے تیار تھے۔ یہ سزا اتنی کم تھی کہ عدالت ناراض ہوئی اور اس نے اسے مجرم قرار دینے والی اکثریت سے بھی زیادہ اکثریت کے ساتھ موت کی سزا سنا دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس فیصلے کو وہ پہلے ہی جانتا تھا۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ اس کی یہ خواہش نہیں تھی کہ وہ کسی ایسی رعایت کے بدلے سزائے موت سے بچتا جس سے اس کے اقبال جرم کا اظہار ہوتا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

استغاثہ میں تین اشخاص شامل تھے۔ انتیس (Anytus) ایک جمہویت پسند سیاستدان تھا۔ ملیتس (Meletus) ایک حزنیہ نگار شاعر، جو غیر معروف نوجوان لمبے سوکھے بال، کھردری ڈاڑھی اور طوطے کی سی ناک والا تھا اور لائی کن (Lykon) ایک گمنام خطیب تھا۔ انہوں نے یہ الزام لگایا کہ سقراط ان دیوتاؤں کو نہیں پوجتا جنہیں ریاست پوجتی ہے بلکہ اس نے نئے دیوتاؤں کو متعارف کرایا ہے اور مزید یہ کہ نوجوانوں کو گمراہ کرنے اور انہیں ایسی ہی مخرب اخلاق تعلیم دینے کا مجرم ہے۔

اس لایخل سوال میں مزید الجھے بغیر کہ افلاطون کے سقراط اور تاریخی سقراط میں کیا تعلق ہے، آیئے ہم دیکھتے ہیں کہ افلاطون ان الزامات کے جواب میں سقراط سے کیا کہلواتا ہے۔

سقراط ابتداء میں استغاثہ پر جوش خطابت کا الزام لگاتا ہے اور خود پر لگے ہوئے خطیبانہ الزام کی تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ جس فصاحت کا اہل ہے وہ سچائی سے متعلق ہے۔ اگر معمول کے مطابق اپنے ہی طرز انداز میں جواب دے تو انہیں ہرگز ناراض نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ''وہ ایک مرصع و مسجع الفاظ و تراکیب سے مزین نہیں'' وہ ستر سال سے زیادہ کا ہو چکا ہے اور ابھی تک کسی قانونی عدالت میں حاضر نہیں ہوا ہے اس لئے اس کے غیر عدالتی انداز کو معاف کر دیا جائے۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ مجھ پر رسمی طور پر الزام لگائے جانے کے علاوہ بھی ایک اکثریت غیر رسمی طور پر مجھ پر الزام لگاتی ہے۔ یہ اکثریت اس وقت مجھے موردالزام ٹھہرا رہی ہے۔ جب مصنفین بچے تھے۔ وہ یہ کہتے رہے ہیں کہ ''سقراط نامی ایک شخص جو دانا ہے، زمین و آسمان کے متعلق عجیب و غریب باتیں کرتا ہے اور برائی کو اچھائی بنا کر پیش کرتا ہے'' وہ کہتا ہے کہ یوں لگتا ہے کہ ایسے لوگ دیوتاؤں کے وجود پر یقین نہیں رکھتے۔ رسمی فرد جرم کی نسبت رائے عامہ کا پرانا الزام زیادہ خطرناک ہے۔ یہ اس لئے بھی زیادہ خطرناک ہے کیونکہ عام آدمی یہ نہیں جانتا، ارسٹوفینیز کے سوا، یہ الزام کس کی طرف عائد ہوا ہے۔ دشمنی کی پرانی وجوہات کا جواب دیتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ میں سائنسدان نہیں ہوں اور ''طبیعیات سے متعلق قیاس آرائیوں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے''..... میں پیشہ ور معلم بھی نہیں ہوں اور نہ ہی علم سکھانے کا معاوضہ لیتا ہوں۔ وہ سوفسطائیوں کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے اہل علم ہونے کے دعوے کی تردید کرتا ہے تو پھر ''کیا وجہ ہے کہ مجھے دانا کہا جاتا ہے اور میری اتنی بری شہرت ہے؟''

یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ ڈیلفی کے دارالاستخارہ سے پوچھا گیا کہ سقراط سے زیادہ دانا کوئی اور شخص بھی ہے؟ تو جواب یہ ملا کہ نہیں ہے۔ سقراط یہ تسلیم کرتا ہے کہ اس جواب سے وہ مکمل طور پر تذبذب میں پڑ گیا کیونکہ وہ کچھ بھی نہیں جانتا ہے اور دیوی بھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔ اس لئے وہ مشہور و معروف دانا لوگوں سے جا کر ملنے لگا تاکہ معلوم کر سکے کہ کیا دیوی کا کہا غلط ثابت کیا جا سکتا ہے۔ پہلے وہ ایک سیاستدان کے پاس گیا جسے ''اکثر لوگ دانا سمجھتے تھے اور وہ خود کو بھی بہت ہی دانا خیال کرتا تھا۔'' اسے جلدی معلوم ہو گیا کہ وہ دانا نہیں تھا اور اس نے اس کی نادانی کی نرمی مگر تاکید کے ساتھ وضاحت کر دی اور ''نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگا۔'' پھر وہ شاعروں کے پاس گیا اور ان سے ان ہی کی تحریروں کے اقتباسات کے معانی پوچھے لیکن وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے۔ ''تب

مجھے معلوم ہوا کہ وہ شاعری شعوری طور پر نہیں کرتے بلکہ از خود رفتگی کی کیفیت میں لکھتے ہیں۔'' پھر وہ صنعتکاروں کے پاس گیا اور ان سے بھی اسے بہت مایوسی ہوئی۔ وہ کہتا ہے کہ ایسے عمل سے اس نے بہت لوگ اپنے خطرناک دشمن بنا لئے۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ''صرف خدا دانا ہے۔ اس جواب سے مراد یہ ظاہر کرنا ہے کہ انسانوں میں دانائی کچھ بھی نہیں ہوتی یا اگر ہوتی بھی ہے تو بہت کم اور ناقص ہوتی ہے۔ وہ سقراط کا ذکر نہیں کرتا وہ میرا نام تو صرف ایک مثال کے طور پر استعمال کرتا ہے گویا اس نے یہ کہا کہ اے لوگو وہ دانا ترین شخص ہے جو سقراط کی طرح یہ جانتا ہے کہ اس کی دانائی حقیقت میں کچھ بھی نہیں ہے۔'' وہ اپنا تمام وقت اس مصروفیت میں گزارتا ہے کہ دانائی کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں کا راز فاش کر دے۔ اپنی اسی مصروفیت کے باعث وہ انتہائی غربت کا شکار ہے لیکن وہ یہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ دارالاستخارہ کی بات صحیح ثابت کرے۔

وہ کہتا ہے کہ چونکہ امیر طبقوں کے نوجوانوں کے پاس کرنے کو کوئی کام نہیں ہوتا وہ لوگوں کے راز فاش ہوتے سننا پسند کرتے ہیں اور خود بھی ایسا ہی کرنے لگتے ہیں اور یوں اس کے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے ''کیونکہ لوگ اس بات کا اعتراف کرنا پسند نہیں کرتے کہ ان کے علم کے جھوٹے دعوے کا پول کھل گیا ہے۔''

(برٹینڈ رسل کی کتاب ''فلسفہ مغرب کی تاریخ'' مترجم پروفیسر محمد بشیر سے اقتباس)

.....

خواب ادھورے رہ گئے

وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کے خواب ادھورے رہ گئے۔ وہ سپریم کورٹ سے سزا پا کر سیاسی شہید بننا چاہتے تھے۔ انہیں توہین عدالت کے الزام میں سزا تو ملی لیکن وہ سیاسی شہید نہ بن سکے۔ انہیں توقع تھی کہ سپریم کورٹ انہیں توہین عدالت کے الزام میں چھ ماہ نہیں تو چھ ہفتے یا کم از کم چھ دن قید کی سزا ضرور سنائے گی اور سزا سناتے ہی ان کی گرفتاری کا حکم بھی صادر کرے گی۔ گیلانی صاحب جیل جانے کے لئے تیار ہو کر آئے تھے۔ ان کے ضروری کپڑے اور ادویات ایک بیگ میں ڈال دیئے گئے تھے تاکہ وہ یہی بیگ اٹھا کر جیل روانہ ہو جائیں۔

گیلانی صاحب جیل جانے والے پہلے وزیراعظم بننا چاہتے تھے لیکن جب عدالت نے فیصلہ سنایا تو وہ دنگ رہ گئے۔ عدالت نے یوسف رضا گیلانی کو تاریخ کا حصہ بنانے کی بجائے اپنے فیصلے کو تاریخ بنا دیا۔ مختصر فیصلے میں کہا گیا کہ عدالت کے برخواست ہونے تک آپ کی سزا جاری رہے گی۔ 30 سیکنڈ میں عدالت برخواست ہو گئی اور پاکستان کی تاریخ کا پہلا متفقہ وزیراعظم پاکستان کا پہلا سزا یافتہ وزیراعظم بن چکا تھا۔

(حامد میر کا کالم جنگ ڈاٹ کام سے اقتباس)

.....

انسان انسان کی حیثیت سے جی سکیں

دانشور ایرک فرام نے اپنی کتاب ''نیا انسان اور نیا سماج'' میں انسان کو بطور سماجی شے کے روحانی اور اخلاقی ضروریات کو اپنی بحث کا موضوع بنایا ہے۔ موجودہ دور میں انسان نے سائنسی اور عقلی ذرائع کو اپنے تابع کر لیا ہے لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم مفید، بامعنی اور تخلیقی ہم آہنگی کے ماحول کی تلاش کو جاری رکھیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ترقی اور سائنسی فتوحات کے باوجود ہم انسانیت کی معراج حاصل نہیں کر سکے اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک ایسا سماج تشکیل دینے سے بھی قاصر رہے ہیں جس میں انسان انسان کی حیثیت سے جی سکیں۔

.....

ایک نامی گرامی دانشور

جاپان میں ایک یونیورسٹی کے پروفیسر ایک نامی گرامی دانشور کے پاس گئے اور کہا کہ میں آپ کی تعلیمات سے فیض یاب ہونا چاہتا ہوں۔ اس وقت وہاں چند اور صاحبان علم بھی موجود تھے اور چائے کا دور چل رہا تھا۔ دانشور نے پروفیسر صاحب کی پیالی میں چائے انڈیلی..... اور انڈیلتے ہی چلے گئے۔ پروفیسر پہلے تو خاموش رہے لیکن آخر چیخ اٹھے ''جناب! پیالی بھر چکی ہے اور چائے باہر گر رہی ہے۔'' دانشور نے اطمینان سے چائے دانی رکھتے ہوئے کہا ''بالکل اس پیالی کی طرح آپ بھی علم و فضل سے بھرے ہوئے ہیں۔ میں اپنے نظریات کس طرح پہنچاؤں گا جب تک آپ اپنی پیالی کو خالی نہیں کر لیتے۔''

عربی کہاوت کے مطابق علمیت کے اعتبار سے انسانوں کی چار قسمیں ہیں۔

☆ایک وہ جو کچھ نہیں جانتا اور نہیں جانتا کہ وہ کچھ نہیں جانتا یہ شخص بیوقوف ہے اس سے بچو۔

☆ایک وہ جو کچھ نہیں جانتا اور جانتا ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ یہ شخص سیدھا سادھا ہے اسے سکھاؤ۔

☆ایک وہ جو جانتا ہے اور نہیں جانتا کہ وہ جانتا ہے۔ یہ شخص سویا ہوا ہے اسے جگاؤ۔

☆ایک وہ جو جانتا ہے اور جانتا ہے کہ وہ جانتا ہے۔ یہ شخص عقل مند ہے اس کی پیروی کرو۔

ہمارے ہاں پانچویں قسم کے لوگ بھی بکثرت پائے جاتے ہیں یعنی وہ جو کچھ نہیں جانتے اور یہ جانتے ہیں کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ ذہنی معذور ہیں اور دعائے خیر کے مستحق ہیں۔

گفتار کے یہ غازی اپنی سماعت کو بہت کم زیر بار کرتے ہیں۔ ٹی وی کے مذاکروں میں آپ نے بار بار دیکھا ہوگا کہ میزبان جس کا کام محض موضوع اور مقررین کا تعارف کرانا ہوتا ہے، کیمرہ آن ہوتے ہی بولنا شروع کرتا ہے اور بولتا ہی چلا جاتا ہے۔ بیچارے مہمان ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار سکرین پر ان کی گردنیں ہلتی نظر آتی ہیں لیکن یہ دراصل پروڈیوسر کا کمال ہوتا ہے جو پروگرام شروع کرنے سے قبل مہمانوں کی گردنیں ہلا کر چند شارٹس بنا لیتا ہے اور درمیان میں انہیں چلاتا رہتا ہے۔ پھر جب کسی ترسے پھڑ کے مقرر کی باری آتی ہے تو وہ اپنے انتظار کا خراج دوسرے شرکاء سے وصول کرتا ہے جو بالآخر بات کاٹنے لگتے ہیں۔ اس طرح بات کٹتے کٹتے تمام وقت کٹ جاتا ہے اور ناظرین کو چند گھسے پٹے چہروں کے جبری دیدار کے سوا کچھ نہیں حاصل ہوتا۔

ریڈیو کے ایک مذاکرے میں جب میزبان ایک معروف شاعرہ کی بات بار بار کاٹنے لگے تو خاتون نے جھنجھلا کر کہا ''بھئی! آپ نے ہمیں یہاں بلایا ہے تو بولنے کا موقع بھی دیں۔'' تب کہیں جا کر میزبان کو خیال آیا کہ مہمان کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔

(''حواس خمسہ'' ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی کی کتاب سے اقتباس)

.....

ایک دانا نے کہا تھا

اپنی غلطی کو تسلیم کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اگرچہ یہ تحصیل علم کی پہلی سیڑھی ہے۔ علم کی تعریف یہ ہے کہ یہ آپ کو آپ کے جہل سے آگاہ کرتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک دانا نے کہا تھا کہ ہم ہر چیز کے ایک فیصد کے دس لاکھویں حصے کا بھی علم نہیں رکھتے۔ لاعلمی نہیں بلکہ اپنی لاعلمی سے لاعلمی اور ناقص علم پر اصرار، علم کی موت ہے۔

قدیم چین میں ایک فلسفی شاہی دربار سے وابستگی کے باعث بہت قدر و منزلت سے دیکھا جاتا تھا تاہم بے پناہ علم رکھنے کے باوجود بسا اوقات اس سے کوئی سوال کیا جاتا تو وہ برملا کہہ دیتا ''معذرت خواہ ہوں، مجھے نہیں معلوم۔'' ایک دن اس کے جواب پر ایک رئیس زادے نے یہ چوٹ کی ''حضرت آپ کو دربار سے جو وظیفہ اور دیگر مراعات ملتی ہیں وہ آپ کے علم کے بدلے میں ملتی ہیں یا ناعلمی کے عوض؟'' فلسفی نے فراخ دلی سے اعتراف کیا ''اگر بادشاہ مجھے لاعلمی کا معاوضہ دینے لگے تو اس کی پوری سلطنت اس کے لئے ناکافی ثابت ہو۔'' اس لئے ارسطو کہا کرتا تھا ''میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔''

یہ ان لوگوں کا شیوہ ہے جو وسیع علم کے ساتھ ساتھ وسیع ظرف بھی رکھتے ہیں۔ ایک عظیم مفکر کا یہ بصیرت افروز مشورہ دیکھئے ''کبھی اس سے زیادہ عالم نظر نہ آؤ جتنے تم درحقیقت ہو۔ اپنے علم کو جیبی گھڑی کی طرح استعمال کرو (جو پوشیدہ رہتی ہے) اسے بلاوجہ نکال نکال کر لوگوں کو نہ دکھاؤ بلکہ کوئی وقت پوچھے تو بتا دو۔'' ہم نے اپنے یہاں ایسے دانش زدگان دیکھے ہیں جن سے اپنا اتھلا علم سنبھالے نہیں سنبھلتا اور نظام تعلیم کی برکت سے ایسوں سے بھی سابقہ پڑا ہے جو بڑی بڑی ڈگریاں رکھنے کے باوجود چٹے جاہل ہیں۔

(ایضاً)

.....

آپ کیا چاہتے ہیں

چند روز قبل کی بات ہے۔ ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ ان کے ایک پڑوسی شام ان کے گھر آئے اور ایک عجیب و غریب مطالبہ کیا۔ کہنے لگے ''مجھے دو ہفتے کے لئے آپ کا ٹرانزسٹر ریڈیو چاہیے۔'' ہمارے دوست حیران رہ گئے۔ آج تک تو پڑوسی نمک، چینی، مسالے اور ان چیزوں سے آگے بڑھ کر استری پھر اس سے بھی آگے کبھی کبھار زیورات مانگنے آتے تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ زیورات تو دل پر پتھر رکھ کر دے دیئے جاتے ہیں جبکہ نمک دینے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ہمارے خیال میں زیورات مانگنے سے احتراز کرنا چاہیے..... اس لئے کہ ہمسائے سے مانگے ہوئے زیورات بقول شاعر۔

اک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کھو جانے کا

تاہم ٹرانزسٹر ریڈیو مانگنے کا یہ پہلا کیس تھا اور وہ بھی پورے ایک ہفتے کے لئے۔ ہمارے دوست نے حق ہمسائیگی نبھاتے ہوئے ان سے کہا ''جناب شوق سے لے جایئے میں اس میں نئے سیل ڈلوا دیتا ہوں۔'' پڑوسی بولے ''اس کی کوئی ضرورت نہیں مجھے ریڈیو بجانا تھوڑی ہے، آپ چاہیں تو اس کے والو اور دیگر لوازمات بھی نکال لیں۔''

یہ جواب سن کر ہمارے دوست ہکا بکا رہ گئے۔ انہوں نے پڑوسی سے پوچھا ''پھر آپ خالی کھوکھے کا کیا کریں گے؟'' موصوف نے جواب دیا ''میں اسے لے کر احتیاط سے اپنی سٹڈی کی الماری میں لاک کر دوں گا اور اتنی ہی حفاظت سے دو ہفتے بعد آپ کو (as it is, where it is) کی بنیاد پر لوٹا دوں گا۔''

ہمارے دوست جو پہلے ہی حیران و پریشان تھے، کچھ نہ سمجھے۔ انہوں نے اپنے پڑوسی سے التجا کی ''خدا کے واسطے میری ذہانت کا امتحان نہ لیجئے۔ میں

ایک سیدھا سادھا آدمی ہوں مجھے صاف صاف بتا دیجئے آپ کیا چاہتے ہیں؟ ریڈیو کیا کریں گے؟''

پڑوسی نے کہا ''بھائی صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ میرے بیٹے کے فائنل ایئر کے امتحانات ہو رہے ہیں اور آپ کا بیٹا رات کو اپنی چھت پر فل آواز میں ریڈیو کھول کر فرمائشی پروگرام سنتا ہے۔ اس سے میرے بیٹے کی پڑھائی میں خلل واقع ہوتا ہے۔ وہ بہت ڈسٹرب ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے سوچا کہ آپ کا ریڈیو قرض لے کر اس مسئلے کو حل کر دوں۔''

ہمارے دوست نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے پڑوسی کا مسئلہ حل ہوا یا نہیں لیکن یہ بات طے ہے کہ اونچی آواز میں ریڈیو، ٹی وی اور ٹیپ ریکارڈر بجانا ہمارے قومی مزاج کا حصہ بن گیا ہے۔ ہمیں قطعی اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ پاس پڑوس میں کوئی بیمار بھی ہو سکتا ہے، کوئی طالبعلم امتحان کی تیاری میں مصروف ہو سکتا ہے اور یہ بھی نہیں تو ممکن ہے کوئی فرد خاموشی اور توجہ کے ساتھ کوئی اخبار، رسالہ یا کتاب پڑھنا چاہتا ہے۔

ان باتوں سے قطع نظر دن بھر کام کاج کے بعد ایک میٹھی اور پرسکون نیند ہر ایک کا حق ہے لیکن ہم اپنے شوق کی تسکین کی خاطر اس سے یہ حق بھی چھین لیتے ہیں۔ ہم جب بھی آزادی کی بات کرتے ہیں اس سے مراد اپنی ذاتی آزادی ہوتی ہے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ یہی آزادی دوسروں کے سکون کی بربادی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اس تلخ حقیقت کا ایک زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ بسا اوقات ایک ہی گھر میں رہنے والے افراد ایک دوسرے کے دکھ درد، مصروفیات اور آرام کا لحاظ کئے بغیر اپنے اپنے کمروں میں اونچی آواز سے ریڈیو، ٹی وی، وی سی آر وغیرہ چلاتے ہیں۔ یہ بے حسی کی انتہا ہے۔ ہم میانہ روی اختیار کر کے یعنی ان آلات کی اونچی آواز نیچی رکھ کر اپنے پسندیدہ پروگراموں سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور دوسروں کو بھی زحمت سے بچا سکتے ہیں۔

لیکن بات گھوم پھر کر وہیں آتی ہے کہ دوسروں کی ہر بات کا ہم ہی خیال کرنے لگے تو دوسرے خود کیا کریں گے؟ اب اس مسئلے کو لیجئے ہم اپنے ریڈیو، ٹی وی کی آواز کیوں گھٹائیں؟ دوسرے اپنے کان بند کر لیں تو اس طرح بھی مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اگر ہر بات کی فکر ہم ہی کرنے لگے تو لوگ طعنہ دیں گے۔

خنجر چلے کسی پر تڑپتے ہیں امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

.....

ضمیر

زندگی کا سب سے بڑا نقصان موت نہیں بلکہ سب سے بڑا نقصان زندہ انسان میں ضمیر کی موت کا واقع ہو جانا ہے۔ جب ضمیر ملامت کرنا بند کر دے تو سمجھ لو کہ انسانیت کا جنازہ اُٹھ گیا ہے جسے اپنا ضمیر بدی سے نہیں روکتا اسے کوئی نصیحت کرنے والا بھی نہیں روک سکتا۔ ہر شخص اپنے ضمیر کو جوابدہ ہے سوائے بے حس شخص کے۔

جو بے ضمیر ہوتے ہیں انہیں اس بات کا کچھ علم نہیں ہوتا کہ ضمیر کس کو کہتے ہیں۔

(عارف الرحمٰن)

.....

شتر مرغ کے جینز

تاریخ دم سادھے، ٹک ٹک دیکھ رہی ہے کہ اقتدار کی بدمستی میں اپنی اوقات بھول جانے اور رعونت کے کوہ ہمالیہ پر بیٹھ کر اپنے آپ کو ''خدا'' سمجھ بیٹھنے والوں پر جب آسمانوں کا قہر نازل ہوتا ہے تو ان کے لئے زمین کتنی تنگ ہو جاتی اور اپنا سایہ بھی کیونکر ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ تاریخ کے دامن میں ایسی کئی کہانیاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان کی کہانیاں جو اپنے آپ کو ناقابل تسخیر سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کی کہانیاں جو خلق خدا کو مکھیوں اور مچھروں سے حقیر تر خیال کرنے لگتے ہیں، ان کی کہانیاں جو سمجھنے لگتے ہیں کہ کائنات میں کوئی اور ان جیسا نہیں اور انہیں مسیحائی کا منصب دے کر آسمانوں سے اُتارا گیا ہے، ان کی کہانیاں جو عظمت کے خبط میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور جو اس گمان میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ وہ ہمیشہ اپنی تقدیر اپنے ہاتھوں سے لکھتے رہیں گے۔ آیئے چند ایک کردار دیکھیں:

عباسی خلیفہ معتصم باللہ نے اس وقت تک تاتاریوں کی یلغار کو تسلیم نہیں کیا جب تک ہلاکو خاں بغداد میں داخل نہیں ہوگیا۔ مغل تاجدار محمد شاہ اس وقت تک ہنوز دلی دوراست کہتا رہا۔ جب تک نادر شاہ درانی کے سپاہی گرد آلود جوتوں سمیت اس کے محل میں نہیں گھس گئے۔ بہادر شاہ ظفر تب تک خود کو شہنشاہ ہند سمجھتا رہا جب تک نکلسن نے اس کے بیٹوں کے کٹے ہوئے سر طشت میں رکھ کر پیش نہیں کر دیئے۔ ایوب خاں اور یحییٰ خاں کو آخری دن تک یہ گمان رہا کہ سات کروڑ بنگالی نہیں بلکہ مٹھی بھر شر پسند ہیں۔ ان سب کے باوجود پچھلے ایک ہزار برس میں معتصم باللہ سے صدر زرداری تک یہ بیان کبھی نہیں بدلا کہ حکومت اور اس کے ادارے ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح اہل اور چوکس ہیں۔ اب اس بات پر تحقیق ہونی چاہیے کہ حکمرانوں میں اس شتر مرغ کے جین کب داخل ہوئے جو ریت میں سر دبا کر سمجھتا ہے کہ خطرہ ٹل گیا۔

لوگوں کو یہ بھی کہتے سنا ہے کہ آنکھوں والو! آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔ اس لئے حکومت آنکھوں سے خوشحالی کی عینک اُتار کر بس اپنی آنکھوں سے غریبوں کی حالت زار دیکھے۔ غربت مٹائے، غریبوں کو نہ مٹائے۔ مہنگائی کے جن کو پکڑ کر اپنے آہنی صندوق میں بند کردے اور چھاپہ مار ٹیموں میں شامل لوگوں کی نظریں ٹیسٹ کروائے تاکہ انہیں مارکیٹ میں بڑھتے ہوئے نرخ اور ذخیرہ اندوزوں کے گودام نظر آجائیں۔

حیرت ہے کہ ہم لوگ زندہ کیسے ہیں اور اس روز افزوں مہنگائی میں اتنی قوت برداشت کہاں سے آئی جو سنتے ہیں صرف ولیوں کے پاس ہوتی ہے۔ پینسٹھ سال پہلے جس نے بھی کہا تھا سچ کہا تھا کہ پاکستان ایک ملک نہیں معجزہ ہے۔ اب تو ہم سے بعض سنجیدہ لوگ کہتے ہیں کہ نکلو پاکستان سے جہاں نہ سیکورٹی ہے نہ ڈھنگ کی تعلیم نہ بجلی ہے نہ پانی ہے نہ گیس۔ گٹر اُبل رہے ہیں، نہ کوئی گورننس نہ کوئی پرسان حال۔ ایسی افراتفری، عدم تحفظ، غیر منطقی مہنگائی، ہر دم عوام کے لئے بد سے بدتر اور حکمرانوں کے لئے بہتر سے بہتر۔ آخر کیوں؟

یہ عجیب بات ہے کہ آمر آجائے تو ہر چیز عوام کی دسترس میں ہوتی ہے لیکن منحوس جمہوریت آتے ہی ہر چیز غائب ہو جاتی ہے۔ اس بار کی جمہوریت دیکھ لیں۔ دونوں بڑی پارٹیوں کی حکومت ہے اور سال میں بارہ بجٹ آرہے ہیں بلکہ دن میں تین بار بجٹ آتا ہے کیونکہ دن میں تین تین بار اشیائے صرف کے نرخ بڑھتے ہیں۔ لوگ بھوکے مر رہے ہیں۔ حکمران بلٹ پروف گاڑیوں میں گھوم رہے ہیں۔ لوگوں کے لئے تن ڈھانپنا ممکن نہیں اور یہ مئی جون میں سوٹ چڑھائے پھرتے ہیں۔ بیوقوف عوام کس کو حکومت اور کس کو اپوزیشن سمجھے حالانکہ یہ سب نتھا سنگھ اور پریم سنگھ کی ملی بھگت ہے۔

(قلندر حسین سید کے کالم سے اقتباس،
نوائے وقت ملتان ڈاٹ کام سے)

اقوالِ حضرت علی رضی اللہ عنہ

☆ حق نہایت زبردست مددگار اور جھوٹ بہت ہی کمزور معاون ہے۔
☆ توفیق ایزدی عقل کی مدد اور معاون ہے اور خدائی توفیق کا نہ ہونا جہالت کا مددگار ہے۔
☆ عقل آفتوں کے بچاؤ کے لئے ایک حجاب ہے۔
☆ پرہیزگاری گناہوں سے بچنے کے لئے ایک ڈھال اور تقویٰ تمام نیکیوں کا سر ہے۔
☆ شک ایمان کو برباد کرتا اور حرص یقین کو بگاڑتی ہے۔
☆ شک جہالت کا ثمرہ ہے۔
☆ خود بینی عقل کو بگاڑتی ہے۔
☆ اخلاص دین کی غایت اور رضا بقضا یقین کا ثمرہ ہے۔
☆ پاکدامنی عقلمندوں کی خصلت اور زیادہ حرص گندے اور ناپاک لوگوں کی عادت ہے۔
☆ علم نہایت اعلیٰ درجے کی کامیابی اور اطاعت ہمیشہ باقی رہنے والی عزت ہے۔
☆ عقلمند وہ ہے جو اپنی امیدوں کو کم کرے اور شریف وہ ہے جس کی خصلتیں بزرگ اور اچھی ہوں۔
نفاق (یعنی زبان سے اقرار دل سے انکار) نہایت بری خصلت ہے۔
☆ خندہ پیشانی سے یار دوستوں کے ساتھ انس اور محبت پیدا ہوتی ہے۔
☆ نفاق شرک کا بھائی اور خیانت جھوٹ کی بہن ہے۔
☆ نفاق کفر کا ہمزاد بھائی اور دل میں کھوٹ رکھنا بڑا مکر ہے۔
☆ نفاق ایمان کو بگاڑتا اور جھوٹ انسان کو عیب لگاتا ہے۔
☆ نرمی بزرگی کا سرنامہ اور لوگوں کے ساتھ احسان اور نیکی کرنا فضیلت کا سر ہے۔
☆ حق نہایت روشن راستہ اور سچائی بہت اچھا راہنما ہے۔
☆ جھوٹ پستی اور ذلت کا موجب ہے۔
☆ منت رکھنا اور جتلانا نیکوئی کو برباد کر دیتا ہے۔
☆ زہد نیکوئی کی کنجی اور پرہیزگاری کامیابی کا چراغ ہے۔
☆ تقویٰ اخلاق کا رئیس اور بردباری نرمی طبع کی زینت ہے۔
☆ پرہیزگاری نہایت اچھا ساتھی اور تقویٰ ایک مضبوط قلعہ ہے۔
☆ طمع اور لالچ ہمیشہ کی غلامی اور ناامیدی ایک نئی یا عمدہ آزادی ہے۔
☆ صبر بلا کے مقابلے کے لئے عمدہ سامان ہے۔
☆ شکر نعمتوں کی زینت اور قناعت رضامندی کا سرنامہ ہے۔
☆ صبر کامیابی کا ضامن اور صبر فتح مندی کا عنوان ہے۔
☆ صبر بلا کے اثر کو ذلیل کرتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہنسی علاجِ غم ہے

اور کیا کروں؟

ایک سردار شراب پیتا رو رہا تھا۔
بار مالک: کیوں رو رہے ہو؟
سردار: اور کیا کروں.....؟ میں جس لڑکی کا نام بھلانا چاہتا ہوں اس کا نام یاد ہی نہیں آ رہا۔

.....

اب بتائو

سردار ایک بائیو پریکٹیکل امتحان دینے کے لیے گیا.....
ممتحن نے کہا: اس پرندے کی ٹانگ غور سے دیکھو اور اس پرندے کا نام بتاؤ۔
سردار: مجھے نہیں معلوم۔
ممتحن: تم فیل ہو، کیا نام ہے تمہارا؟
سردار: میری ٹانگ دیکھو.....اور بتاؤ میرا نام کیا ہے؟

.....

اندھا دھند

پولیس میں بھرتی ہو رہی تھی۔ ایک اندھا شخص بھی بھرتی ہونے پہنچ گیا اور افسر سے درخواست کی کہ اسے پولیس فورس میں بھرتی کر لیا جائے۔
افسر نے پوچھا: تمہیں ہم کس لیے رکھیں؟
اندھے نے فوراً جواب دیا: ''اندھا دھند فائرنگ کے لیے۔''

.....

بدلہ

بیوی شوہر سے: سنیں جی! آپ کا سب سے اچھا دوست پاگل لڑکی سے شادی کر رہا ہے۔ آپ اسے روکتے کیوں نہیں؟
شوہر: میں کیوں روکوں؟ اس نے مجھے روکا تھا؟

.....

مستقل مزاج

ایک شوہر بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے.....
''میں وہ نہیں کہ شادی ہوئی اور بدل گیا.....میرا آج بھی وہی مزاج وہی ذوق ہے.....شادی سے پہلے بھی مجھے شادی کا شوق تھا.....شادی کے بعد بھی مجھے شادی کا شوق ہے.....''

.....

سوچنے دو

میاں بیوی ڈنر کے لئے ایک ریسٹورنٹ میں گئے۔ ایک اچھی سی ٹیبل منتخب کر کے بیٹھے ہی تھے کہ ایک بے حد خوبصورت سی لڑکی پاس سے گزرتے ہوئے مسکرائی اور شوہر کو ہیلو کہا.....
بیوی: کون تھی یہ؟
شوہر: دماغ مت کھاؤ.....سوچنے دو! ابھی اسے بھی بتانا ہے کہ تم کون ہو!

.....

کیا اچھا لگے گا؟

شوہر: یہ تم مجھے بھرے بازار میں ''اے جی'' کیوں کہتی ہو؟
بیوی: اب بھرے بازار میں ''ابے گدھے'' کہوں گی تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا اچھا لگے گا.....؟

.....

مریض، نرس، ڈاکٹر

"مجھے یقین ہے کہ میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو چکا ہوں۔" ایک نوجوان مریض نے نرس سے کہا۔ "میں تمہارا اتنا گرویدہ ہو چکا ہوں کہ میں چاہتا ہوں کہ میں کبھی صحت یاب نہ ہوں تاکہ تم سے دوری نہ ہو جائے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم اپنی دلی مراد پالو گے۔" نرس نے جواب دیا۔ "ڈاکٹر بھی میری محبت میں گرفتار ہے اور آج صبح اس نے تمہیں دیکھ لیا تھا، جب تم میرے قریب ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔"

.....

پسند

"ڈارلنگ! تمہیں پتہ ہے مجھے تمہاری کون سی چیز پسند ہے؟"

"میرے بال؟"

"نہیں۔"

"میرا سراپا؟"

"نہیں۔"

"میری فہم و فراست؟"

"نہیں۔"

"میں ہار گئی۔"

"بس، یہی مجھے پسند ہے۔"

.....

پٹرول ختم ہو جائے گا

دیہاتی علاقے میں ایک سنسان سڑک پر ڈرائیونگ کرتے ہوئے ایک نوجوان نے اچانک اپنی گرل فرینڈ کی طرف دیکھا اور کہا "کیا تمہیں احساس ہے کہ تم ہر لحہ مجھے حسین سے حسین تر نظر آ رہی ہو۔ کیا تم بتا سکتی ہو اس کا کیا مطلب ہے؟"

"ہاں۔" گرل فرینڈ نے جواب دیا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تھوڑی دیر میں تمہاری کار کا پٹرول ختم ہونے والا ہے۔"

.....

منگنی

بل: میں نے سنا ہے تم نے اس لڑکی کے ساتھ منگنی کر لی ہے جس کے ساتھ رات تم نے ڈانس کیا تھا؟

فریڈ: ہاں، یہ درست ہے۔

بل: لیکن اس سے قبل تو تم اس سے نہیں ملے تھے۔

فریڈ: ہاں میں اس سے نہیں ملا تھا مگر بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اس کے ساتھ چھ بار ڈانس کیا اور ہر بار میں اس سے منگنی کی بات کرنے کے سوا اور کوئی بات کر ہی نہ سکا۔

.....

بچہ

ایک انگریز آدمی گلی میں جا رہا تھا۔ اس نے ایک مکان کے دروازے پر ایک بچے کو سگریٹ پیتے ہوئے پایا تو اس سے سوال کیا "تم اتنے چھوٹے ہو کر بھی سگریٹ پی رہے ہو۔ کیا عمر ہے تمہاری؟"

"میں چھوٹا نہیں ہوں۔" بچے نے جواب دیا۔ "میری ایک گرل فرینڈ بھی ہے۔"

"گرل فرینڈ؟" اس آدمی نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ مجھے گزشتہ رات ملی تھی، وہ انتہائی حسین ہے۔"

"اوہ، کتنی عمر تھی اس کی؟"

"مجھے معلوم نہیں۔ شراب کے نشے میں مجھے عمر پوچھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔"

☆☆☆

پھپھو نے کہا!.....

پروفیسر محمد ظریف خان

میں اس امر کا عینی شاہد ہوں کہ طاہرہ آپا کی "نانی" پچاس برس پہلے رحلت کر چکی ہیں۔ انکی بڑی خالہ تو کجا کوئی چھوٹی خالہ اور پھپھو وغیرہ بقید حیات نہیں لیکن وہ بڑے دھڑلے کیساتھ اپنے آپ کو شوخ اور کمسن لڑکی ظاہر کیا کرتی ہیں۔ انہوں نے آج تک کسی تحریر میں بیٹے یا بہو کا ذکر نہیں کیا حالانکہ انکے پوتے کی عمر چودہ برس ہے!

عمروں کے بھید ٹٹولتی طنز و مزاح سے بھرپور شگفتہ تحریر

طاہرہ آپا جانی مانی خاتون صحافی اور افسانہ نگار ہیں۔ پروفیسر بھی رہی ہیں۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد لکھنا لکھانا ان کا واحد مشغلہ ہے اور آمدنی کا ایک ذریعہ بھی۔ ویسے ان کو اس جزوی یافت کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ ان کا سرکاری وظیفہ یعنی پنشن ہی ان کے لیے بہت ہے۔ ان کے شوہر بھی اعلیٰ سرکاری ملازم رہے۔ ان کی پنشن بھی انتہائی معقول ہے۔ آپا پر کوئی بے جا ذمہ داریاں بھی نہیں۔ ایک بیٹا ہے جو انجینئر ہے اور جس کی شادی کئی برس پہلے ہو چکی ہے۔ 45 برس کا یہ "بچہ"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیرون ملک اپنے بیوی بچوں میں مگن ہے۔ اب طاہرہ آپا عمر کی ستر ویں منزل کو عبور کرنے والی ہیں۔ ماشاء اللہ گوڈے گٹے اب بھی ٹھیک ٹھاک ہیں۔ کیوں نہ ہوں؟..... پوری زندگی خوشی خوشی اور خوشحالی میں بسر کی۔ خوش لباس ہیں اور خوش وضع بھی۔ چہرے کی لکیروں کو مٹانے کا فن جانتی ہیں۔ ماتھے، گلے اور گردن کی جھریاں بھی پُر کرسکتی ہیں۔ ان کی کمائی کا نصف حصہ بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ ان کی ڈیٹنگ پینٹنگ پر ہی تو خرچ ہوتا ہے۔ بظاہر وہ اپنی بڑھتی ہوئی عمر سے فکرمند نہیں لیکن اب ارادی یا غیر ارادی طور پر اس کا اظہار کرنے لگی ہیں۔ بات چیت سے تو کم لیکن تحریروں میں زیادہ۔ گزشتہ چند برس سے ان کے کالموں، فیچرز، افسانوں اور مضامین میں اس طرح کے جملے نمایاں دکھائی دیتے ہیں:

''پھپھو نے میرا کان کھینچ کر کہا، لوٹھا کی لوٹھا ہو گئی ہے مگر ابھی تک بچی بنی پھرتی ہے..... ناک میں کوکا نہ کان میں مندری..... یہ لونڈا پن کب تک چلے گا..... اپنا نہیں تو واجد میاں ہی کا خیال کر لے..... بھلا آدمی کیا سوچتا ہوگا..... وہ دلہن لے کر آیا ہے یا کوئی منڈی بھیڑ؟''

''نانی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے..... ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں: ارے بھئی!..... تم جوان..... ہم بوڑھے..... تم پڑھی لکھی..... ہم انگ انگ کر ''مراۃ العروس'' اور ''بہشتی زیور'' پڑھنے والے..... ارے!..... ہمارا تو خاتمہ بالخیر ہونے والا ہے..... تم تو ابھی کل کی بچی ہو..... انشاء اللہ 50، 60 برس اور جیو گی۔''

''بڑی خالہ نے ناک چڑھا کر مجھے دیکھا اور گویا ہوئیں: اے بی!..... بہت سُن لیں تمہاری باتیں..... وہی مثل ہے، کدو کی بیل، کوٹھے چڑھی..... یعنی اب آپ ہمیں سمجھائیں گی؟..... کل کی بچی..... ہماری گودوں میں پلی..... انگوٹھے برابر..... چلی ہے ہمیں نصیحت کرنے؟''

یہ میں نہیں کہتا۔ ماہرین نفسیات کی تحقیق اور تجزیہ بھی یہی ہے کہ خواتین اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں یا نیم خواندہ، شہری ہوں یا دیہاتی اور چٹی اَن پڑھ ہوں یا انگلستان پلٹ، اپنی بڑھتی ہوئی عمر کی فکر میں مبتلا رہتی ہیں۔ وہ جہاں کہولت، سن و سال کے آثار مٹانے کے لیے لیپاپوتی کا سہارا لیتی ہیں۔ وہیں ان کی بات چیت یا تحریر و تقریر میں بھی بچپن جھلکنے لگتا ہے یعنی وہ قلمی یا لفظی تصویر کے پیکر میں خود کو کچھ اس طرح بنا سنوار اور گھس گھسا یا رگڑ رگڑ کر پیش کرتی ہیں جیسے کہ ابھی بڑی کمسن ہیں۔ بھئی! ابھی تو ان کے کھیلنے کھانے کے دن بھی ختم نہیں ہوئے۔ اب طاہرہ آپا کو ہی لے لیجیے۔ موصوفہ، میری بڑی بہن کی ہم جماعت ہیں۔ میری ہم شیر مجھ سے آٹھ برس بڑی ہیں۔ ہمارے اور طاہرہ آپا کے گھرانوں میں بڑے دیرینہ مراسم بھی ہیں۔ آج سے چند سال پہلے وہ بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتی تھیں کہ میں نے تمہیں اپنی گود میں کھلایا ہے۔ وہ مجھ سے ''تم'' یا ''تو'' کہہ کر مخاطب ہوا کرتیں مگر 60 برس کی عمر کو پہنچ کر یہ ''تم اور تو''، ''آپ''، ''جناب'' اور ''ظریف صاحب'' میں بدل گیا۔ دوسروں کے سامنے یا کسی محفل میں تو کجا، تخلیہ میں بھی ان کا انداز تخاطب یہی ہوتا ہے۔ میں اس امر کا عینی شاہد ہوں کہ طاہرہ آپا کی ''نانی'' پچاس برس پہلے رحلت کر چکی ہیں۔ ان کی بڑی خالہ تو کجا کوئی چھوٹی خالہ اور پھپھو وغیرہ بقید حیات نہیں لیکن وہ بڑے دھڑلے کے ساتھ نانی، خالہ اور پھپھو کے حوالے کر کے اپنے آپ کو لاپروا، شوخ اور کمسن لڑکی ظاہر کیا کرتی ہیں۔ انہوں نے آج تک اپنی کسی تحریر میں اپنے بیٹے یا بہو کا ذکر نہیں کیا حالانکہ ان کے پوتے کی عمر چودہ برس

ہے جبکہ اس سے چھوٹی بارہ اور دس برس کی دو بہنیں یعنی طاہرہ آپا کی پوتیاں ہیں۔ وہ تو خدا کا شکر ہوا کہ طاہرہ آپا کا بیٹا جو پندرہ سال پہلے بیرون ملک گیا تھا، پاکستان واپس نہیں آیا۔ وہ طاہرہ آپا اور ان کے شوہر ہی کو فرنگستان بلا لیتا ہے۔ اگر اس کا آنا جانا لگا رہتا تو طاہرہ آپا کی بڑی بھد اُڑتی۔ آپ خود ہی سوچیں کہ ایک نوجوان ''لڑکی'' کے تین عدد پوتی پوتے کس طرح ہو سکتے ہیں؟

اس حوالے سے ایک دلچسپ حقیقت سے مزید آگاہی کر لیں۔ ''عمر'' اور ''جوانی'' کے حوالے سے ہماری ایک مرحوم گلوکارہ اور اداکارہ بلکہ اپنے فن کی ملکہ بھی بڑی حساس تھیں۔ انہوں نے خود کو کبھی عمر رسیدہ یا ضعیف تسلیم نہیں کیا۔ اول تو انہوں نے اپنی تاریخ پیدائش میں ڈنڈی ماری۔ وہ 1920ء میں پیدا ہوئیں مگر کاغذات میں 1926ء درج ہے۔ ان کا سب سے بڑا بیٹا مرحوم 1945ء میں پیدا ہوا۔ اگر مرحوم زندہ ہوتا تو اب اس کی بھی عمر 67 برس کو پہنچتی لیکن ملکہ نے اپنے ساتھ بیٹے کی عمر کو بھی گھٹا دیا تھا اور ایک موقع پر ملکہ نے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے متعلق صحافیوں سے کہا کہ وہ ان کے بچوں کو ان کے ماں باپ سمجھا کریں۔ بات تو مذاق کی ہے لیکن ملکہ کے الفاظ میں ان کی خواہش جوانی و کم سنی جھلک رہی تھی۔ ایک اور مزیدار بات یہ ہے کہ ملکہ بڑی حسین و جمیل تھیں لیکن ان کے بدنما دانت ان کی دلکشی کو گہن لگا دیتے تھے۔ اس لئے ملکہ نے 50 برس کی عمر میں اپنے تمام دانت نکلوا کر ان کی جگہ بڑی خوبصورت بتیسی فٹ کرا لی۔ پھر ملکہ نے مرتے دم تک مصنوعی دانتوں کو اصلی قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے منہ میں پورے بتیس کے بتیس دانت سلامت ہیں اور کوئی دندان ساز اتنے خوبصورت دانت بنا ہی نہیں سکتا۔ ''جوانی اور کم سنی'' سے متعلق ملکہ اس حد تک حساس واقع ہوئی تھیں کہ مرض الموت میں بھی ان کا میک اپ آرٹسٹ ان کے ساتھ ہسپتال میں رہا۔ وہ دوران علاج بھی ان کا میک اپ کرتا رہتا تھا۔ واقفان حال کہتے ہیں کہ ملکہ جب کراچی کے ایک اعلیٰ ہسپتال میں داخل تھیں تو ان کے بستر کے سرہانے ادویات کی شیشیوں سے زیادہ لپ اسٹک اور لیپاپوتی کا سامان ہوا کرتا۔ ملکہ نے یہ وصیت بھی کی تھی کہ آخری غسل کے بعد ان کا میک اپ کر دیا جائے تاکہ ان کا آخری دیدار کرنے والے یہ سمجھیں کہ وہ مر کر بھی جوان ہی رہیں۔ یہ ایک ملکہ پر ہی موقوف نہیں بلکہ کم و بیش 80 فیصد خواتین اس احساس کی ماری ہیں۔ ہالی وڈ کی مشہور اداکارہ الزبتھ ٹیلر نے 9 عدد شادیاں خود کو جوان کہلانے اور ''رکھنے'' کے لیے ہی تو کی تھیں۔ نویں شادی کے وقت ان کی عمر 72 برس جبکہ ان کے دولہا کی عمر صرف 36 سال تھی۔ یہ تو خیر شادیاں تھیں۔ دوستیوں کو کم از کم 10 سے ضرب دے دیجئے۔ تعداد معلوم ہو جائے گی۔ عام خواتین میں بھی کم عمری اور نوجوانی کے ذوق کا یہ عالم ہے کہ بچپن میں ایک ساتھ کھیلنے والی عورتیں ایک دوسرے کو ''آپا'' کہنے لگتی ہیں۔ سامنے نہیں تو پیٹھ پیچھے صحیح۔ اکثر اوقات اس ادعائی رشتے کے سبب باہمی تعلقات بگڑ جاتے ہیں اور دوستی جیسی قیمتی شے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ عموماً یہاں بھی وہی پھپھو، نانی اور خالہ وغیرہ کے حوالہ جات ہوتے ہیں مگر گلی محلوں میں ایک ساتھ رہ کر پلنے بڑھنے اور جوانی سے گزر کر بوڑھی ہونے والی عورتیں اپنے دعویٰ کم سنی کو چند روز بھی برقرار نہیں رکھ سکتیں۔

اور صاحبو! اب ایک تلخ حقیقت کا اعتراف..... اب اپنی عمر چھپانے اور خود کو ماضی کے مزاروں میں مدفون کرنے کا شوق بہت حد تک مردوں کے سماج میں بھی در آیا ہے۔ مرد شعر اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نثر نگاروں کی تخلیقات میں جوانی کی لہریں پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں اور ان کی گفتگو ابا، اماں، پھپھا، تایا، نانا، نانی، دادا، دادی (زندہ) تک پہنچ رہی ہے۔ کہن سال قبلہ گان تو نوجوان شعراء اور ادیبوں کو مات کر رہے ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک مشاعرے میں تقریباً 75 برس کے ایک بزرگ شاعر نے جو کلام پڑھا اس میں بعض اشعار ایسے تھے جنہیں سن کر کچھ نوجوان جھومے تو کچھ شرما گئے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

لوگ کہتے ہیں مے کشی نہ کرو
ان حسینوں سے دوستی نہ کرو
یار! کیا چاہتے ہیں آخر لوگ
یعنی مر جاؤ، زندگی نہ کرو

ماضی میں بھی چند بزرگ شاعر ایسے ہی درس دینے والے تھے جیسے جوش، فراق، عدم، جذبی اور اختر الایمان وغیرہ اور اب یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ فی زمانہ نوجوان لڑکے تو کجا متعدد سن رسیدہ اور بزرگ مرد بھی بننے سنورنے کے لیے مراکز آرائش حسن پر جانے لگے ہیں۔ بالوں پر خضاب لگانا تو کبھی معیوب یا قابل اعتراض بات نہ تھی مگر اب تو مردوں میں بھی چہرے کی صفائی یا صفایا، جسم کو دلکش بنانے کے لیے مالش اور رگڑائی، بھنویں بنانا اور لبوں کو لالی سے رنگنا بھی عام ہے۔ بھئی!..... چپکے چپکے نہیں یہ کام تو برملا ہوتا ہے۔ کئی چھوٹے بڑے شہروں میں مردوں کے خصوصی بیوٹی پارلر اور سیلون عام دیکھے جا سکتے ہیں۔ عمر کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ایک اطالوی کہاوت ''کوئی عورت کسی دوسری عورت سے بڑی نہیں ہوتی'' کے مصداق مرد بھی خود کو ننھا چھٹولنا اور اپنے سے چھوٹے کو بزرگ سمجھنے لگے ہیں۔ ایک بار میں کراچی سے صادق آباد بذریعہ ٹرین جا رہا تھا۔ دوران سفر میں نے اخبار کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ اچانک کہیں سے آواز آئی ''انکل!..... ذرا بیچ کا صفحہ دے دیجیے۔'' میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو مجھے برتھ پر بیٹھے تقریباً 70 برس کے ایک بزرگ دکھائی دیئے جو میری طرف ہاتھ بڑھائے ہوئے تھے۔ میں نے ان گرانڈ فادر کو دیکھ کر سُنی اَن سُنی کر دی۔ جب انہوں نے دوبارہ مجھے انکل کہہ کر اخبار طلب کیا تو میں نے کہا ''چاچا جی!..... یہاں آپ کا کوئی انکل نہیں..... آپ کے تو سب انکل مرکھپ گئے ہوں گے۔''

بس پھر کیا تھا؟..... پورے سفر کے دوران میرے نام نہاد بھتیجے یا بھانجے اور درحقیقت میرے انکل کے ہم عمر صاحب مجھے خونی نظروں سے دیکھتے گئے۔

تو بھئی!..... کچھ سمجھ میں آیا کہ پھپھو نے کیا کہا اور نانی نے کیا ہدایت کی؟

.....❁.....

کتے کی خصلتیں

ایک بزرگ نے کتے سے کہا کہ تیری چار خامیاں ہیں:

(۱) تو دیوار پر پیشاب کرتا ہے۔
(۲) تو فقیر پر بھونکتا ہے۔
(۳) تو رات کو بھونکتا ہے۔
(۴) تو صبح کو چپ رہتا ہے۔

کتے نے جواب دیا:

(۱) زمین پر اس لیے پیشاب نہیں کرتا کہ کوئی اللہ کا بندہ وہاں سجدہ نہ کر دے۔
(۲) فقیر کو اس لیے بھونکتا ہوں کہ وہ غیر اللہ سے مانگتا ہے۔
(۳) رات کو بھونک کر کہتا ہوں کہ اے غافل انسان اٹھ اپنے رب کی عبادت کر۔
(۴) صبح اس لیے چپ ہوتا ہوں کہ نمازی پریشان نہ ہوں۔

☆☆☆

ذخیرۂ الفاظ بڑھایئے

تسنیم انور سلیمی

ایسے الفاظ جو مختلف زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں لیکن مختلف معنی اور مفہوم کے تحت سمجھے جاتے ہیں!

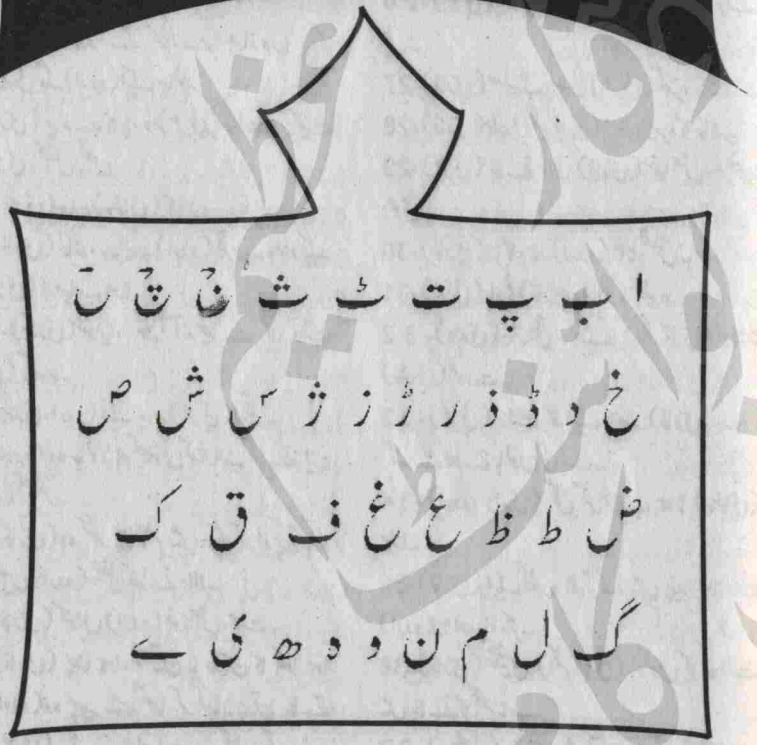

کیا آپ کو ایسے الفاظ معلوم ہیں جو کئی زبانوں میں استعمال ہوئے لیکن ہر زبان میں ان کے معنی مختلف ہوتے ہیں۔ نیچے ایسے چند الفاظ کے معنی مع نام زبان درج کئے جاتے ہیں۔ ذرا وہ الفاظ تلاش کیجئے۔

1- (انگریزی) حاکم سردار (فارسی) تاج

2- (عربی) بہت سے منہ (فارسی، اردو) چرچا، شہرت۔

3- (عربی) خبریں (اردو) خبروں کا پرچہ۔

4- (عربی) آزمائش، تکلیف (اردو) آفت، ڈائن۔

5- (فارسی) اوپر کا، قد و قامت (ہندی) لڑکا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

6- (عربی) بنیاد ڈالنے والا، شروع کرنے والا (ہندی) بزرگوں کا قول یا کہاوت، آواز، بولی

7 -(فارسی) راگ یا باجے کی اونچی آواز (ہندی) بگھی وغیرہ کا وہ بانس جسے گاڑی کے آگے لگا کر گھوڑا جوتتے ہیں (انگریزی) خاص قسم کا گولا جو گرنے سے پھٹ جاتا ہے۔

8 -(فارسی) سمندر کے کنارے جہازوں کے ٹھہرنے کی جگہ (اردو) ایک جانور

9-(فارسی) پرندے کا بازو (عربی) حالت، کیفیت (انگریزی) محفل رقص

10-(ہندی) بدن (پنجابی) گاؤں

11-(فارسی) لحاظ، رعایت (اردو) قریب، نزدیک (انگریزی) کامیاب ہونا۔

12 -(ہندی) سویرا، منہ اندھیرے کا وقت (پنجابی) بگھار۔

13-(ہندی، اردو) ایک ہدہد (عربی) انجیر۔

14-(اردو) وہ جانور جو کھیتوں کو خراب کرتے ہیں (پنجابی) جھینگر۔

15- (فارسی) وہ کنکر جو چلم میں رکھ کر اوپر تمباکو ڈالتے ہیں (اردو) چغلی کھانے والا۔

16-(فارسی) کنواں (اردو) خواہش، محبت۔

17- (فارسی) پھٹا ہوا، آستین یا دامن کا کھلا ہوا حصہ (اردو) وہ پہیہ جسے گھما کر کمہار برتن بناتے ہیں۔(عربی) ڈبہ، جواہرات رکھنے کی ڈبیا (اردو) تمباکو پینے کا آلہ۔

18-(عربی) دانا (فارسی، اردو) علاج کرنے والا۔

19-(عربی) دل (اردو) آؤ بھگت، تواضع۔

20 -(عربی) ویران کرنا (اردو) نکما، بُرا، خستہ (فارسی) مست و بے خود، اجڑا ہوا۔

21-(عربی) دشمن، بدخواہ (اردو) شوہر، خاوند۔

22-(عربی) خدا ہونا (اردو) خدا کی شان، دنیا جہان۔

23-(عربی) ماموں، ماں کا بھائی (فارسی) تل

24-(عربی) نیکی، بھلائی، تندرستی، سلامتی (اردو) ماں، اچھا، درست، بجا۔

25-(فارسی) کانٹا (اردو) حسد، جلن۔

26 -(عربی) خون، لہو (فارسی) سانس، وقت، پل۔

27-(فارسی) صلیب، سولی (عربی) گھر، خانہ۔

28-(فارسی) ملبہ (انگریزی) مسز وغیرہ کا خانہ۔

29-(عربی) بلانے والی (فارسی) خواہش، مرضی، دعویٰ۔

30-(فارسی) تاگا، تار (اردو) تانا، تعلق۔

31-(عربی) باغ (فارسی، اردو) مقبرہ۔

32 -(ہندی) لڑائی، جنگ (انگریزی) دوڑنا (پنجابی) عورت۔

33 -(عربی) رات کا ایک حصہ (فارسی، اردو) گندھے ہوئے بالوں کی لٹ۔

34 -(اردو، ہندی) گل کر خراب ہونا (پنجابی) جلنا۔

35-(فارسی) ایک کٹہرہ جو آگ میں پیدا ہوتا ہے (اردو) بڑا دریا، بحر۔

36-(فارسی) چنبیلی (انگریزی) لوگوں کو عدالت میں بلانے کا حکم نامہ۔

37 -(پرتگالی) یورپین عورتوں کا گون (فارسی، اردو) چھاؤں۔

38-(فارسی) خوف (عربی) بہتر

39-(عربی) عظمت، حالت کام کاج (فارسی) شہد کی مکھیوں کا چھتا۔

40-(فارسی) خوشی، بندر (اردو) ازدواج، بیاہ۔

41 -(عربی) مخالف، برعکس (اردو) ہٹ، کسی بات پر اڑنا۔

42-(عربی) مسافر، عجیب (فارسی) مفلس، نادار۔

43-(عربی) عہد شکنی (فارسی) فساد، بغاوت۔

44-(فارسی) کلی کرنا (اردو) ایک قسم کا کھلا اور ڈھیلا پاجامہ۔

45-(عربی) نوجوان، لڑکا (فارسی) زرخرید نوکر۔

46- (عربی) تنہا، اکیلا (اردو) حساب کتاب کا کاغذ، لحاف یا رضائی کا اکبرہ۔

47 -(عربی) کشادگی، کشادہ جگہ، وسیع میدان (فارسی، اردو) بہار، کرۂ ہوا، جسمانی تا ذہنی ماحول۔

48- (عربی) عدل، انصاف، ترازو (فارسی، اردو) قرض کا وہ حصہ جو مختلف اوقات میں ادا کیا جائے۔

49-(فارسی) حلق، تالو، مقصد (اردو) کاج، شغل

50-(عربی) مہربانی، بخشش (اردو) قسمت، نصیب

51-(عربی) شریف، مہربان (انگریزی) بالائی

52-(عربی) کتنا (فارسی، اردو) تھوڑا

53-(فارسی) گوشہ کرنا (اردو) درختوں کے سائے میں بیٹھنے کی جگہ

54-(فارسی) خزانہ (ہندی) ایک مرض جس میں سر کے بال نہیں رہتے۔

55-(فارسی) ریوڑ (اردو) وہ ظروف جس میں دکاندار بکری کی رقم رکھتے ہیں۔

56 -(فارسی) تشت، چپچی (اردو) تعلق، شوق، محبت۔

57 -(فارسی) چیونٹی (اردو) مشہور خوبصورت پرندہ۔

58- (عربی) عرب کے شمال میں ایک ملک (فارسی) سورج غروب ہونے کا وقت (ہندی) دھات وغیرہ کا چھلا جو چھڑی پر چڑھاتے ہیں۔

59 -(عربی) گواہ، حاضر (فارسی) حسین و جمیل، محبوب۔

60-(عربی) سونے کے ریزے جو کان سے چنے جائیں (فارسی، اردو) اخباروں اور رسالوں کے مختلف نوٹ۔

61-(عربی) دن (فارسی) صبح سے کچھ نہ کھائے ہوئے، صبح تھوڑا سا کھانا۔

62- (ہندی) بدن، جسم (عربی) تخت، پلنگ، تخت شاہی۔

63-(عربی) تپ دق (اردو) مسالہ پیسنے کا پتھر، پتھر کا چوڑا ٹکڑا جو عمارتوں میں کام آتا ہے۔

64-(عربی) پوشیدہ تدبیر (اردو) دھوکہ، فریب۔

65-(فارسی) تانبا (انگریزی) کنواری لڑکی۔

66-(عربی) ترازو (فارسی) مجموعہ۔

67-(عربی) دولت (ہندی) وہ تاگا جو چرخے کو گھماتا ہے۔

68 -(عربی) آمیزش (فارسی، اردو) طبیعت، عادت۔

69 -(عربی) خواہش (اردو) گرد، مٹی جو جسم یا کپڑوں پر لگ جائے۔

70 -(فارسی) ایک مشہور نقاش و مصور (ہندی) چھوٹی سی سوراخ دار لکڑی جو چکی کی کیل میں دی جاتی ہے (اردو) بیگمات کی زبان میں بچے کی آیا۔

71-(عربی) آگ (ہندی) عورت۔

72-(عربی) لوگ (ہندی) خوار، خراب و تباہ۔

73-(فارسی) آدھا (ہندی، اردو) ایک درخت جس کے کڑوے پتے دواؤں میں کام آتے ہیں۔

74-(عربی) مچھلی (ہندی) نمک۔

75-(عربی) بڑھنے والا (فارسی) مشہور و معروف، نامور۔

76-(عربی) مبارک، اقبال مند (فارسی) بندر۔

77-(عربی) سرمہ لگانے والی سلائی، ایک مخصوص

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باتوں سے خوشبو آئے

☆الفاظ اور مطالعے کا ذخیرہ وسیع تر رکھو لیکن بات مطلب کی اور مختصر کرو۔

☆کسی کی خوبیوں اور خامیوں کو مدنظر رکھ کر اس کے قریب جاؤ کیونکہ بعد میں واپسی مشکل ہو جاتی ہے۔

☆خاموشی میں الفاظ کی نسبت قوت گویائی زیادہ ہوتی ہے۔

☆دنیا کی حقیقت آخرت کے مقابلے میں ایسی ہی ہے جیسے تم میں سے کوئی شخص سمندر میں انگلی ڈالے اور اس کے بعد یہ دیکھے کہ وہ کتنا پانی لے کر لوٹتی ہے۔ وہ پانی ہی دنیا کی حقیقت ہے۔

(ایس امتیاز احمد۔ کراچی)

فاصلہ (فارسی) موگری، مگدر جس سے ورزش کرتے ہیں۔

78-(عربی) احسان، ایک شیریں رطوبت جو بنی اسرائیل کے لیے درختوں پر جم جاتی تھی۔ (فارسی) اسم ضمیر یعنی میں (ہندی) دل، جی، سانپ کا مہرہ، ایک وزن۔

79-(عربی) چہرہ (فارسی، اردو) سبب، باعث۔

80-(فارسی) طرز، مانند، لائق، مناسب، باعث (ہندی) حملہ، تلوار یا خنجر کی ضرب (انگریزی) لڑائی، جنگ۔

81-(ترکی) گونگا (فارسی) ایک جوہر جس کا محرب لعل ہے، سرخ رنگ (ہندی) ایک سرخ رنگ کا چھوٹا سا پرندہ (اردو) لڑکا، بیٹا۔

82-(عربی) لہر (اردو) طبیعت کی خوشی، امنگ۔

83-(فارسی) انگڑائی (اردو) بدلہ، مکانات۔

84-(فارسی) جال (اردو) بھاؤ، مول، قیمت۔

85-(فارسی) جانب، طرف (عربی) لڑائی۔

86-(عربی) جلا کرنے والا، میل دور کر کے مصفا و روشن کرنے والا (اردو) خانے دار کپڑا، لوہے کی تاروں کا بنا ہوا جال، پردہ جو آم کی کیری میں گٹھلی پڑنے سے پڑ جاتا ہے۔

87-(فارسی) غالب (ہندی) ایک قسم کی منقش پگڑی، دوشیزگی، نوکر، غلام۔

جوابات

1- افسر۔ 2-افواہ۔ 3-اخبار۔ 4-بلا۔ 5-بالا۔ 6-بانی۔ 7-بم۔ 8-بندر۔ 9-بال۔ 10-ہنڈ۔ 11-پاس۔ 12-تڑکا۔ 13-تین۔ 14-ٹڈی۔ 15-چغل۔ 16-چاہ۔ 17-اک۔ 18-کلیم۔ 19-خاطر۔ 20-خراب۔ 21-خصم۔ 22-خرابی۔ 23-خال۔ 24-خیر۔ 25-خار۔ 26-دم۔ 27-دار۔ 28-دراز۔ 29-داعیہ۔ 30-رشتہ۔ 31-روضہ۔ 32-رن۔ 33-زلف۔ 34-سڑنا۔ 35-سمندر۔ 36-سمن۔ 37-سایہ۔ 38-سہم۔ 39-شان۔ 40-شادی۔ 41-ضد۔ 42-غریب۔ 43-غدر۔ 44-غرارہ۔ 45-غلام۔ 46-فرد۔ 47-فضا۔ 48-قسط۔ 49-کام۔ 50-کرم۔ 51-کریم۔ 52-کم۔ 53-کنج۔ 54-گنج۔ 53-گلہ۔ 56-لگن۔ 57-مور۔ 58-شام۔ 59-شاہد۔ 60-شندرات۔ 61-نہار۔ 62-سریر۔ 63-سل۔ 64-مکر۔ 65-مس۔ 66-میزان۔ 67-مال۔ 68-مزاج۔ 69-صل۔ 70-مانی۔ 71-نار۔ 72-تاس۔ 73-نیم۔ 74-نون۔ 75-نامی۔ 76-میمون۔ 77-میل۔ 78-من۔ 79-وجہ۔ 80-وار۔ 81-لال۔ 82-موج۔ 83-خمیازہ۔ 84-دام۔ 85-سُو۔ 86-جالی۔ 87-چہرہ۔

سپنوں کا اُڑن کھٹولا.....

آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی پڑھی لکھی لڑکیاں دوسروں کے بہکاوے میں آ جاتی ہیں، آج ہمارے ہاں لڑکیوں کی بہت بڑی تعداد ٹھکرائے جانے یا مسترد کیے جانے کے بعد اذیت کی زندگی گزار رہی ہے، اُن دیکھے مردوں سے توقعات وابستہ کر لینے والی لڑکیاں بالآخر مایوسی سے دوچار ہوتی ہیں!

عارف محمود اپل

''کسی کو اپنا بنا لو یا کسی کے ہو جاؤ''..... یہ سطر پڑھنے اور سننے میں بڑی دلکش اور نہایت سہل محسوس ہوتی ہے لیکن اس کی گہرائی میں چلے جائیں تو سب کچھ بڑا کٹھن بلکہ تلخ اور کسی حد تک ناقابل برداشت بھی ہوتا ہے اور اس کے زیادہ مخالف اثرات صنف نازک پر ہی مرتب ہوتے ہیں۔ مردوں کے کاندھے سے کاندھا ملا کر چلنے والی اس دور کی لڑکی بلاشبہ کسی معاملے میں پیچھے نہیں ہے لیکن محبت اور پیار ایک ایسا پہلو ہے جہاں وہ مار کھا جاتی ہے۔ ایک سروے رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں 95 فیصد لڑکیاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شادی کرنے کی خواہش رکھتی ہیں جبکہ بقیہ پانچ فیصد اس حوالے سے جھوٹ بول رہی ہوتی ہیں اور شادی ہی ایک ایسا لفظ ہے جس پر وہ سب سے زیادہ دھوکہ کھاتی ہیں۔ یہ وہ پہلو ہے جو انہیں کہیں ذہنی اور کہیں جسمانی اعتبار سے مضروب کرتا ہے۔ اگر کوئی لڑکی کسی کے بہکاوے میں نہ آ رہی ہو یا عرف عام میں اسے ''پٹانے'' میں مشکل ہو تو اسے صرف یہ جھانسہ دے دیا جاتا ہے کہ تم ہی وہ لڑکی ہو جس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس ایک جملے کے بعد لڑکی آسمان پر اُڑنے لگتی ہے اور خوابوں کے ہنڈولے میں جھولتے ہوئے اپنا آپ اس شخص کو سونپ دیتی ہے جس کے بارے میں وہ حتمی طور پر یہ تک نہیں جانتی کہ وہ اس کے ساتھ کس حد تک سنجیدہ ہے اور کہیں اس کے سپنوں کو چکنا چور تو نہیں کر دے گا۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ صنف نازک میں وہ عورت چھپی بیٹھی ہوتی ہے جس کی ان گنت چھوٹی موٹی خواہشات ہوتی ہیں اور ان خواہشات کی تکمیل اس کا جیون ساتھی ہی کر سکتا ہے۔ آج کے پڑھے لکھے اور ترقی یافتہ دور میں بھی لڑکیاں اس جھانسے میں آ جاتی ہیں کیونکہ اپنا گھر بنانے کا خواب انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرتا ہے جو کہ عورت کی فطرت ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اس اہم پہلو کو فراموش کر دیتی ہے کہ ایسا کوئی تعلق کوئی ناطہ کوئی رشتہ جس میں بڑوں کی مرضی اور خوشی شامل نہ ہو پائیدار نہیں ہو سکتا۔ انہیں محض امکانات پر غور کرتے ہوئے یہ بات یاد بھی نہیں رہتی کہ تعلقات کو آگے بڑھانا اور اپنے طور پر امیدیں وابستہ کر لینا سراسر بیوقوفی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں کا واقعہ ہے کہ کسی لڑکی کو مستقبل کے سہانے خواب دکھائے گئے۔ اسے پیار، مان اور توجہ کا مرکز بنایا گیا اور بہت ہی مختصر سے عرصے میں زندگی کی تمام محرومیوں، مایوسیوں اور ناہمواری کا ازالہ ہو گیا اور لڑکی کا ذہن فضاؤں میں پرواز کرنے لگا۔ اس کے تو پاؤں اب زمین پر نہیں ٹک رہے تھے کہ وہ محبت کے حصول میں کامیاب و کامران رہی تھی لیکن افسوس کہ جب دونوں کی بات مہینوں پر محیط ہوئی تو شاید لڑکے کا دل بھر گیا یا اسے کوئی زیادہ بہتر محبت میسر آ گئی کہ وہ ہاتھ جھاڑ کر الگ ہو گیا اور موبائل فون پر قائم ہونے والا یہ لفظی رشتہ چند الوداعی جملوں کے ساتھ اپنے اختتام کو جا پہنچا۔ وہ سارا اعتماد تمام تر بھروسہ اور یقین اس طرح رخصت ہو گیا جیسے کہ آنکھ کھلتے ہی کوئی سہانا سپنا ٹوٹ جاتا ہے۔ اب لڑکی بیٹھ کر اپنے نصیب پر کڑھ رہی ہے اور ایک پل جیتی تو ایک پل مرتی ہے کہ اس نے ایک ایسے شخص سے آنے والی زندگی کے تانے بانے جوڑنے کی کوشش کی جس کا وہ اتا پتا بھی نہیں جانتی۔ اس کے خاندان اور سماجی حیثیت سے بھی واقف نہیں..... بس ایک تعلق تھا جو کہ دراز ہوتے ہوتے اچانک ہی ختم ہو گیا۔ اس سارے قصے میں قسمت کو کسی طرح بھی دوش نہیں دیا جا سکتا کہ یہ سب کیا دھرا خود لڑکی کا ہے۔ اس میں کسی کا کیا قصور..... جب اللہ پاک نے ہر انسان کے لیے سیدھی راہ متعین کر دی ہے اور اسے صحیح یا غلط کا فرق سمجھا دیا ہے تو پھر کسی اور کو قصوروار ٹھہرانا انصاف تو نہیں ہے۔ ایسی لڑکیاں تو نری بیوقوف ہیں جو کسی بھی بات پر یقین کر لیتی ہیں لیکن لڑکے بھی اپنے مقاصد کے لیے بڑی سے بڑی قسمیں کھانے سے نہیں چوکتے اور مکافات عمل کو بھی بھول جاتے ہیں کہ ان کا یہ عمل خود ان کے یا خاندان کے کسی فرد کو بھی اسی طرح کی صورتحال سے دوچار کر سکتا ہے۔ لڑکیوں کے جذبات سے کھیلنے کے بعد 'سوری' کا لفظ ساری کہانی کا خاتمہ ہوتا ہے یا پھر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اس معذرت

خواہانہ لہجے کے ساتھ مجبور ہیں۔

دراصل سچی اور پاکیزہ محبت کا وجود صرف کہانیوں اور قصوں میں ہی رہ گیا ہے جبکہ عام زندگی میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ محض ایک کھیل، تفریح اور تماشہ ہے۔ یہ سب کچھ نیا نہیں بلکہ برس ہا برس سے اسی طرح چل رہا ہے مگر اب ماضی کی طرح ندامت اور شرمندگی کی جگہ ڈھٹائی نے لے لی ہے اور انسانوں نے محبتوں کو بھی میلے کپڑوں سے زیادہ کی حیثیت نہیں دے رکھی کہ جب تک چاہا پہنے رکھے اور پھر اُتار کر پھینک دیئے۔ اس کے پس منظر میں جو مضمرات ہیں ان کو دیکھنے کا کسی کے پاس وقت نہیں۔ ایسا نہیں کہ سو فیصدی واقعات میں لڑکیاں ہی متاثر ہوتی ہیں لیکن مسترد کئے جانے کے حوالے سے مردوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے جسے انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ بڑی عمدہ اور لطیف سی بات ہے کہ ''واقعات اہم نہیں ہوتے، یادیں انہیں اہم بناتی ہیں۔'' یہ سانپ گزر جانے کے بعد لکیر پیٹنے والی بات ہرگز نہیں ہے کیونکہ یادیں انسان کا کبھی پیچھا نہیں چھوڑتیں بلکہ چھوڑ دینا آپ کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ کوئی ایسا واقعہ، کوئی گانا یا کوئی خاص بات اچانک آپ کو دس برس پیچھے لے جاتی ہے اور ذہن کے پردے پر ماضی کی ہر تصویر اجاگر ہونے لگتی ہے۔ کبھی کوئی خاص موسم آپ کے سامنے پورا ماضی لا کر کھڑا کر دیتا ہے پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ انسان پچھلی باتوں کو یاد ہی نہ کرے۔ لڑکیوں کی بہت بڑی تعداد ٹھکرائے جانے یا مسترد کئے جانے کے بعد اذیت ناک زندگی گزار رہی ہوتی ہے جن کی اکثریت ڈپریشن میں مبتلا ہو جاتی ہے اور کہیں ذہنی امراض جڑ پکڑ لیتے ہیں اور بہت سارے واقعات میں دوسری محبت کی تلاش میں کامیابی بھی اس کا مداوا یا تلافی نہیں ہوتی۔ جو کچھ دل پر گزر چکا ہوتا ہے اس کا ازالہ نہیں ہو پاتا اور پہلی محبت کی ناکامی آنے والی زندگی کو اجیرن کر کے رکھ دیتی ہے۔ یہ عورت کی خصوصیت ہے کہ وہ حال میں رہنے کے باوجود ہمیشہ ماضی کی باتیں سوچ کر اور یاد کر کے خوش یا اُداس ہوتی ہے اور اس کا پہلا پیار اگر سچا تھا تو اسے فراموش کر دینا ایک ناممکن امر ہے۔ اس سچائی سے فرار ممکن ہی نہیں کیونکہ عورت پچھلی باتوں کو لاکھ ذہن سے نکال دے یا کھرچ کر پھینک دے مگر بھولتی نہیں، فراموش نہیں کر پاتی اور تنہائی کے لمحات اسے خود بخود ماضی کی طرف کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ غور کرنے کا پہلو یہ ہے کہ ہمیشہ دُکھ اٹھانے والی ہستی عورت ہی کیوں ہوتی ہے۔ مرد کو ایسے حالات کا سامنا کیوں نہیں کرنا پڑتا۔ شاید اس لئے کہ عورت ہمیشہ حد سے زیادہ توقعات وابستہ کر لیتی ہے اور یہی سوچتی رہتی ہے کہ اس سے جو بھی وعدہ کیا گیا ہے وہ پورا کیا جائے گا حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ برس ہا برس سے عورت دھوکہ کھاتی آئی ہے اور مرد اسے بیوقوف بنا کر دھوکے پہ دھوکہ دیتا رہا ہے۔ بہت سارے معاملات میں عورت یہ جانتی ہے کہ اسے بہلاوا دیا جا رہا ہے لیکن وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر مکمل طور پر ٹھکرائے جانے یا نظرانداز کئے جانے تک مرد کو پوجتی رہتی ہے۔ وہ اندر سے ٹوٹ جانے کے باوجود بددعا نہیں دیتی بلکہ اس کی آنکھیں حسرت سے جانے والے کو دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ اس کے دل سے آہ نکلتی ہے تو عرش بھی ہل کر رہ جاتا ہے لیکن وہ ایسے الفاظ کی ادائیگی نہیں کرتی جو کہ کسی کی بدسلوکی کا جواب ہوں۔ شاباش ہے لڑکیوں پر کہ وہ جانتے بوجھتے ہوئے عظمت کے مینار پر چڑھنے کے بعد وعدہ کر بیٹھتی ہیں کہ وہ اس شخص کی مورتی کو اپنے من مندر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں سجا کر رکھیں گی جو انہیں بھری دنیا میں اکیلا کر گیا اور یہ کہتے ہوئے کہ میں تمہیں خود سے دور کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا مگر میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے گھر میں آباد رہو اور مجھے ہر معاملے میں اپنا سب سے اچھا دوست سمجھنا...... اور بیوقوفی کے ماؤنٹ ایورسٹ کو چھونے والی لڑکی اس بات کو تسلیم بھی کر لیتی ہے جسے بہت دیر میں یہ علم ہوتا ہے کہ اس کی دنیا کو اجاڑنے والا لفظوں کے سنہرے جال بنتے ہوئے خوشی خوشی نیا گھر بھی بسا چکا ہے۔

دور حاضر کی لڑکیاں سادہ نہیں ہیں۔ ان کو میڈیا اور اردگرد کے ماحول نے بہت سکھایا ہے بلکہ طاق کر دیا ہے لیکن پیار و محبت کے نام پر دھوکہ کھانا گویا ان کی فطرت میں شامل ہے۔ ایک ایسا پہلو جہاں ان کی عقل رخصت ہو جاتی ہے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے۔ چیٹنگ کرتے ہوئے کسی سے جان پہچان، رانگ کال مل جانے پر کسی سے بات یا کسی تقریب میں ایک نظر دیکھنے کے بعد رسمی سی واقفیت بھی اس سلسلے کا آغاز ہو سکتی ہے جس کا راستہ کسی اندھیری سرنگ کی طرح اور خاتمہ دھوکے کی کھائی پر ہوتا ہے جس میں گرنے والی لڑکیاں بمشکل ہی خود کو سنبھال پاتی ہیں۔

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ محض وعدے وعید اور قسمیں ہی کسی بندھن کی مضبوطی کے لیے ضروری نہیں بلکہ لازمی ہے کہ جو کچھ آپ سے کہا جا رہا ہو اس کی جھلک عملی طور پر بھی دکھائی دے اور آخری لمحات میں انکار یا رد کئے جانے سے بہتر ہے کہ تعلقات کی سطح بڑھانے سے گریز کیا جائے یا اس کا دائرہ کار ایک ایسی دوستی تک محدود رہے جسے چھوڑتے ہوئے کوئی قلق نہ ہو۔ اگر کوئی مسلسل اپنی محبت کو پوشیدہ رکھنے پر مصر ہو اور بات بڑوں تک پہنچانے میں ٹال مٹول کر رہا ہو تو اس کا واضح مطلب ہے کہ آپ کے ساتھ اخلاص سے کام نہیں لیا جا رہا بلکہ یہ محض وقت گزارنے کا ایک طریقہ ہے۔ اگر کوئی آپ کو خود سے قریب کرنے کے منتخب راستے کو اختیار کرنے پر زور دے رہا ہے تو جان لیں کہ اس میں سنجیدگی کا عنصر کم اور تفریح زیادہ ہے۔ اگر آج کی لڑکی باشعور ہے اور اپنے برے یا بھلے کی تمیز کر سکتی ہے تو مستقبل کے سپنے دیکھتے ہوئے عقل کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دے۔

اسے چاہیے کہ وہ اللہ کی ذات پر بھروسہ کرے اور جب جوڑیاں بنا دی گئی ہیں تو اپنے وقت کا انتظار کرنا بہتر ہے اور اپنے ذہن میں یہ سوچ لئے ہوئے اپنی زندگی گزارنی چاہیے کہ اللہ کا وعدہ ہمیشہ سچا ہوتا ہے۔

بقول شاعر ؎

وہ تو پھر اللہ ہے...... پوری کرے گا آرزو
پتھروں سے جب مرادیں دل کی پا لیتے ہیں لوگ

اقوال زریں

☆ انسان اپنی توہین معاف کر سکتا ہے...... بھول نہیں سکتا۔

☆ جس سے محبت کی جائے اس سے مقابلہ نہیں کیا جاتا۔

☆ کبھی نہ گرنا کمال نہیں بلکہ گر کر سنبھل جانا کمال ہے۔

☆ کسی کو پا لینا محبت نہیں بلکہ کسی کے دل میں جگہ بنا لینا محبت ہے۔

☆ کسی سے روز مل کر باتیں کرنا دوستی نہیں بلکہ کسی سے بچھڑ کر یاد رکھنا دوستی ہے۔

☆☆☆

آئینے کا جھوٹ

صلاح الدین شیخ

بیٹی کے جانے کے بعد مسز انیتا نے آئینے میں جھانکا تو اسے اپنے چہرے کی جھریاں کچھ نمایاں دکھائی دینے لگیں۔ اب اسے اپنے چہرے اور تصویر میں بہت زیادہ فرق محسوس ہونے لگا تھا۔ اسے اچانک یہ احساس ہوا کہ یہ ملاقات جو نہ ہو سکی شاید اس کی زندگی کا آخری واقعہ تھی۔

ایک خود بین اور خود آگاہ عورت کا فسانہ وہ آئینے کے جھوٹ کو سچ سمجھتی تھی

مسز انیتا ڈریک اب تک ان گنت بار اس تصویر کو دیکھ چکی تھی اور ہر بار اسے ایک نئی خوشی کا احساس ہوتا تھا۔ وہ سنجیدہ شخصیت کا نہایت وجیہہ نوجوان دکھائی دیتا تھا۔ مسز انیتا نے سوچا، اس نے اس اشتہار کا جواب دے کر اچھا کیا۔ نہ جانے کیوں خوامخواہ کی ہچکچاہٹ آڑے آ رہی تھی۔

وہ خود سے بار بار یہ سوال کرتی کہ کیا خود اس کی تصویر نے بھی ڈاکٹر ورنر پر اتنا ہی خوشگوار تاثر چھوڑا ہو گا؟ وہ اب بھی اس تصویر سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی حالانکہ یہ کئی سال پیشتر کھینچی گئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔

مسز انیتا نے آئینے میں جھانکا۔ میک اپ کی تہہ میں چھپا ہوا چہرہ اس کی عمر کی چغلی کھا رہا تھا لیکن دل نے کہا تصویر میں اور چہرے میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

وہ انیس سال ہی کی تھی کہ شادی کے بندھن میں باندھ دی گئی۔ بیس سال کی عمر میں وہ ایک خوبصورت بچی کی ماں بنی اور پھر قسمت کی ستم ظریفی کہ خوشگوار ازدواجی زندگی کے صرف آٹھ برس گزرنے پائے تھے کہ بیوگی کی سیاہ چادر نے، اس کی خوشیوں سے منور دنیا کو تاریک کر دیا۔

اس نے حوصلہ مندی سے لیلین کی پرورش کی اور تیوریوں پر کوئی بل ڈالے بغیر مادرانہ فرائض کے علاوہ پدرانہ فرائض بھی بحسن و خوبی انجام دیتی رہی۔ چالیس سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد یقیناً عورت اس بات کا حق رکھتی تھی کہ دنیا سے اپنا حق مانگے اور وہ خوشیاں جو لیلین کی تربیت کی وجہ سے اس سے دُور ہو گئی تھیں، اب اپنے قریب لائے اور اپنی اُداس زندگی کو شادمانی و شگفتگی میں بدل دے۔

اس کی لیلین اب جوان ہو چکی تھی۔ جلد ہی اسے زندگی کا کوئی ہم سفر مل جاتا اور وہ ایک بار پھر اس طویل راہگزر پر تنہا رہ جاتی چنانچہ یہی موقع تھا کہ وہ کسی کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لے۔

اخبارات میں چھپنے والے، شادی یا دوستانہ تعلقات سے متعلق اشتہارات اس سے پہلے بھی اس کی نظر سے گزرتے رہے تھے لیکن مسز انیتا نے کبھی سنجیدگی سے ان کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ شاید یہ اتفاق ہی تھا کہ اس نے مذکورہ اشتہار کا جواب دیا اور پھر ردعمل کے طور پر ڈاکٹر ورنر کی تصویر اور ایک نہایت سنجیدہ تحریر اسے موصول ہوئی۔

لیلین کو جب معلوم ہوگا کہ اس کی ماں نے ایک اجنبی مشتہر سے رسم و راہ قائم کر لی ہے تو وہ کیا سوچے گی! مسز انیتا لیلین کے خیال سے غافل نہ تھی۔ وہ اپنی ماں کے اس اقدام کو سراہے گی یا پھر بیشتر نوجوان لڑکیوں کی طرح اس کا مذاق اُڑائے گی..... یا..... ممکن ہے وہ اس سے حسد کرنے لگے۔

مسز انیتا کو پہلی بار اپنی بیٹی سے کوئی بات کہنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ اس کی بیٹی نے ہر معاملے میں اسے ہمراز بنایا اور پھر اس نے بھی اپنی بیٹی سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی تھی لیکن یہ معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ وہ ارادہ کرتی اور پھر اس کی ہمت جواب دے جاتی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سارا منصوبہ..... یہ ہوائی قلعے تعمیر ہونے سے پہلے ہی ٹوٹ جائیں..... اس نے سوچا اور پھر فیصلہ کر لیا کہ لیلین کو کسی بات کا علم نہ ہونا ہی بہتر ہے!

ڈاکٹر ورنر کے نام اس نے اپنے خط میں خود کو مسز انیتا کے بجائے مس ڈریک لکھا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب اسے مسز انیتا کی بیوگی کا علم ہو یا پھر اسے یہ معلوم ہو کہ وہ ایک جوان بیٹی کی ماں بھی ہے تو اس کا جذباتی ردعمل کچھ مختلف ہو..... مسز انیتا خود کو خیالات کے اس بھنور سے دُور نہ رکھ سکی..... کہیں اس کی تصویر دیکھ کر وہ کچھ زیادہ ہی توقعات وابستہ نہ کر لے؟ یا..... ان کی ملاقات کسی مایوسی کا سبب نہ بن جائے!

وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ اس اہم ملاقات میں اب بھی پورا ایک گھنٹہ باقی تھا۔ گھڑی کی سوئیوں کی رفتار اسے کچھ کم معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے شکر ادا کیا کہ لیلین اپنی کسی سہیلی سے ملنے گئی ہوئی ہے۔ ورنہ وہ بہت جلد اپنی ماں کی اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے چینی کو بھانپ لیتی اور پھر مسز انیتا کے لیے کوئی بات چھپائے رکھنا مشکل ہو جاتا۔

اسے کیا ہو گیا ہے؟ بھلا چالیس سال کی عمر میں بھی کوئی عورت، سکول میں پڑھنے والی کسی دوشیزہ کی طرح گھبراہٹ اور جھجک محسوس کر سکتی ہے؟

ایسی ملاقات..... خواہ کسی اجنبی سے ہی سہی، مسز انیتا کے لیے پہلا موقع نہیں تھا مگر آج کی بات ہی اور تھی اور اس بے چینی کی وجہ ڈاکٹر ورنر کی، شادی کے سلسلے میں سنجیدگی اور عجلت بھی ہو سکتی ہے جس کا اظہار اس نے اپنے پہلے ہی رابطے میں کیا تھا۔ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ یہ ملاقات آخری ثابت ہو۔ پھر تنہائی کا یکسر خاتمہ ہو جائے اور وہ اس شخص کا ہاتھ ہاتھوں میں لیے مسرتوں کی شاہراہ پر گامزن ہو جائے..... کہیں وہ اس اجنبی سے محبت تو نہیں کرنے لگی؟ اس نے خود سے پوچھا اور پھر شرما کر رہ گئی.....

آخر کار اس کی روانگی کا وقت آ گیا۔

''چھ بجے، بڑے گرجا گھر کی بیرونی محرابوں کے قریب۔''

خط میں درج تھا اور ٹھیک چھ بجے مسز انیتا بڑے گرجا گھر کے سامنے کے بازار سے محرابوں پر ٹکٹکی باندھے کھڑی تھی۔ وہ ملاقات سے پہلے چوری چھپے اس اجنبی کی ایک جھلک دیکھنا چاہتی تھی۔

ایک وجیہہ اور خوش لباس شخص جس کی عمر چونتیس پینتیس ہو گی، ان محرابوں کے قریب ٹہل رہا تھا۔ وہ اپنے قریب سے گزرنے والی ہر خاتون کا بغور جائزہ لے رہا تھا اور بار بار اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر بے چینی سے نظریں ڈالتا۔

وہ اپنی تصویر سے بدرجہا بہتر دکھائی دے رہا تھا۔ زیادہ وجیہہ اور کم عمر، شاید بالکل نوجوان۔ مسز انیتا کو محسوس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ ہی چھپ چکی تھی۔

اس نے ایک دکان کے شوکیس میں لگے ہوئے آئینے میں اپنا حلیہ دیکھا اور تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے گرجا گھر کی محرابوں کی جانب بڑھنے لگی۔ اچانک اس کے قدم ٹھہر گئے۔ سڑک کے دوسری جانب سے لیلین تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کا رُخ گھر کی طرف تھا۔ مسز انیتا لپک کر ایک ستون کے پیچھے چھپ گئی تاکہ لیلین اسے دیکھے بغیر گزر جائے۔ اس میں لیلین سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ تھی۔

لیلین نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی اور پھر دکانوں کی طرف دیکھنے لگی۔ شاید کچھ خریدنے کا خیال آ گیا تھا۔ وہ سڑک پار کر کے گرجا گھر کی فٹ پاتھ پر پہنچی ہی تھی کہ اس اجنبی نے بڑھ کر نہایت ہی مہذبانہ انداز میں اپنا ہیٹ اُتار کر اسے سلام کیا اور پھر کچھ کہنے لگا۔ لیلین کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔

مسز انیتا ان کی گفتگو سن نہیں سکتی تھی لیکن اس نے اندازہ لگا لیا کہ لیلین کی ہچکچاہٹ کم ہو گئی تھی اور وہ مسکرا مسکرا کر، زیادہ اعتماد سے اس اجنبی کی باتوں کا جواب دے رہی تھی۔ پھر اجنبی نے ہاتھ سے ایک جانب اشارہ کیا اور دونوں آگے بڑھ گئے۔

مسز انیتا سب کچھ سمجھ گئی تھی اور گھر لوٹ کر اپنی بیٹی کا انتظار کرنے لگی۔ لیلین عام وقت سے کچھ تاخیر سے لوٹی۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی سی اور کسی گہری سوچ میں گم دکھائی دے رہی تھی۔ رات کے کھانے پر دونوں ماں بیٹی کھل کر کسی موضوع پر گفتگو نہ کر سکے اور ماحول پر ایک عجیب سا کھنچاؤ طاری رہا۔ پھر اچانک لیلین جیسے پھٹ پڑی۔

''امی، مجھے آپ کو ایک ضروری بات بتانی ہے۔''

''کہو، کیا بات ہے؟'' مسز انیتا نے اجنبی بنتے ہوئے کہا۔

''امی آج میری ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی تھی، بڑے گرجا گھر کے سامنے۔ پتہ نہیں اسے میرا نام کیسے معلوم ہوا۔ بہرحال، اس نے مجھے مس ڈریک کہہ کر پکارا۔ میں اس سے بے رُخی نہ برت سکی۔ اور جب اس نے مجھے قریبی کیفے میں کافی کی دعوت دی تو میں اس کی درخواست رد نہ کر سکی۔ وہ بہت مہذب اور خوش اخلاق ہے۔'' اس کی تعریف کرتے ہوئے لیلین کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ مسز انیتا مسکراتی رہی.....

''امی، مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اسے پہلے سے جانتی ہوں۔ اس نے مجھ سے دوبارہ ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو میں نے فوراً حامی بھر لی اور وعدہ بھی کر لیا۔ کیوں امی، میں نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟''

''نہیں میری بیٹی، اگر وہ ایک مہذب اور خوش اخلاق شخص ہے تو اس سے ملنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ زیادہ بہتر یہ ہو گا کہ تم اسے یہیں گھر پر بلا لو اور اسے مجھ سے بھی متعارف کروا دو۔ شاید میں بھی اسے اتنا ہی پسند کروں جتنا کہ تم کرتی ہو!''

''میری اچھی امی۔'' لیلین خوشی سے اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ وہ اپنی ماں کی آنکھوں کی چمک کا مطلب نہ سمجھ سکی۔

''مجھے خوشی ہے کہ مجھے تم جیسی ماں ملی ہے..... مجھے تم سے کوئی بات چھپانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ تم ایک اچھے دوست کی طرح میری ہر بات سمجھ لیتی ہو.....!''

''بے شک لیلین'' مسز انیتا نے محبت سے اپنی بیٹی کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''ہم کبھی ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں چھپائیں گے۔''

مسز انیتا بخوبی جانتی تھی کہ ان کا یہ وعدہ محض فریب تھا کیونکہ عین اسی وقت لیلین سے اس نے اپنی زندگی کی ایک بہت اہم بات چھپائی تھی۔

''ہم دونوں اتنے ملتے جلتے ہیں کہ ہماری باتیں ایک دوسرے سے چھپ ہی نہیں سکتیں۔''

مسز انیتا پیار بھری نظروں سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھتی ہوئی بولی ''ہاں، ہم بہت ملتے جلتے ہیں۔ بس فرق یہی ہے کہ تم عمر میں مجھ سے بیس برس کم ہو اور شاید یہ فرق بہت بڑا ہے۔''

بیٹی کے جانے کے بعد مسز انیتا نے آئینے میں جھانکا تو اسے اپنے چہرے کی جھریاں کچھ نمایاں دکھائی دینے لگیں۔ اب اسے اپنے چہرے اور تصویر میں بہت زیادہ فرق محسوس ہونے لگا تھا۔

اسے اچانک یہ احساس ہوا کہ یہ ملاقات جو نہ ہو سکی شاید اس کی زندگی کا آخری واقعہ تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ آئندہ زندگی میں اسے ایک ایسی عورت کا کردار انجام دینا ہے جسے اپنی ذات کے لیے مسرتوں کی تلاش نہیں بس ایک خوشی کا اسے حق پہنچتا تھا اور وہ اس کی اپنی بیٹی کی خوشی تھی۔

وہ اپنی بیٹی کے کمرے میں پہنچی جو آنکھیں موندے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے معصوم چہرے کی گلابی رنگت اور عنابی ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ دیکھ کر اسے اطمینان سا ہوا۔ شاید اس نے اس اشتہار کا جواب دے کر اچھا ہی کیا تھا۔ مسز انیتا نے سوچا ورنہ لیلین کے لیے اتنا اچھا بر کہاں سے ملتا؟

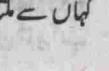

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

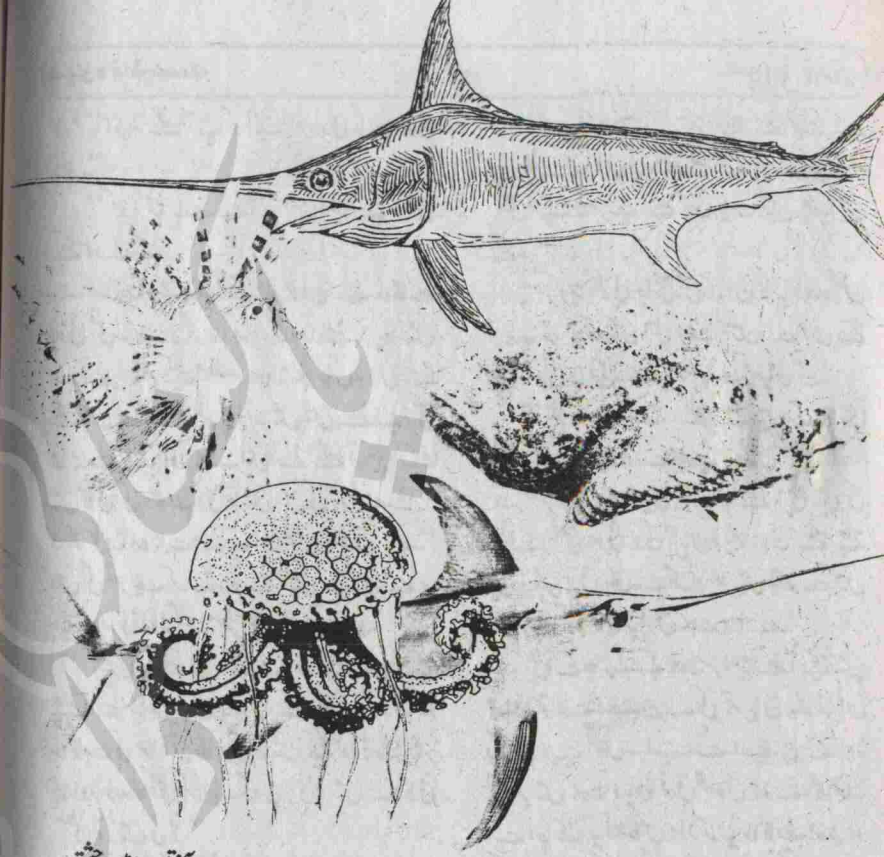

سید آفتاب امین چشتی

ہتھیار بند مچھلیاں

لوہے کی تلوار میں زنگ لگ سکتا ہے، توپ اور بندوق کی بارود بھیگ سکتی ہے، آپ کے ہتھیاروں کا نشانہ چوک سکتا ہے لیکن کیا مجال کہ ان مچھلیوں کے ہتھیاروں میں زنگ لگ جائے یا ان کا نشانہ کبھی خطا کر جائے۔

مختلف ہتھیاروں سے لیس مچھلیوں کے بارے میں ایک دلچسپ مضمون.....!

آپ سمجھتے ہوں گے کہ ہتھیار صرف آپ ہی کے پاس ہیں۔ آپ ہی بندوق چلا سکتے ہیں۔ نشانہ لگا سکتے ہیں۔ شکار کھیل سکتے ہیں..... لیکن شاید آپ ہتھیار بند مچھلیوں سے واقف نہیں۔ جی ہاں! ان مچھلیوں کے پاس بھی ہتھیار ہوتے ہیں جو ہمارے آپ کے ہتھیاروں سے کہیں زیادہ تیز اور پائیدار ہوتے ہیں۔ لوہے کی تلوار میں زنگ لگ سکتا ہے، توپ اور بندوق کی بارود بھیگ سکتی ہے، آپ کے ہتھیاروں کا نشانہ چوک سکتا ہے لیکن کیا مجال کہ مچھلی کی تلوار میں زنگ لگ جائے یا اس کا نشانہ کبھی خطا کر جائے۔ ہتھیار بند مچھلیوں میں تلوار مچھلی بہت مشہور ہے۔ اس مچھلی کی تلوار اصل میں اس کے منہ کے اوپر تھوتھنی سے، سارس کی چونچ کی مانند نکلا ہوا حصہ ہے۔ یہ بالکل تلوار سے مشابہ ہوتا ہے۔ یہ تلوار اتنی لانبی اور تیز ہوتی ہے کہ بآسانی وہیل جیسے بڑے آبی جانور کے جسم میں گھس جاتی ہے۔

ایک بار ایک جہاز کو وہیل سمجھ کر اس مچھلی نے حملہ کر دیا۔ جہاز بہت مضبوط قسم کی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اس کے نچلے حصہ میں تانبے کی موٹی چادریں چڑھی تھیں لیکن اس مچھلی نے بہت آسانی سے جہاز کے ایک فٹ موٹے پیندے میں چھید کر دیا۔ اسی طرح ایک دوسری تلوار مچھلی نے قریب ڈیڑھ فٹ موٹے جہاز کے پیندے کو چیر کر جہاز کے اندر رکھے ہوئے ایک تیل کے پیپے میں چھید کر دیا تھا۔ ایک تیسری مچھلی کی تلوار ایک ناؤ کے ٹکڑے میں اٹک گئی۔ یہ ٹکڑا اس وقت لندن کے عجائب گھر میں رکھا ہے۔ پہلے ہی حملے میں مچھلی نے اپنی تلوار ناؤ کے ٹکڑے کی ٹھوس لکڑی میں ساڑھے تیرہ انچ گھسا دی تھی۔ تلوار نے ٹوٹ کر ناؤ کے خطرناک چھید کو بند کر دیا تھا۔

آرہ مچھلی

یہ تلوار مچھلی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اس کی تھوتھنی دو دھار والے آرے کی طرح لمبی اور تیز ہوتی ہے۔ یہ مچھلی وہیل جیسے بڑے جانور پر حملہ کرتی ہے تو اپنی تھوتھنی اس کے جسم میں پیوست کر کے آرے کی طرح اسے چیر ڈالتی ہے۔ یہ مچھلی تقریباً بیس فٹ لمبی ہوتی ہے۔ اس کا آرہ چار سے پانچ فٹ لمبا ہوتا ہے۔ اس کے آرے میں تیس جوڑے تیز دانتوں کے ہوتے ہیں جن کے بیچ سے کوئی بھی سالم نہیں نکل سکتا۔

بچھو مچھلی

اس مچھلی کی دم کے قریب ایک زہریلا ڈنک ہوتا ہے۔ یہ ڈنک ایک طرف تو اسے دشمنوں سے محفوظ رکھتا ہے اور دوسرے اس کے سہارے یہ مچھلی اپنا شکار کرتی ہے۔

شکار مچھلی

یہ بہت بڑے منہ کی مچھلی ہے۔ اس کے منہ کے کنارے پر تیز دانتوں کی ایک قطار ہوتی ہے۔ شکار ان میں پھنس کر پھر نہیں نکل سکتا۔ اس کی پشت پر چھ لمبے کانٹے ہوتے ہیں۔ آگے والا کانٹا جو سر کے اوپر ہوتا ہے سب سے بڑا ہوتا ہے۔ اس کانٹے کے سرے پر لال رنگ کے گوشت کا ایک لوتھڑا سا ہوتا ہے۔ جب یہ شکار کرتی ہے تو منہ کھول کر چپ چاپ پانی میں لیٹ جاتی ہے اور گوشت کے اس لوتھڑے کو پانی میں ادھر ادھر ہلاتی ہے۔ چھوٹی موٹی مچھلیاں اس لوتھڑے کے لالچ میں اس کی طرف بڑھتی ہیں اور مچھلی کی غذا بن جاتی ہے۔

اس کے جسم کے نیچے اور پچھلے حصہ میں بھی مہین مہین گوشت کے ریشے گچھوں کی شکل میں لٹکتے رہتے ہیں۔ کوئی مچھلی یا کیکڑا اگر انہیں ہڑپ کرنے کے لیے بڑھتا ہے تو وہ شکار ہو جاتا ہے۔

تیرانداز مچھلی

یہ بڑی نشانہ باز قسم کی مچھلی ہے۔ پانی کی مار سے شکار کرتی ہے۔ یہ مچھلی جسے سیامی آرکر مچھلی بھی کہتے ہیں ہالینڈ کے پانیوں میں پائی جاتی ہے۔ ایمسٹرڈیم کے ایک ڈاکٹر نے مارچ 1964ء میں اس مچھلی کو دیکھا اور تحقیق کی۔ سیامی آرکر مچھلی آبی پودوں پر بیٹھنے والی مکھیوں کو تاڑتی رہتی ہے جونہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوئی مکھی اس کی زد میں آتی ہے وہ پانی کی سطح سے پانچ چھ فٹ اوپر اچھل کر اپنے نکی نما منہ سے پانی کی ایک دھار بڑے زور سے اس پر پھینکتی ہے جو اسے گولی کی طرح جا کر لگتی ہے۔ کبھی کبھی یہ اُڑتے ہوئے کیڑوں پر بھی وار کرتی ہے۔

خاصے عرصے تک لوگ یہ بات قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ یہاں تک کہ روسی محقق حیوانات نکولائی زولوٹسکی نے طویل مشاہدات کے بعد اس کی تصدیق کر دی۔ اس نے بتایا کہ قدرت نے مچھلی کے منہ کے بالائی حصے میں دو اُبھری ہوئی سطحیں بنائی ہیں۔ یہ مچھلی اپنی زبان کو تالو سے لگا کر ایک بہت تنگ نلی سی بنا لیتی ہے جو پھونکنے والی نلی سے مشابہ ہوتی ہے۔ اس نلی کے ذریعے یہ اپنے منہ میں لیے ہوئے پانی کو بڑی تیزی سے چھوڑ کر بے خطا نشانہ لگاتی ہے۔ پانی کی یہ پچکاری بندوق کی گولی کی طرح تیز اور مہلک ہوتی ہے۔ آرکر مچھلی کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ اس کے قریب اگر سگریٹ سلگایا جائے تو وہ اس کے شعلے کو جگنو سمجھ کر اس پر فائر کرتی ہے اور بڑی ہوشیاری سے سگریٹ بجھا دیتی ہے۔

نیویارک کے چڑیا گھر میں اس قسم کی ایک مچھلی موجود ہے۔ یہ تماشائیوں کو اپنے نشانہ کے جوہر دکھاتی ہے۔ لوگ سگریٹ کے جلتے ہوئے ٹکڑے اس کے قریب ہوا میں اُچھالتے ہیں اور یہ مچھلی آبی بندوق سے ہوا میں ہی جلتے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے بجھا دیتی ہے۔

پتھر مچھلی

آسٹریلیا کے شمال مشرق میں واقع ساحلی چٹانوں میں ایک چھوٹی سی مچھلی پائی جاتی ہے لیکن انتہائی زہریلی اور خطرناک ہے۔ یہ مچھلی مونگے کی بنی ہوئی چٹانوں کے چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں بے حس و حرکت پڑی رہتی ہے لیکن کوئی شخص گڑھے میں اُترے تو یہ اس کے لیے وبال جان بن جاتی ہے حتیٰ کہ اکثر اوقات گڑھے میں اُترنے والا موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ مچھلی جسے پتھر مچھلی یعنی Stone fish کہتے ہیں، شاید دنیا کی بدصورت ترین مچھلی ہے۔ اس کی لمبائی زیادہ سے زیادہ دس انچ ہوتی ہے۔ اس مچھلی میں دنیا بھر کے زہریلے جانوروں سے زیادہ زہر ہوتا ہے۔

ماہرین حیاتیات عموماً اس مچھلی کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں لیکن یہ ان کے ہاتھ بہت کم آتی ہے کیونکہ دُور سے دیکھیں تو چٹان سے چمٹنے کے سبب پتھر کا ٹکڑا دکھائی دیتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ بالکل حرکت نہیں کرتی اس لیے ہوشیار سے ہوشیار تیراک بھی اسے مونگے کا ایک پتھر سمجھ کر نظرانداز کر دیتا ہے۔ اس مچھلی کی جلد پر عموماً سبز رنگ کی پھپھوندی جم جاتی ہے جس کے سبب اسے دیکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے پر جسم کے نیچے اور مسوں کی طرح کی دو آنکھیں سر کے اوپر ہوتی ہیں۔

پتھر مچھلی کے جسم کے اوپر تیرہ انتہائی تیز اور لمبے کانٹے ہوتے ہیں جو عموماً جسم کے ساتھ چپکے رہتے ہیں لیکن خطرے اور خوف کی حالت میں سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ کانٹے اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں اور ان میں نہایت قاتل زہر بھرا ہوتا ہے۔ کوئی شخص بے خبری میں اس مچھلی کے جسم پر پاؤں رکھ دے تو کانٹے چبھنے سے یہ زہر جسم کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور اس شخص کو انتہائی کربناک درد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ بُری طرح تڑپتا ہے اور وقت پر طبی امداد میسر نہ آنے پر موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس مچھلی کے زہر کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ڈاکٹر کئی دن تک مریضوں کو مارفیا کے انجکشن دیتے ہیں تاکہ ان کا تڑپنا کم ہو سکے۔ اگر زہر کو جسم میں داخل ہوئے دیر ہو چکی ہو تو بسا اوقات

ڈاکٹر تمام تر کوشش کے باوجود انسان کو موت سے نجات نہیں دلا سکتے۔

پتھر مچھلی کے کانٹے اتنے سخت ہوتے ہیں کہ نرم چمڑے کے تلے اور ربڑ کے تلے والے جوتے ان کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے چنانچہ ساحلی گڑھوں میں اس مچھلی کو تلاش کرنے والے لوگ عموماً لکڑی کے موٹے تلے والے جوتے پہنتے ہیں۔ پتھر مچھلی مدوجزر کے باعث ساحلی گڑھوں میں آجاتی ہے اور پانی اُترنے کے بعد ان ہی گڑھوں میں پڑی رہتی ہے۔ پتھر مچھلی عموماً پانی کی تہہ میں نہیں ہوتی بلکہ گڑھے کے پہلو سے چمٹی رہتی ہے لہٰذا گڑھے میں اُترنے والے لوگ بالعموم اس کے زہر سے محفوظ رہتے ہیں۔

پروفیسر ینگ نے 1928ء میں آسٹریلیا کے شمال مشرقی ساحل پر واقع جزیروں میں ایک سال تین ماہ تک اس مچھلی کی تلاش جاری رکھی اور بالآخر مقامی باشندوں کی مدد سے ایک مچھلی پکڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ سڈنی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈکن بھی مدتوں ان جزائر میں پتھر مچھلی تلاش کرتے رہے مگر مایوس لوٹے۔ اس سلسلے میں آرتھری کلارک کہتے ہیں کہ میں خوش قسمت ثابت ہوا کہ چند روز کی تلاش کے بعد یہ بدصورت ترین مچھلی حاصل کر لی۔ ہفتے کے آخری روز میں جزیرہ ہیرن کے ساحل پر گھوم رہا تھا۔ مونگے کی ایک ساحلی چٹان میں بنے ہوئے ایک گڑھے کے قریب سے گزرا تو یہ مچھلی گڑھے کی دیوار کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ میں نے پہلی نظر میں اسے پتھر کا ٹکڑا سمجھا لیکن حسب عادت اسے نیزے سے ٹٹولا تو محسوس ہوا کہ وہ قدرے نرم ہے اور پتھر نرم نہیں ہوتا۔ میں نے اسے ایک اور کچوکا دیا اور مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ مچھلی کے جسم میں تشنج پیدا ہوا اور وہ پانی میں گری اور چند انچ آگے جا کر پھر چٹان سے چمٹ گئی۔ چند لمحوں کے اندر اندر میرے اردگرد سیاحوں، فوٹوگرافروں اور چھٹیاں منانے والے سکول کے طلباء کا ایک ہجوم اکٹھا ہوگیا۔ میں نے فوراً کیمرے سے مچھلی کے چند فوٹو لیے۔ اب اسے پانی سے نکال کر زمین پر لانا ایک مسئلہ بن گیا۔ خوش قسمتی سے ایک طالبعلم کے پاس شیشے کا ایک مرتبان تھا جو وہ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اور آبی کیڑے جمع کرنے کے لیے ساتھ لایا تھا۔ میں نے وہ مرتبان پکڑا اور ایک ہاتھ میں لمبا چاقو لے کر گڑھے میں اُترا۔ چاقو کی مدد سے پتھر مچھلی کو چٹان سے الگ کیا اور مرتبان چٹان کے ساتھ لگا دیا۔ مچھلی کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو وہ سیدھی مرتبان میں آگری۔ اس پر ڈھکنا جما کر میں باہر نکل آیا۔ مچھلی بے حس و حرکت پانی سے بھرے ہوئے مرتبان میں پڑی تھی۔ دیکھنے والوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ مچھلی ہے۔ ہر کوئی اسے پتھر کا ٹکڑا سمجھتا تھا کیونکہ اس نے اپنے بچاؤ کی کوشش نہیں کی تھی۔ گھر لا کر میں نے اسے اپنے تالاب میں چھوڑ دیا۔ اس تالاب میں میں پہلے ہی مونگے کی چٹان کے ٹکڑے ڈال چکا تھا تاکہ مچھلی کو قدرتی ماحول میسر آسکے اور میں آسانی سے اس کا مطالعہ کر سکوں۔ یہ مچھلی تیر نہیں سکتی۔ اگر اسے تنگ کیا جائے تو اپنی جگہ چھوڑ کر چند انچ آگے سرک جاتی ہے اور پھر کسی پتھر سے چمٹ جاتی ہے۔ اگر نزدیک کوئی پتھر نہ ہو تو پانی کی تہہ میں چلی جاتی ہے اور چھپنے کے لیے ریت میں اپنے پیروں سے گڑھا کھودنے لگتی ہے۔ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ پتھر مچھلی کے کانٹے خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی تعداد میں تیرہ ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی مچھلی کے کانٹوں کو بڑی احتیاط سے گنا واقعی ان کی تعداد تیرہ تھی۔ کانٹے کھڑے ہوں تو ان کی لمبائی تقریباً آدھ انچ ہوتی ہے۔

آسٹریلیا کے قدیم باشندے پتھر مچھلی سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

واقف ہیں۔ وہ عموماً رقص کی ایک تمثیل کے ذریعے اس مچھلی کا زہریلا پن ظاہر کرتے ہیں۔ ایک آدمی رقص کرتے ہوئے جھوٹ موٹ کے ایک گڑھے میں گر جاتا ہے اور اس طرح چیختا ہے جیسے واقعی پتھر مچھلی نے اسے ڈس لیا ہو۔ پھر وہ زمین پر گر کر رقص ہی کے انداز میں تڑپتا ہے اور لوٹتا ہے اور بالآخر دم سادھ کر زمین پر لیٹ جاتا ہے جیسے اس کی روح جسم سے پرواز کر چکی ہو۔ اگرچہ آسٹریلیا کے قدیم باشندے خاصے مہذب ہو چکے ہیں اور اپنے آباؤ اجداد کی طرح اس مچھلی کو بدروح نہیں سمجھتے لیکن اس سے ڈرتے ضرور ہیں اور ترغیب یا تحریص کے باوجود اس کے قریب جانا پسند نہیں کرتے۔

جیلی فش

ان ہتھیار بند مچھلیوں کے علاوہ اب ذرا ننھی منی سی بے ضرر مچھلی کا تذکرہ بھی ہو جائے جس کے شکار کا طریقہ نرالا ہے۔ اس مچھلی کو جیلی فش (Jelly fish) کہتے ہیں۔ اس کے سفر کرنے کا طریقہ بڑا نرالا ہے۔ وہ عام مچھلیوں کی طرح نہیں تیرتی بلکہ اُچھلتی ہوئی جاتی ہے۔ دُور سے دیکھیں تو یوں نظر آئے گا جیسے پانی کی سطح پر کوئی منی سی چھتری بار بار بند ہوتی اور کھلتی ہے۔ یہ مچھلی اتنی عجیب ہے کہ خود کوئی حرکت نہیں کرتی اور بڑی بڑی شارک مچھلیوں کے دانتوں میں چھپ جاتی ہے۔ شارک جب شکار کرتی ہے تو یہ اس کے دانتوں سے نکل آتی ہے اور شکار میں سے اپنا حصہ ہڑپ کرنے کے بعد شارک کے دانتوں میں پناہ لیتی ہے۔ اس طرح وہ شارک کے سہارے سمندر میں میلوں کا سفر بھی کرتی ہے اور خوراک تلاش کرنے کی زحمت سے بھی بچی رہتی ہے۔

محبت

اے مری زود رنج محبوبہ
شام کے وقت، قہوہ خانے میں!
جن نگاروں نے ہم کو دیکھا ہے
اور جن کے حریص شیدائی!
رات دن ان کے ساتھ رہتے ہیں
وہ طرح دار لڑکیاں اکثر
پوچھتی ہیں یہ مجھ سے تفریحاً
جس پہ تم جاں نثار کرتے تھے
آج کل کیوں نظر نہیں آتیں
اے مری زود رنج محبوبہ
کیا کہوں ان عجیب لوگوں سے
اپنی حالت پہ مسکراتا ہوں
تیری چھوٹی سی کم نگاہی سے
حادثہ بن گئی ہے میری حیات
ان میں ایسی بھی نازنینیں ہیں
جو مرے غم کا جائزہ لیکر
دیکھتی ہیں بڑی مروت سے
جن کی آنکھوں کی مست جھیلوں میں
تیرنا چاہتا ہے طائر دل
آہ لیکن انہیں کیا معلوم؟
کہ محبت کا سوز لافانی
بددعا ہے بخیل فطرت کی
ان کے نزدیک دن جوانی کے
سبز و شاداب شامیانے ہیں
جن میں جھولے ہیں، عشرتوں کے رواں
ان کو اس حادثے کا علم کہاں
کہ کئی پھول نوجوانی میں
شاخ ہستی پہ سوکھ جاتے ہیں
اور پھر کم ہی مسکراتے ہیں

عبدالحمید عدم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ قربتیں...... یہ فاصلے

زاہدہ یوسفی

سب ہی رسمیں ہوئیں۔ جذبات سے عاری وہ سب نبھائے گیا۔ سالیوں کی چھیڑ چھاڑ سے تو وہ عاجز ہی آ گیا۔ رخصتی کے بعد جب وہ واپس لوٹ رہے تھے تو اسے اپنے پہلو میں بیٹھی دلہن پر بے تحاشا ترس آ رہا تھا۔ نجانے کیا ارمان ہوں گے بیچاری کے لیکن میں تو ایک تہی داماں اسے کیا دے پاؤں گا......

ایک شخص کا فسانہ، وہ منزل پا کر [illegible] ناکام رہ گیا

وہ بلاشبہ حسین تھی اور اس پر مستزاد...... دولت مند بھی۔ خدایا یہ دونوں خوبیاں اسی میں کیوں ہیں! (اس نے کرب سے سوچا)۔ خزاں کی سفاک ہوائیں درختوں کا لبادہ نوچتی رہیں، وہ خزاں رسیدہ زرد پتوں پر بیٹھا سوچوں کے گرداب میں گھرتا چلا گیا۔ اسے اپنا غریب ہونا دنیا کا سب سے بڑا المیہ نظر آیا۔

اب سے کچھ دنوں پہلے وہ بھی چپکے سے جیون بتائے جا رہا تھا نہ فکر فردا نہ غم دوراں...... اسکے والد اوسط درجے کے سرکاری ملازم تھے۔ زندگی خوش و خرم اور مطمئن انداز میں بسر ہو رہی تھی۔ وہ اپنے حلقۂ احباب میں خاصا آسودہ حال گردانا جاتا تھا۔ اس نے گریجویشن میں اعزازی حیثیت سے کامیابی حاصل کی تو یونیورسٹی میں داخلہ لینا مشکل نہ ہوا۔ یونیورسٹی میں آئے ابھی اسے چند ہی روز ہوئے تھے۔ اس کا اکلوتا اور عزیز دوست ساجد بھی یونیورسٹی میں اس کے ساتھ تھا۔

البتہ فطرتاً وہ بے حد خاموش طبع واقع ہوا تھا۔ اسی لیے اس کا حلقۂ احباب بے حد محدود تھا۔

اب جبکہ وہ آنکھیں موندے خیالوں کی دلدل میں دھنستا جا رہا تھا، ساجد اسے ڈھونڈتا ڈھونڈتا ادھر ہی آ نکلا۔ ''ابے او سقراط کے بچے! تھکا مارا تو نے...... سارا کیمپس کھنگال ڈالا میں نے اور جناب یہاں براجمان ہیں۔'' وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا تو وہ نیم وا آنکھوں سے گیان و دھیان کی عمیق گہرائیوں سے گویا ہوا ''یار بعض اوقات انسان خود کو اتنا بے بس محسوس کرتا ہے کہ......''

''بس بس نہیں چلے گا تیرا یہ فلسفہ۔'' وہ اسکے منہ پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا (اُف کتنا بے حس ہے یہ ساجد بھی اس کو کیا معلوم کہ میں کن ارفع و اعلیٰ خیالات کا اظہار کرنے والا تھا) ''سن یار ایک نئی خبر بڑے کام کی ہے میرے پاس۔'' ساجد اپنی ہی دھن میں سسپنس پیدا کرتا ہوا بولا۔ ''اب بک بھی چلو یار کیوں بور کرتے ہو!'' اس نے بیزاری سے پہلو بدلا۔

خزاں رسیدہ پتے اک شور بپا کر گئے (شاید احتجاجاً) ''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں ایک نئی لڑکی آئی ہے۔ ایمان سے یار......''

''اچھا بند کرو اپنا انسائیکلوپیڈیا۔'' وہ جل کر بولا۔ دراصل اسکے دخل در معقولات پر وہ خاصا جز بز ہو رہا تھا۔ یکا یک ایک خیال بجلی بن کر کوندا کہ کہیں یہ وہی شفق رنگ گڑیا تو نہیں جو پرسوں سے اس کے پرسکون دل میں تلاطم برپا کیے ہوئے ہے۔ اس کی عدم توجہی سے ساجد کا موڈ آف ہو چکا تھا اور اب وہ اس سے اسکے متعلق پوچھ بھی نہ سکتا تھا۔

اگلے دن وہ واقعی کلاس میں موجود تھی اور وہ پروفیسر کے لیکچر سے قطع نظر سارا وقت اس کے رخسار میں پڑتے گڑھے میں ڈوب ڈوب جاتا رہا۔ وہ ہو بہو وہی تھی، اس کے خیالوں کا عکس، اسکے سپنوں کی تعبیر۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ وہ ایک دولت مند بزنس مین کی اکلوتی اولاد ہے۔ وہ جو پہلے ہی اسے بڑی سی گاڑی سے اُترتے دیکھ کر خائف ہو رہا تھا، اس اطلاع پر مزید افسردہ ہو گیا۔ اسے اپنے اور اس کے درمیان ایک خلیج...... دولت کی خلیج حائل محسوس ہوئی۔

وہ جو خود یونانی نقوش والا ایک مغرور نوجوان تھا، آج خود کو کتنا بے بس محسوس کر رہا تھا۔ اس نازک سی لڑکی کے سامنے...... اس کا دل اسے بار بار کہہ رہا تھا کہ آگے بڑھ اور اسے پا لے...... یہ دل کی صدائیں اتنی بے اثر کیوں ہوتی ہیں؟ آج وہ عجیب اذیت سے دوچار تھا۔ یکبارگی اس نے اپنا سر جھٹکا...... اُف میں کتنا خودغرض ہوں۔ ایک اجنبی لڑکی کے متعلق لگاتار سوچے جا رہا ہوں جبکہ وہ اس کے دل میں برپا تلاطم سے بے نیاز بے حد انہماک سے لیکچر سن رہی تھی۔ بالوں کی شریر لٹ اسکے شفق رنگ رخسار پر جھول رہی تھی۔ ''اے کاش...... پاگل من بھی کیا مانگنے چلا تھا......'' آج وہ عجیب انداز میں سوچ رہا تھا کہ آج ہم سب خود کو یہاں موجود پا رہے ہیں۔ کل وقت کے دھارے میں جانے کون کہاں چلا جائے اور...... وہ جو فلسفے کی بلندیوں کو چھو رہا تھا یکا یک اسی دنیا میں لوٹ آیا جہاں اسکا مضطرب دل تھا اور یہ پری پیکر...... پروفیسر صاحب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکچر دے کر جا چکے تھے۔

سر آفریدی کے لیکچر کے بعد سب خود کو بے حد ہشاش بشاش محسوس کر رہے تھے اور وہ..... اپنی نوٹ بک میں تیزی سے کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔ اسکے مرمریں ہاتھوں میں سنہری کیپ والا پین شاید اپنی قسمت پر رشک کر رہا تھا۔ اے کاش میں..... (لیکن اگلے ہی لمحے اسے اپنی بے تکی سوچ پر خود ہی ہنسی آ گئی) ''یار دیوانہ ہوا ہے کیا؟'' ساجد نے اسے آنکھیں موندے مسکراتے دیکھ کر ٹہوکا دیا۔ اچھا تو جناب فلسفے کی ان بلندیوں پر پہنچ چکے ہیں جہاں دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں رہتی یا پھر بقول غالب

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ساجد نے اسے خلاؤں میں گھورتے دیکھ کر کہا۔ اسے کیا معلوم کہ وہ فلسفۂ عشق کی کن پنہائیوں میں ڈوب کر اُبھر رہا ہے۔

اسے یونیورسٹی میں آئے چھ ماہ ہو چکے تھے لیکن اب تک اس نے کسی کو دوست نہ بنایا تھا جبکہ دوستی کے بہت سے ہاتھ اس کی طرف بڑھے تھے۔ شاید وہ کم گو اور تنہائی پسند تھی۔ یہ بات بہرحال اپنی جگہ اٹل تھی کہ وہ بے تحاشا حسین تھی..... شاید مغرور ہو اپنے حسن اور دولت پر..... لیکن دل کوئی ایسی توجیح ماننے پر آمادہ نہ تھا۔

اس دن موسم کچھ زیادہ ہی خوبصورت ہو رہا تھا، آسمان قوس قزح کے رنگوں سے مزین اور بارش کے بعد موسم بے حد پرکیف ہو رہا تھا یا پھر اس کی سوچ کا اثر تھا آج..... اس نے پہلی بار اسے مخاطب کیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے اپنی سالگرہ کا دعوتی کارڈ اسے تھمایا تھا اور ضرور آنے کی تاکید بھی کی تھی۔ آج وہ پہلی بار اس کی آواز سن رہا تھا۔ اس کے گرد و پیش میں گویا جلترنگ سے بج اٹھے لیکن جب ساجد نے اسے بتایا کہ اس نے تقریباً سارے ڈیپارٹمنٹ کو بلایا ہے تو اس کے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا۔ وہ جو دعوتی کارڈ تھامے جذبوں کی کہکشاں میں معلق تھا، یکا یک زمین پر آ رہا اور بسیار کوشش کے سالگرہ میں نہ جا سکا۔

اگلے دن اس نے بطور خاص اس سے نہ آنے کا گلہ کیا تو اس سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرنا پڑا لیکن وہ سچ مچ افسردہ ہو گئی ''اب کیسے ہیں آپ.....؟'' اس کے استفسار پر وہ سٹپٹا گیا۔

اور پھر گفتگو کا سلسلہ چل نکلا لیکن بات صرف تعلیمی سرگرمیوں تک محدود رہتی۔ سینے میں جذبوں کا تلاطم چھپائے وہ اچھے دوستوں کی طرح ملتے رہے۔ دو سال پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ اپنے جذبوں کو وہ کوئی نام نہ دے سکا۔ فائنل امتحان سر پر آ گئے تو اس پر ایک ہی دھن سوار تھی۔ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے کا غم اسے مار ڈال رہا تھا۔ اس دن آخری پیپر تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد وہ چلی گئی۔ بسیار کوشش کے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ بس لٹا لٹا سا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ زندگی عجیب بے کیف سی ہو گئی تھی۔

وہ گھٹنوں ایزل پر جھکا کینوس پر اسکے نقوش ابھارنے کی کوشش کرتا لیکن رنگ اس کا ساتھ چھوڑ جاتے۔ اس کا تصور دھندلانے لگتا اور بسیار کوشش کے وہ اس کی ایک بھی تصویر نہ بنا سکا۔ رزلٹ آیا تو اس کی فرسٹ ڈویژن آئی تھی۔ پھر غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم دوراں نے بھی آ لیا۔ جلد ہی اسے ایک پرائیویٹ فرم میں معقول مشاہرے پر ملازمت مل گئی۔ اکلوتا بیٹا تھا، برسرروزگار ہوا تو ماں کے دل کی دیرینہ خواہش (سہرا سجانے کی) عود کر آئی۔ ماں نے اس پر شادی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا لیکن اس کے لیے یہ خیال ہی روح فرسا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''امی جان کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ میری شادی کا خیال چھوڑ دیں۔ مجھے نہیں کرانی شادی وادی۔'' وہ جھنجھلا گیا۔ اس کی ماں جو بڑی دیر سے مختلف رشتوں کے حوالے سے اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی، اس کے رویے پر یکدم اداس ہو گئی۔ ان کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔ وہ جو بے حد حساس تھا، ماں کی پرنم آنکھوں میں مایوسی کے سائے دیکھ کر پسیج گیا اور ماں کو ان کی آرزو پوری کرنے کا عندیہ دے کر شانت ہو گیا اور گھر میں شادی کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ زیورات، پارچات کی تیاری میں اس کی ماں مگن تھی۔ کزنز کا ہر دم ڈھولک کی تھاپ پر نغمے بکھیرنا اس کی والہانہ وابستگی کا غماز تھا۔ وہ ان ہنگاموں سے گھبرا گھبرا جاتا۔ اُف میں کیسے کر پاؤں گا یہ منافقت..... وہ اپنے تئیں اپنا سب کچھ اس کے نام کر چکا تھا۔ اس کا وجود محض ایک کھوکھلا سراپا تھا۔ جذبوں سے یکسر بے نیاز تین سال سے اسے اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا تھا۔ پوچھتا بھی تو کس سے؟ اس نے تو اپنے اس جذبے کو سب سے چھپا کر رکھا تھا حتیٰ کہ اپنے اکلوتے دوست ساجد سے بھی۔

وہ جو اس کے جذبات سے یکسر بے خبر تھی لیکن وہ اپنا سب کچھ اس کے نام کر چکا تھا۔ کسی اور کا تصور بھی اس کے لیے محال تھا لیکن امی کی ضد سے مجبور ہو کر وہ ہاں کر بیٹھا لیکن جوں جوں شادی کے دن قریب آ رہے تھے اس کا دل بیٹھا ہی جا رہا تھا۔ اس کی وحشت سوا ہوتی جا رہی تھی۔ ڈھولک کی تھاپ پر گائے جانے والے گیت اسے صورِ اسرافیل سے کم نہ لگتے تھے۔ بارات کا دن آ پہنچا۔ اس کی امی اسے تیار ہونے کا کہہ رہی تھیں اور وہ خالی خالی نگاہوں سے خلا میں جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کے جی میں آئی کہ وہ کہہ دے کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی، مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا ایک معصوم لڑکی کی زندگی بے رنگ کرنے کا۔ میں اسے کچھ نہیں دے سکتا میں تو اپنا سب کچھ کسی اور کے نام وقف کر چکا لیکن اس کے ارادے بھانپ کر ماں کی پرنم ملتجی آنکھیں پھر سامنے آ گئیں..... اس نے ایک بار پھر ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ کچھ بھی نہ کر سکا اور سب کے اشاروں پر ناچتا رہا۔ سب ہی رسمیں ہوئیں۔ جذبات سے عاری وہ سب نبھائے گیا۔ سالیوں کی چھیڑ چھاڑ سے تو وہ عاجز ہی آ گیا۔ دلہن کے گھر سے رخصتی کے بعد جب وہ واپس لوٹ رہے تھے تو اسے اپنے پہلو میں بیٹھی دلہن پر بے تحاشا ترس آ رہا تھا۔ نجانے کیا ارمان ہوں گے بیچاری کے لیکن میں تو ایک تہی داماں اسے کیا دے پاؤں گا..... اچانک اس کی نظر سامنے سے آتی ہوئی کار پر پڑی۔ وہ اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ ہوش آیا تو خود کو پٹیوں میں جکڑے ہسپتال کے بستر پر پڑے پایا۔ اسی لمحے اس کے کانوں میں ڈاکٹر کی آواز آئی جو شاید ابا جان سے کہہ رہا تھا کہ ہمیں افسوس ہے یزدانی صاحب! ہم آپ کی بہو کو نہیں بچا پائے۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر ڈاکٹر اس کے نزدیک آ گیا۔ اسے کچھ زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ ڈاکٹر نے جنازے میں شرکت کی اجازت دیدی۔ اسے گھر لے جایا گیا تو میت تیار تھی۔ اس کی ماں نے بڑے ضبط سے اسے دلہن کا منہ دکھایا۔

عجب رونمائی تھی..... وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ اسے ملی بھی تو کس حال میں اب جبکہ اس کی خوبصورت آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں۔ وہ اس کی ہوتے ہوئے بھی اس کی نہ تھی۔ اس نے اسے پا کر کھو دیا تھا۔ اف میں کتنا بدنصیب ہوں۔ وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سسک دیا۔ اسے پھر علاج کے لیے ہسپتال لے جایا گیا۔ تب اس کی ماں نے ایک سیاہ جلد کی ڈائری اسے تھمائی جو ثنا نے مرتے وقت اسے دینے کو کہا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے ڈائری کے ورق الٹنا شروع کیے۔

یونیورسٹی میں داخلے کی تاریخ سے ڈائری شروع کی گئی تھی۔ لکھا تھا ''آج پاپا مجھے یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے لیے لے کر گئے۔ اب زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوگا۔ نئی دنیا، نئے ساتھی، پچھلا سب ختم۔ اپنے گروپ کی ایک بھی لڑکی نے آگے داخلہ نہیں لیا۔ سب ادھر ادھر بکھر گئیں۔ اف کتنا روح فرسا خیال ہے، اتنی بڑی یونیورسٹی میں کوئی بھی تو شناسا نہیں۔ چلو بنا لیں گے یہاں بھی دوست..... ارے ہاں ایک بات تو میں بھول گئی۔ جب میں پاپا کے ساتھ پرنسپل کے آفس میں بیٹھی تھی تو ایک نوجوان کسی کام سے آفس میں آیا تھا۔ اُف وہی بالکل وہی..... میرا آئیڈیل..... رحما تو کہتی تھی کہ آئیڈیل ملا نہیں کرتے یہ سب خیالی باتیں ہیں لیکن مجھے تو.....''

اس کے بعد کئی صفحے خالی تھے۔ پھر لکھا تھا ''آج سے میں نے کلاسز جوائن کر لی ہیں۔ ہائے کتنی خوش قسمت ہوں میں..... وہ اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔ اف میں بھی کتنی دیوانی ہوں اسے اپنا سمجھ لیا۔ چاہے وہ.....''

آگے کئی صفحے پھر خالی تھے۔ پھر درج تھا ''آج وہ نہیں آیا۔ معلوم نہیں کیوں؟ کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتی۔ اف توبہ یہاں کی لڑکیاں تو معمولی سی بات کو سکینڈل بنا دیتی ہیں۔ اسی لیے میں اب تک کسی سے دوستی نہیں کر سکی۔ جانے وہ مجھے اتنا اپنا اپنا سا کیوں لگتا ہے.....؟''

پھر تقریباً روزانہ ہی ڈائری لکھی گئی تھی۔ انمول جذبوں کو زبان دی گئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایک دن ہم ضرور ملیں گے۔ نہایت سرعت سے اس نے ساری ڈائری پڑھ ڈالی۔ سالگرہ کے حوالے سے اس نے لکھا تھا کہ صرف اس کی خاطر پورے ڈیپارٹمنٹ کو بلایا۔ اس کے نہ آنے سے وہ کتنی دلبرداشتہ ہوئی۔ اس کے جذبات جان کر اس کے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا۔

وہ اپنے جذبوں کی صداقت پر یقین رکھتی تھی۔ تبھی تو اس نے ان دنوں کی ڈائری سنبھال کر رکھی تھی۔

بعد کے حالات امی سے معلوم ہوئے۔ اس کے والد امی کے منہ بولے بھائی تھے۔ بے انتہا امیر بھی تھے اس لیے خاندان والوں سے میل جول نہ تھا۔ پھر گردش حالات نے ان سے سب چھین لیا۔ کاروبار میں زبردست نقصان ہوا۔ پھر رشتہ داروں نے سہارا دیا۔ جب اس کی ماں نے ان سے رشتہ مانگا تو ان سے انکار کرتے نہ بن پڑی اور جب اسے لڑکے کی تصویر دکھائی گئی تو وہ جذبوں کی سچائی کی تہہ دل سے قائل ہوگئی۔ اس نے یہ ڈائری اسے تحفتاً دینے کی نیت کر لی۔ کبھی کبھی اس کے دل میں خیال آیا کرتا کہ پتہ نہیں میرے لیے اس کے بھی یہی جذبات ہیں یا وہ..... اس کے آگے وہ سوچ ہی نہ سکتی تھی۔

لیکن..... کاتب تقدیر کا لکھا کون مٹا سکتا ہے۔ منزل پا کر بھی وہ تشنہ کام رہ گیا۔ وہ حیران تھا۔ الٰہی یہ کیسا ملاپ ہے! اس نے سوچا۔ یہ کیسی قربت ہے..... کہ وہ میرے اتنا نزدیک آ کر اتنا دور چلی گئی۔ اُف یہ فاصلے.....

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا

.....❁.....❁.....

ظالم مہمان

نواز خان

ظالم مہمان

نواز خان

نہ جانے اس نے اسے کیا کہہ دیا تھا کہ وہ غصے اور شرم سے سرخ ہو کر اُلٹے قدموں واپس چلی گئی تھی.....!

انسپکٹر نواز کی زندگی کا ایک ناقابل فراموش تجربہ

پولیس والوں کی بھی ایک نجی زندگی ہوتی ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح ان کے رشتہ دار اور عزیز و اقارب بھی ہوتے ہیں۔ زیرِنظر کہانی ایسے ہی کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔ ان دنوں میں سب انسپکٹر تھا۔ جالندھر کے ایک تھانے کا سب انسپکٹر رگھبیر سنگھ میرا گہرا دوست تھا۔ میں اس سے ملنے جالندھر گیا ہوا تھا۔ رگھبیر سے ملاقات کر کے میں دوپہر کوئی گیارہ بجے تھانے سے نکلا۔ اس وقت میں سادہ کپڑوں میں تھا۔ ابھی مشکل سے میں نے تھانے کا گیٹ پار کیا تھا کہ میری نظر ایک عورت پر جم گئی۔ وہ تھانے ہی کی طرف آ رہی تھی لیکن مجھے دیکھ کر وہ یکدم ٹھٹھک گئی تھی۔ اس نے چمکدار سیاہ ساٹن کا برقعہ پہن رکھا تھا۔ نقاب سے اس نے چہرے کو اس طرح ڈھانپ رکھا تھا کہ صرف آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ چہرے کا یہ کھلا حصہ بتا رہا تھا کہ وہ سفید رنگت کی ایک خوش شکل عورت ہے۔ جسم بھی متناسب تھا۔ گیٹ پر کھڑا سنتری بڑے شوق سے اس عورت یا کہہ لیجئے کہ لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ خوبصورت عورت تو کہیں بھی چلی جائے نگاہوں کا مرکز بن جاتی ہے مگر تھانے اور کچہری جیسے خشک اور دفتری ماحول میں تو کوئی خوبصورت عورت چلی آئے تو لگتا ہے کانٹوں والی جھاڑی میں اچانک پھول اُگ آیا ہو یا حبس زدہ گرم دوپہر میں کہیں سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا چلا آئے۔

وہاں مصروف کار اہلکاروں کے چہرے کھل اُٹھتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی ساری دفتری وغیر دفتری پریشانیاں یکدم دُور ہو گئی ہوں۔ خوبصورت عورت کو تھانے کی طرف آتے دیکھ کر سنتری کی آنکھوں میں بھی ایسی ہی ''والہانہ'' دلچسپی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاگی تھی لیکن اس کی یہ دلچسپی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی کیونکہ عورت مجھے دیکھ کر نہ صرف رُک گئی تھی بلکہ اب پوری طرح میری طرف متوجہ تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اس کی آنکھیں کچھ جانی پہچانی سی لگیں۔ پھر اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر میں اپنے راستے پر چل دیا۔ جب میں اس کے قریب سے گزرا تو وہ دو تین قدم اٹھا کر میری طرف چلی آئی اور بولی ''رُکیے..... میری بات سنیے۔''

لڑکی کی آواز نے جیسے میرے قدم پکڑ لیے۔ یہ آواز بھی میری سنی ہوئی لگتی تھی۔ میں جلدی سے لڑکی کی طرف گھوما اور اس وقت میں نے اسے پہچان لیا۔ لڑکی کی آواز اور آنکھوں نے مل کر مجھے اس کی شناخت کروا دی تھی اور اب میں ششدر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بولی ''میں شہناز ہی ہوں۔ آپ..... آپ یہاں کیسے؟''

شہناز کے سوال اور میرے جواب میں ایک یا دو سیکنڈ کا وقفہ تھا لیکن اس وقفے میں میرا ذہن کہاں کہاں کی خاک چھان گیا..... شہناز والدہ کی طرف سے میری دور کی رشتہ دار تھی۔ میری والدہ کی بہت خواہش تھی کہ شہناز کو اپنی بہو بنائیں۔ آخر ایک چھوٹی سی تقریب میں انہوں نے شہناز کے ساتھ میری منگنی کر دی۔ یہ کوئی چار سال پہلے کی بات ہے۔ مجھے اپنی والدہ سے بے پناہ محبت تھی۔ شہناز ان کی پسند تھی تو مجھے پسند کیوں نہ ہوتی! ویسے بھی میں نے اسے قریب سے دیکھا تھا، اس سے گفتگو کی تھی، وہ مجھے ہر طرح باوقار اور سمجھدار لڑکی لگی تھی لیکن پھر حالات ایسے ہوئے کہ یہ منگنی برقرار نہ رہ سکی۔ میں ان واقعات کی تفصیل میں جا کر آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ بہرحال یوں سمجھ لیں کہ والدین کے کیے کی سزا اولاد کو بھگتنا پڑی۔ شہناز بہت اچھی لڑکی تھی مگر کچھ وجوہات تھیں کہ میری والدہ اسے بہو بنانے کی خواہش پوری نہ کر سکیں۔ اس منگنی کے ساتھ میری بہت سی تلخ و شیریں یادیں وابستہ تھیں..... آج چار سال بعد شہناز کو یوں اچانک دیکھا تو وہ ساری یادیں ایک ساتھ تازہ ہو گئیں..... شہناز کا سوال ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ ''آپ یہاں کیسے؟''

میں نے کہا ''یہاں میرا ایک دوست ہے اس سے ملنے آیا تھا..... لیکن تم یہاں؟''

شہناز کی آنکھوں میں ایک سایہ سا لہرا گیا۔ وہ کچھ دیر تذبذب میں میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی ''آپ اکیلے ہیں؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولی ''پلیز ذرا میرے ساتھ آیئے۔''

''لیکن کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے گھر۔'' اس نے جواب دیا۔

اس کے جواب سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی شادی ہو چکی ہے مگر اس وقت سڑک پر کھڑے ہو کر ایسے سوال جواب نہیں کیے جا سکتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ شہناز بہت پریشان ہے۔ جہاں تک میں نے دیکھا تھا وہ تھانے کی طرف آ رہی تھی۔ تھانے کی طرف آدمی اسی وقت آتا ہے جب اس کے ساتھ کوئی بہت بڑی مصیبت ہوتی ہے۔ شہناز کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میں سوچنے لگا یقیناً اس وقت وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہے۔ اس کے لہجے، اس کی چال اور حرکات سے یہ بات صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ ''یہ مصیبت کس قسم کی ہو سکتی ہے؟'' میرا ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ تھوڑا آگے جا کر شہناز نے ایک رکشہ رکوایا اور بولی ''پلیز نواز صاحب! میرے ساتھ آیئے۔ میں اس وقت بہت پریشان ہوں۔ آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔''

اب میرے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ میں اس کے ساتھ رکشے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم رکشے سے اُتر کر تین کمرے کے ایک چھوٹے سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مکان میں داخل ہو رہے تھے۔ مکان کو بہت اچھا نہیں تھا مگر اس کی سجاوٹ سے خاتون خانہ کی سلیقہ شعاری جھلکتی تھی۔ شہناز نے اپنا برقعہ اُتار دیا اور پہلی بار مجھے اس کو ٹھیک طرح دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ آج سے چار برس پہلے ہی کی طرح خوبصورت اور شاداب تھی مگر تھوڑی کمزور نظر آ رہی تھی۔ شاید ایسا پریشانی کی وجہ سے تھا۔ بہرحال اب وہ کسی کی بیوی تھی اور اس کے شوہر نامدار کی بڑی سی تصویر فریم میں جڑی ہوئی میز پر رکھی تھی لہٰذا میں اس تصویر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس دوران وہ باورچی خانے میں گئی اور شربت کا ایک گلاس بنا کر لے آئی۔ مجھے شربت تھماتے وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

اس کے بعد ہماری تفصیلی گفتگو ہوئی۔ شہناز نے مجھے بتایا کہ اس کے شوہر کا نام سیف اللہ ہے۔ وہ ریلوے پولیس میں سب انسپکٹر تھا۔ پھر اس نے نوکری چھوڑ دی اور اپنا ذاتی کام کر لیا۔ اس شہر میں آئے انہیں ڈیڑھ مہینہ ہی ہوا تھا۔ اپنے بارے میں بتانے کے بعد شہناز نے میرے متعلق پوچھا۔ اس دوران میں اندازہ لگا چکا تھا کہ شہناز کی پریشانی کا تعلق اس کے شوہر سے ہے اور یہ پریشانی ایسی ہے جس کے متعلق وہ کسی کو بتاتے ہوئے بھی ڈرتی ہے۔ اگر میں اسے اپنا پیشہ بتا دیتا تو شاید وہ بات چھپا جاتی۔ میں نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ سوائے اس کے کہ میں پولیس میں ہوں۔ میرا یہ فیصلہ بعد میں بہت سودمند ثابت ہوا..... شہناز نے میری بات سننے کے بعد کہا "نواز..... میں آپ کو کبھی تکلیف نہ دیتی لیکن اس نئے شہر میں آپ کو دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے میرا کوئی بہت قریبی مل گیا ہو۔ آپ تو جانتے ہیں یہاں آئے ہوئے ہمیں چھ سات ہفتے ہی ہوئے ہیں، اڑوس پڑوس میں بھی کوئی میل ملاقات والا نہیں۔ میں یہاں خود کو بالکل اکیلا محسوس کرتی ہوں۔ جب سے ہم یہاں آئے ہیں سیف کچھ پریشان سے تھے۔ پہلے تو میں سمجھتی رہی کہ نیا کام شروع کرنے کی الجھن ہے لیکن پھر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کچھ گھبرائے سے رہتے ہیں۔ رات کو اُٹھ اُٹھ کر دیکھتے تھے کہ دروازے کھڑکیاں وغیرہ اندر سے بند ہیں! کوئی کہیں چھپا تو نہیں ہوا۔ کچھ روز پہلے کہیں سے رکھوالی کے لیے ایک بڑا سا کتا بھی لے آئے۔ اس نے بھونک بھونک کر محلے والوں کی ناک میں دم کر دیا۔ مجبوراً اسے واپس لے گئے۔ کوئی ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے، آدھی رات کے وقت ایک آدمی انہیں بلانے آیا۔ اس کے ساتھ چلے گئے۔ اگلے روز واپس آئے تو چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے اور قمیص بھی پھٹی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگے کہ میں ٹھوکر لگنے سے گر گیا تھا۔ میں نے کہا گرنے سے قمیص تو نہیں پھٹتی۔ اس بات پر غصہ آ گیا اور مجھ پر برسنے لگے۔ پرسوں مجھ سے کہنے لگے شہناز! اگر مجھے کچھ ہو جائے تو تم کیا کرو گی؟ میں نے اس بات پر انہیں ڈانٹا تو بات گول کر گئے۔ کل صبح پھر وہی آدمی انہیں لینے آیا۔ مجھ سے کہنے لگے کہ میں ایک دو گھنٹے تک آ جاؤں گا۔ زیادہ دیر ہوئی تو دوپہر تک پہنچ جاؤں گا..... اب دوسری دوپہر بھی آ گئی ہے اور ان کا کوئی پتہ نہیں۔"

شہناز نے یہاں تک کہا اور ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔

میں نے اسے تسلی دی اور کہا "گھبراؤ مت! میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

وہ کہنے لگی "یہ آپ کی مجھ پر بہت بڑی مہربانی ہوگی۔ عورت ذات ہوں، مجھے کچھ سجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کروں۔ پتہ نہیں کیا معاملہ ہے۔ بہت زیادہ پریشان ہو کر تھانے گئی تھی لیکن ڈر رہی تھی کہ خدا جانے مجھے یہ بات پولیس کو بتانی چاہیے یا نہیں۔

آپ کو دیکھا تو میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہیں آپ کے سامنے رونا شروع کر دوں۔"

میں نے کہا "شہناز! گھبراؤ نہیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہارے سسرال والے کہاں ہیں؟"

وہ بولی "سسرال اور میکہ دونوں امرتسر میں ہیں۔ پہلے میرے دل میں بھی آئی تھی کہ امرتسر جاؤں لیکن پھر سیف کی ناراضگی کا خیال آ گیا۔ پتہ نہیں وہ یہ بات پسند کریں گے یا نہیں۔ ویسے بھی میرے سسر طبیعت کے بہت سخت ہیں۔ بیٹے سے ان کی بالکل نہیں بنتی۔"

میں نے شہناز سے سیف کی دکان کا پتہ پوچھا اور اسے کہا کہ میں دکان کا چکر لگا کر تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ اس دوران اگر سیف آ جائے تو ٹھیک ورنہ پھر میں امرتسر جاؤں گا۔ شہناز سے رخصت ہو کر میں سیدھا تھانے پہنچا۔ رگھبیر سنگھ مجھے دوبارہ اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں اسے بتا کر گیا تھا کہ دس پندرہ روز کے لیے شملہ جا رہا ہوں۔ دراصل ہمارے ڈی آئی جی صاحب نے مہربان ہو کر میری ایک ماہ کی چھٹی منظور کی تھی۔ دس روز تو میں لاہور ہی میں والدین کے پاس گزار آیا تھا۔ اب سوچا تھا کہ شملہ دیکھنے کی دیرینہ خواہش بھی پوری کر ڈالوں۔ رگھبیر سنگھ کی حیرانی بجا تھی۔ میں نے اس سے ایک حوالدار سادا کپڑوں میں لیا اور موٹر سائیکل پر بٹھا کر اسے شہناز کے گھر لے گیا۔ میں نے اس کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ چوکس ہو کر اس گھر کا پہرہ دے۔ دراصل شہناز کے بتائے ہوئے حالات میں ضروری تھا کہ اس کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔

اس کے بعد میں سیف کی دکان پر پہنچا۔ اندرون شہر ایک بارونق بازار میں اس نے موٹروں کے فالتو پرزوں کی دکان خریدی تھی۔ شہناز کے مطابق یہ دکان اس نے چلتی ہوئی لی تھی یعنی بمعہ سامان۔ پگڑی سمیت اس نے پچاس ہزار روپیہ ادا کیا تھا۔ اب یہ سوچنے کی بات تھی کہ ایک ریلوے انسپکٹر پچاس ہزار روپے یکمشت کیسے ادا کر سکتا ہے، تاہم شہناز کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے شوہر پر کسی طرح کا شک نہیں ہے۔ میں نے اردگرد کے دکانداروں سے معلومات حاصل کیں۔ انہوں نے بتایا کہ دکان دو روز سے نہیں کھلی۔ سیف اللہ نے ایک لڑکا بھی ملازم رکھا ہوا تھا۔ وہ اس وقت بھی دکان کے تھڑے پر بیٹھا تھا۔ اس نے کہا سیف صاحب نے اسے آخری بار کچھ نہیں بتایا۔ لڑکے کو سیف کے گھر کا بھی علم نہیں تھا۔ یہاں سے میں نے جو معلومات حاصل کیں ان سے میرے اس اندازے کی تصدیق ہوئی کہ کوئی شخص سیف کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ لڑکے نے بتایا "چار پانچ روز پہلے کی بات ہے، دو آدمی دکان میں آئے۔ وہ شکل سے خطرناک لگتے تھے۔ انہیں دیکھ کر سیف صاحب ایک دم گھبرا گئے۔ سیف صاحب نے مجھے چائے لانے کے لیے بھیج دیا۔ میں چائے لے کر واپس آیا تو سیف صاحب ان دونوں آدمیوں کے ساتھ دکان کے پچھلے حصے میں تھے۔ میں نے اندر داخل ہونے سے پہلے سنا ایک شخص سیف صاحب کو دھمکیاں دے رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اگر بھاگنے کا شوق ہے تو بھاگ کر دیکھ لو لیکن ہمارا مال تمہیں ہضم نہیں ہوگا۔ میں اندر داخل ہوا تو سیف صاحب کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ میں چائے رکھ کر باہر آ گیا۔ کچھ دیر بعد دونوں افراد چلے گئے۔ اس روز سیف صاحب بہت پریشان رہے۔ شام کو بھی جلد ہی گھر چلے گئے۔ اس سے اگلے روز وہ کافی دیر سے دکان پر آئے۔ ان کے چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے..... میرا خیال تھا کہ ان کا کوئی کاروباری جھگڑا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے پوچھنے پر لڑکے نے بتایا کہ وہ سامنے آنے پر ان دونوں افراد کو اچھی طرح پہچان سکتا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس سے پہلے اس نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ لڑکا مجھے ہر بات تفصیل سے بتا رہا تھا۔ شاید وہ مجھے سیف کا کوئی قریبی عزیز سمجھ رہا تھا۔ میں نے اس کے گھر کا اتہ پتہ دریافت کیا اور چند روپے دے کر اسے واپس بھیج دیا۔ میں نے اسے کہا کہ پرسوں آ کر پتہ کرے دکان کھلی ہے یا نہیں، مجھے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ اس شاخسانے کی جڑیں جالندھر میں نہیں امرتسر یا کسی اور جگہ پر ہیں۔ کم از کم سیف اللہ کی نقل مکانی سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا۔

میں اسی وقت شہناز کے پاس پہنچا۔ سیف کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میں امرتسر جا رہا ہوں۔ ممکن ہے رات وہیں رہوں۔ کل کوئی اچھی خبر لے کر آؤں گا۔ شہناز کی حالت بہت پتلی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اس نے مجھ سے کہا ''نواز! اس معاملے کا سیف کے گھر والوں کو یا کسی اور کو پتہ نہیں چلنا چاہیے۔ سیف اس بات کو چھپانا چاہتے تھے۔ یہ نہ ہو بات نکل جانے سے انہیں کوئی نقصان پہنچے۔''

میں نے شہناز کو ایک بار پھر تسلی دی اور بذریعہ بس جالندھر سے امرتسر روانہ ہو گیا۔ شہناز کے سسرال تلاش کرنے میں مجھے کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ ایک بارونق علاقے میں ان کا دومنزلہ مکان تھا۔ سیف کا باپ بھی ریلوے کا ریٹائرڈ ملازم تھا۔ میری دستک پر اس نے دروازہ کھولا۔ میں نے اسے کہا کہ میں سیف کا ایک دوست ہوں، اس سے ملنے آیا ہوں۔ بوڑھے نے بے رُخی سے جواب دیا، سیف اب یہاں نہیں رہتا۔ اتنے میں ایک نوجوان لڑکا دروازے پر آ گیا۔ میں نے شہناز کے ہاں سیف کی تصویر دیکھی تھی۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ لڑکا شہناز کا دیور یعنی سیف کا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ کچھ اخلاق سے پیش آیا اور اس نے میرے لیے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔

لڑکے کی باتوں سے پتہ چلا کہ وہ بھی ریلوے پولیس میں سب انسپکٹر ہے۔ اس کا نام پرویز تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی یعنی سیف کی بہت عزت کرتا تھا۔ اس کے گھر چھوڑ جانے پر وہ خاصا افسردہ تھا۔ ان لوگوں کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ سیف کہاں ہے۔ پچھلے دو ماہ میں پرویز نے بڑے بھائی کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہوا تھا۔ میں نے کچھ دیر گفتگو کے بعد اندازہ لگا لیا کہ پرویز کو اعتماد میں لے کر بات کی جا سکتی ہے۔ بہرحال میں اسے سیف کے ٹھکانے سے آگاہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ کسی نامعلوم جگہ سے سیف کی بیوی کا خط آیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ سیف گھر سے غائب ہے اور ہو سکتا ہے وہ امرتسر میں کہیں ہو۔ اس نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں اسے امرتسر میں کہیں ڈھونڈوں۔''

سیف کی گمشدگی کا سن کر پرویز ایک دم پریشان نظر آنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس سلسلے میں وہ کس پر شک کر سکتا ہے۔ پرویز گہری سوچ میں ڈوب گیا..... کہنے لگا: ''نواز صاحب! مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتی۔ سب سے زیادہ حیرانگی تو اس بات کی ہے کہ انہوں نے اچانک نوکری چھوڑ دی۔ پھر گھر بھی چھوڑ کر چلے گئے۔ ابا جان سے ان کے اختلافات تھے لیکن اتنے زیادہ بھی نہیں تھے کہ انہیں علیحدہ گھر لینے کی ضرورت ہوتی۔ جہاں تک ان کی گمشدگی کا تعلق ہے تو میری سمجھ میں ایک ہی بات آتی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ امرتا سنگھ یا اس کے بھائیوں کا کام ہو۔''

''یہ امرتا سنگھ کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

میرے اس سوال پر پرویز کے چہرے پر ایک

رنگ سا آ کر گزر گیا۔ شاید اسے خیال گزرا تھا کہ اس نے ضرورت سے زیادہ بتا دیا ہے۔ بہرحال صورتحال ایسی تھی کہ وہ مجھ سے زیادہ کچھ چھپا بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر وہ بولا ''بھائی صاحب! امرتا ساتھ والی گلی کی ایک بدقماش لڑکی ہے۔ شادی سے پہلے نہ جانے کس طرح بھائی جان اس کے چنگل میں پھنس گئے۔ امرتا کا ایک بھائی ہرنام زبردست غنڈہ ہے۔ اس نے ایک دو دفعہ بھائی جان کو دھمکیاں بھی دی تھیں۔ لڑکی کا چاچا بھی بڑا خبیث شخص ہے۔ ہو سکتا ہے انہی لوگوں نے بھائی جان سے دشمنی لی ہو۔''

میں نے پرویز سے اس معاملے کی پوری تفصیلات معلوم کیں۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم دونوں امرتا سنگھ کے پاس جائیں لیکن میں نے اسے سمجھایا کہ وہ لوگ اسے پہچانتے ہیں۔ ہو سکتا ہے معاملہ خراب ہو جائے۔ اس لیے میں اکیلا جاتا ہوں اور اپنے طور پر کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر بات نہ بنی تو پھر دوسرا راستہ اختیار کریں گے۔ پرویز نے دوسری باتوں کی طرح میری یہ بات بھی مان لی۔

اس وقت رات کے تقریباً دس بجے تھے جب میں نے امرتا سنگھ کے دروازے پر دستک دی۔ تیسری یا چوتھی دستک پر ایک لڑکی نے دروازہ کھولا۔ شاید وہ نیند سے اُٹھ کر آئی تھی۔ اس کے بال بکھرے تھے اور لباس بے ترتیب ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی خوبصورت آنکھیں میرے چہرے پر گاڑیں اور تند لہجے میں بولی ''کس سے ملنا ہے؟''

''ہرنام ہے گھر میں؟'' میں نے پوچھا۔ اس نے نفی میں جواب دیا۔ ''تو چاچے سے ملوا دو۔'' میں نے کہا۔

میرا لہجہ ایسا تھا کہ وہ مجھے ہرنام یا چاچے کا کوئی قریبی جاننے والا سمجھ رہی تھی۔ اس نے کچھ کہے بغیر منہ پھیرا اور اندر چل دی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا، اس کے انداز سے کچھ پتہ نہیں چلا تھا کہ وہ مجھے دروازے پر ٹھہرنے کا کہہ کر گئی ہے یا پیچھے آنے کا حکم دے گئی ہے تاہم پیچھے جانا میرے لیے بہتر تھا۔ میں تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے برآمدے تک پہنچ کر ایک بار مڑ کر میری طرف دیکھا پھر مخمور آواز میں بولی ''چاچا! باہر نکل۔'' اس نے دو تین آوازیں دیں لیکن نہ تو چاچا باہر نکلا اور نہ کمرے کا بند دروازہ کھلا۔ لڑکی نے آگے بڑھ کر دروازے کو دھکا دیا۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور چاچا چارپائی پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ اس کا ایک بازو چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا۔ قریب ہی شراب کی بوتل لڑھکی پڑی تھی۔ بوڑھے کے جسم پر میلا کچیلا کرتہ پاجامہ تھا۔ واسکٹ دیوار پر لٹک رہی تھی۔ بوڑھے کے سرہانے تپائی پر پگڑی کے ساتھ اس کی عینک رکھی تھی۔ ''چاچا'' پڑھا لکھا بھی معلوم ہوتا تھا۔ لگتا تھا ریٹائرڈ دفتری ملازم ہے۔ اس کے سونے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ شدید نشے میں ہے۔ لڑکی وہیں دروازے پر کھڑی ہو کر چلائی۔

''چاچا! اُٹھ تجھ سے کوئی ملنے آیا ہے۔''

چاچا ذرا سا کسمسایا۔ پھر اس نے ہاتھ لہرا کر نجانے کس کی ماں بہن سے رشتہ جوڑا اور کروٹ بدل کر خراٹے لینے لگا۔

''مل لے چاچے سے۔'' لڑکی جلے کٹے انداز میں بولی۔ ''یہ نہیں اُٹھے گا کل دوپہر سے پہلے۔''

میں نے غور سے لڑکی کا سراپا دیکھا۔ وہ لباس اور لب و لہجے کے اعتبار سے شریف عورتوں سے دور اور بازاری عورتوں سے قریب تھی۔ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ''امرتا سنگھ! میں تم لوگوں سے سیف اللہ کا پتہ پوچھنے آیا ہوں۔''

اس سوال پر لڑکی کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ بال جھٹک کر بولی ”ہم کیا جانیں اس کے بارے میں.....لیکن تم کون ہو؟“

”میں کوئی بھی ہوں لیکن یہ سمجھ لو کہ میں تم سے سیف کا پتہ پوچھ کر جاؤں گا۔ بتاؤ کہاں چھپایا ہے تم لوگوں نے اسے؟“

لڑکی بولی ”تم نشے میں تو نہیں ہو۔ جاتے ہو کہ بلاؤں محلے والوں کو؟“

میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا اور لپک کر اسے دبوچ لیا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے منہ پر جم چکا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں میں نے اس کا بازو پکڑا اور گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے گیا۔ یہ کمرہ دوسرے کمروں سے زیادہ محفوظ تھا۔ لڑکی بری طرح مچل رہی تھی اور دانتوں سے میری ہتھیلی پر کاٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا ”شور کی کوشش کرو گی تو کھال ادھیڑ دوں گا۔ میں سی آئی ڈی سٹاف کا سب انسپکٹر ہوں۔ تمہارا یہ اڈہ عرصے سے ہماری نگاہوں میں تھا یہاں جو کچھ ہوتا ہے سب ہمیں معلوم ہے۔ خیریت چاہتی ہو تو چپ چاپ سامنے کرسی پر بیٹھ جاؤ اور ہاں یہ بات ذہن سے نکال دو کہ شور کر کے محلے والوں کو بلاؤ گی اور مجھ پر دست درازی کا الزام لگاؤ گی۔ ہمارے آدمی باہر موجود ہیں۔“

اب لڑکی کی آنکھوں میں خوف نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹایا تو وہ بولی ”تم..... تم جھوٹ بولتے ہو۔“ میں نے اس کا شک رفع کرنے کے لیے ایک زور کا تھپڑ اس کے منہ پر جمایا۔ وہ لڑکھڑا کر کرسی پر گر گئی۔ میں نے اپنا شناختی کارڈ اس کی جھولی میں پھینک دیا جس پر تصویر لگی تھی۔ لڑکی کا چہرہ زرد ہو گیا۔

وہ ہکلا کر بولی ”انسپکٹر صاحب! گرو جانتا ہے ہم بے گناہ ہیں۔ کسی نے ہمارے خلاف شرارت کی ہے۔ ہم شریف لوگ ہیں۔“

میں نے کہا ”ایک تو وہ شریف ہے تیرا چاچا جو ساٹھ روپے بوتل والی ولایتی شراب پی کر لیٹا ہوا ہے اور دوسرا تیرا بھائی ہرنام ہے جو آخری شو دیکھ کر آنے والوں کے لیے کہیں مورچہ لگا کر بیٹھا ہوگا تاکہ ان کی گھڑیاں اُتروا سکے اور ان کی جیبیں صاف کر سکے۔“

لڑکی کو اب یقین آ چکا تھا کہ میں واقعی پولیس والا ہوں اور ضرورت سے زیادہ جانتا ہوں۔ اس نے کوشش کر کے اپنی گھبراہٹ پر قابو پایا اور بولی ”انسپکٹر صاحب! آپ تو اتنے غصے میں ہیں کہ آپ سے بات کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ ذرا آرام سے بیٹھیں۔ میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں پوشیدہ پیغام میں صاف پڑھ سکتا تھا۔ یہ آنکھیں کہہ رہی تھیں، میں خوبصورت ہوں، جوان ہوں، میرے پاس بھی تمہارا منہ بند رکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔“ وہ بل کھا کر کرسی سے اٹھی اور بڑی بے خوفی سے مسکرا کر بولی ”انسپکٹر صاحب! آپ بیٹھیں تو سہی!“

یہی وہ لمحہ تھا جب میں اسے مکمل طور پر اپنے اثر میں لے سکتا تھا۔ میرا ہاتھ ایک بار پھر گھوما اور زناٹے کا تھپڑ اس کے نازک گال پر پڑا۔ اس دفعہ وہ چکرا کر رہ گئی اور جلدی سے خود ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے ہاتھوں سے اپنا کارڈ چھینتے ہوئے کہا ”میں ذرا دوسری طرح کا آدمی ہوں۔ زیادہ چالاک بنو گی تو شکل بگاڑ دوں گا۔“

”آخر کیا چاہتے ہو تم؟“ وہ روتی ہوئی بولی۔

”صرف سیف اللہ کا پتہ۔ اگر یہ بتا دو گی تو تمہارے دوسرے جرموں کی سزا کچھ کم بھی ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں یہ قصہ گول ہی کر جاؤں۔“

وہ آنسو بہاتی ہوئی بولی ”گرو کی قسم انسپکٹر! مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ میں نے دروازے کی طرف

بڑھتے ہوئے کہا ”میں ساتھیوں کو بھی اندر بلا لیتا ہوں۔ باقی باتیں تھانے میں ہوں گی۔“

وہ لپک کر میرے سامنے آئی اور لرزاں آواز میں بولی ”انسپکٹر! سیف کے گم ہونے سے ہمارا کوئی تعلق نہیں لیکن میں تمہیں ایک ایسے شخص کا نام بتا سکتی ہوں جو سیف کا پرانا دشمن ہے۔ اگر اس شہر سے کسی نے اسے اغوا کیا ہے تو وہ وہی ہو سکتا ہے۔ اس کا نام مختار علی ہے۔ وہ سٹیشن کے علاقے میں ایک ہوٹل چلاتا ہے۔“

میں نے کہا ”تجھے ان دونوں کی دشمنی کا کیسے علم ہے جبکہ کسی اور نے مجھے یہ بات نہیں بتائی۔“ میرے ذہن میں پرویز کا خیال آیا تھا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ مجھے ضرور بتاتا۔

لڑکی بولی ”اس بات کا علم مجھے اس لیے ہے کہ سیف نے مجھے خود بتایا تھا وہ جن دنوں یہاں آیا تھا اس نے کہا تھا کہ مختار علی ہم دونوں کے پیار کا دشمن ہے۔“

میں محسوس کر رہا تھا کہ لڑکی بتا کم رہی ہے اور چھپا زیادہ رہی ہے۔ بہرحال اس وقت یہ معلومات بھی کافی تھیں۔ یہ بات تو میں جان ہی چکا تھا کہ یہاں عیاشی کا اڈہ وڈہ کوئی نہیں چلتا نہ ہی ان لوگوں نے یہاں کوئی منشیات چھپا رکھی تھیں۔ یہ ماڈرن اور دولت مند بننے کی کوشش میں بگڑا ہوا ایک گھرانہ تھا۔ لڑکی آنکھ مٹکے لگاتی تھی۔ ایک بھائی راہزنی کی چھوٹی موٹی وارداتیں کرتا تھا اور چاچا شراب نوشی کی لت کا شکار تھا۔ لڑکی کے دوسرے بھائی ہو سکتا ہے کوئی درمیانے درجے کا کاروبار کرتے ہوں۔

میں نے تھوڑا سا اور دباؤ ڈالا تو لڑکی نے مختار علی کے بارے میں بھی ایک انکشاف کر دیا۔ یہ انکشاف میری توقع کے عین مطابق تھا۔ لڑکی نے بتایا کہ مختار علی ہوٹل کی آڑ میں دراصل جوا خانہ چلاتا ہے.....

مختار علی کی طرف روانہ ہونے سے پہلے میں نے لڑکی کو ڈرایا دھمکایا کہ یہ باتیں وہ صرف اپنے تک محدود رکھے ورنہ اس کے حق میں برا ہوگا۔ لڑکی نے فوراً اقرار کر لیا۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ یہ سی آئی ڈی انسپکٹر اس سے کوئی رورعایت نہیں برتے گا۔

امرتا سنگھ کے گھر سے میں سیدھا مقامی تھانے پہنچا۔ ہندو ایس ایچ او پیشہ وارانہ گرمجوشی سے ملا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ میں مختار علی کے اڈے پر چھاپہ مارنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے کچھ آدمیوں کی ضرورت ہے۔ ہندو ایس ایچ او کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ مختار علی اور ایس ایچ او میں ”بھائی بندی“ ہے۔ مختار علی اسے ماہانہ پہنچاتا ہوگا اور ایس ایچ او اس کے بدلے اس کے اڈے کے پاس سے آنکھ بند کر کے گزر جاتا ہوگا۔ میں ”ہندو مسلم اتحاد“ کی اس اعلیٰ مثال کو نیست و نابود کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے اجازت لے کر چل دیا۔ ہندو انسپکٹر نے جاتے جاتے مجھے روک لیا۔ کہنے لگا ”نواز خان! دراصل مختار علی بڑی پہنچ والا آدمی ہے۔ اس کے ہوٹل پر چھاپہ مارنا آسان نہیں بہرحال میں ایسا کرتا ہوں تمہارے ساتھ کچھ سادہ کپڑوں والے کر دیتا ہوں۔ امید ہے تمہارا آدمی مل جائے گا اگر نہ ملا تو پھر سرکاری کارروائی کر لیں گے۔“

میں نے اس کی تجویز مان لی کیونکہ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ ایس ایچ او نے مضبوط ہاتھ پیر کے تین آدمی میرے ساتھ کر دیے۔ جاتے جاتے اس نے پھر تاکید کی کہ مختار علی کوئی معمولی شخص نہیں، خطرناک مجرم ہے۔ کوشش کرنا کہ معاملہ خراب نہ ہونے پائے۔

جس وقت میں مختار کے ہوٹل کی طرف روانہ ہوا رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ سیف کے بھائی پرویز کو بھی ساتھ لے لوں گا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن پھر میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ تھانے سے میں سیدھا ہوٹل پہنچا۔ بڑے سے دروازے پر مختار ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ کا بورڈ آویزاں تھا۔ اندر لمبوترے ہال کمرے میں اکا دکا میزوں پر گاہک بیٹھے تھے۔ میں بھی چپ چاپ ایک میز پر جا بیٹھا۔ میں سوچ رہا تھا مختار علی کیونکر سیف کو اغوا کر سکتا ہے۔ سیف کے ملازم لڑکے نے بتایا تھا کہ یہ کوئی لین دین کا معاملہ ہے جبکہ سیف اور مختار علی میں رقابت کا تعلق تھا..... میں بیٹھا سوچتا رہا اور سگریٹ پیتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد میرے ساتھی آئے اور ایک علیحدہ میز پر بیٹھ کر چائے کا آرڈر دینے لگے۔ میں غور سے ہوٹل کا جائزہ لے چکا تھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے ایک پہلوان نما شخص بیٹھا تھا اور سردست وہی منیجر کے فرائض انجام دے رہا تھا..... میں نے اس سے جا کر مختار کے متعلق پوچھا۔ وہ بڑے غور سے میرا چہرہ دیکھنے لگا۔

"کیا کام ہے تجھے مختار صاحب سے؟" اس نے بدتمیزی سے پوچھا۔

میں نے کہا "میں لاہور سے خاص طور پر ان سے ملنے آیا ہوں۔ ایک بندے کو ملازم رکھوانا ہے۔"

"اس وقت مختار صاحب نہیں مل سکتے۔" وہ خشک لہجے میں بولا۔

"مگر میرا ملنا ضروری ہے۔" میں نے اصرار کیا۔

اس شخص نے مجھے شک کی نظروں سے گھورا اور بولا "کس نے بھیجا ہے تمہیں؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا کاؤنٹر کے پیچھے پردہ ہلا اور ایک لمبا تڑنگا خطرناک صورت والا آدمی اندر آ گیا۔ پہلوان نما شخص نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کہتا ہے مختار صاحب سے ملنا ہے۔ کسی کو ملازم رکھوانا ہے..... اور مختار صاحب کو جانتا بھی نہیں۔ ابھی مختار صاحب اس کے سامنے سے گزر کر اندر گئے ہیں۔"

مجھے پہلی بار اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ لمبے تڑنگے شخص نے کڑی نظروں سے مجھے گھورا۔ پھر موٹے سے کہنے لگا "تلاشی لے اس کی۔"

موٹا گھوم کر کاؤنٹر سے باہر نکلا اور اس نے سیدھا میرے نیفے پر ہاتھ ڈالا۔ یہاں ریوالور کا ابھار صاف محسوس ہو رہا تھا۔ یہ لوگ میری توقع سے زیادہ ہوشیار تھے۔ میں نے جلدی سے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "کیا بات ہے میں تمہیں اٹھائی گیرا لگتا ہوں؟"

لمبے شخص نے ایک لفظ کہے بغیر ہاتھ بڑھایا اور میرے بال مٹھی میں جکڑ لیے لیکن یہ حرکت اسے بہت مہنگی پڑی۔ میں نے ایک جھٹکے سے کہنی اس کے پیٹ میں ماری اور داہنا مکہ اس کے جبڑے پر رسید کیا۔ میرے بال اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ مکہ اتنا زوردار تھا کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا عقبی الماری سے ٹکرایا۔ شو کیس میں رکھے ہوئے مشروبات چھناکوں سے ٹوٹ گئے۔ موٹے شخص نے لپک کر مجھے عقب سے بانہوں میں جکڑ لیا۔ میں نے دیکھا کہ کونے کی میز پر بیٹھے ہوئے میرے ساتھی بھی اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں مگر اس سے پہلے کہ جنگ و جدل سے بھرپور فلم شروع ہو جاتی میرا مکہ کھانے والے لمبے شخص نے پہلوان کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ یہ لمبا شخص جو دراصل ہوٹل کا منیجر بھی تھا انتہائی خطرناک غنڈہ تھا۔ مکہ کھانے کے بعد وہ مجھے خود سبق سکھانا چاہتا تھا۔ نہایت پھرتی سے کاؤنٹر پھلانگ کر وہ میرے سامنے آیا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ گاہک چیختے چلاتے بیرونی دروازے کی طرف بھاگے۔ لمبے شخص کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ چاقو پکڑنا ہی نہیں استعمال کرنا بھی جانتا ہے۔ ہونٹوں سے نکلنے والا خون اس کی گردن بھگو رہا تھا۔ یہ سرخی اس کے حلیے کو اور بھی خوفناک بنا رہی تھی۔

"بھاگ جاؤ..... بھاگ جاؤ، کسی بوڑھے شخص

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے بیرونی دروازے سے مجھے ڈری ڈری آواز میں مشورہ دیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرے تینوں ساتھی ابھی تک ہوٹل میں موجود ہیں۔ وہ چند گز کے فاصلے پر کھڑے تذبذب سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی ایک جھلک ہی یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ وہ سخت خوفزدہ ہیں۔ شاید انہیں توقع نہیں تھی کہ اتنی جلدی اتنی خطرناک صورت پیدا ہو جائے گی۔ لمبے شخص نے نہایت مشاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے خالی ہاتھ سے چکما دیا اور چاقو سرسراتا ہوا میری پسلیوں کو چھو کر گزر گیا۔ بچنے کی کوشش میں میں میز پر گرا۔ گرتے ساتھ ہی میں نے کروٹ بدلی اور چاقو کا دوسرا وار لکڑی کے تختے پر پڑا۔ دوسرے اور تیسرے وار کے درمیان اتنا کم وقفہ تھا کہ میں خود کو بچانے میں ناکام رہا اور چاقو کا پھل میری کلائی میں پیوست ہو گیا۔ تکلیف کی شدت نے میرے جسم میں انگارے بھر دیئے۔ میں نے ایک ٹھوکر مدمقابل کو رسید کی جو اس کے منہ پر پڑی۔ کوئی عام شخص ہوتا تو ایسی ضرب کھا کر قدموں پر کھڑا نہ رہ سکتا لیکن وہ بدبخت ذرا سا لڑکھڑایا اور پھر چنگھاڑ کر چاقو میرے چہرے کی طرف لایا۔ اس کا وار بے مثال تھا۔ یوں لگتا تھا میں مقناطیس ہوں اور میری بے پناہ کشش چاقو کو بار بار اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ اگلے تیس سیکنڈ میں اس نے مسلسل مجھ پر وار کیے اور اتنی تیزی اور تواتر سے کیے کہ بارہا موت میری آنکھوں کے سامنے ناچ گئی۔ خوش قسمتی سے ایک کرسی میرے ہاتھ آ گئی تھی اور میں اسے ڈھال بنا کر مسلسل اپنا دفاع کر رہا تھا۔ ہوٹل کے دروازے پر اب مجمع لگ چکا تھا اور لوگ بڑے خوف و ہراس کے عالم میں یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ آخر میرا ایک داؤ چل گیا۔ جونہی مدمقابل کا وار خالی گیا میں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر کرسی کو سر سے اٹھایا اور نہایت قوت سے اس کے سر پر دے مارا۔ کرسی کے کوئی دس ٹکڑے ہوئے اور مدمقابل ڈگمگا گیا۔ میں نے میز سے سالن کی بھری ہوئی ایک پلیٹ اٹھا کر اس کے منہ پر دے ماری۔ اس کی آنکھوں میں مرچیں گئیں اور وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وحشت میں وہ چاروں طرف چاقو گھمانے لگا۔ میں نے ایک اور کرسی اس کے سر پر توڑی اور پھر عقب سے ایسی ٹانگ جمائی کہ وہ ڈکراتا ہوا "ٹوائلٹ" کے دروازے سے ٹکرایا اور اندر گر کر بیہوش ہو گیا۔

میں نے ہانپتے ہوئے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ ہوٹل کباڑ خانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ دروازے پر ابھی تک لوگ سکتے کے عالم میں کھڑے تھے۔ سیڑھیوں پر سے دو آدمی آہستہ آہستہ نیچے اُتر رہے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی کے قہقہے نے اس سکوت کو توڑا۔ میں نے غور سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر چالیس پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ آدھے بازو کی قمیص اور پتلون سے اس کا کسرتی جسم جھلک رہا تھا۔ اس کے دائیں رخسار پر زخم کا ایک طویل نشان ظاہر کرتا تھا کہ وہ کس قماش کا آدمی ہے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہی مختار علی ہے۔ مختار علی کے ساتھی پر میری نظر پڑی تو میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ سیف اللہ تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ نیچے اُتر رہے تھے۔ مختار علی نے میرا کندھا تھپتھپایا تو اس کے منہ سے شراب کے بھبکے نکل رہے تھے۔

"شاباش جوان" وہ خوش دلی سے بولا۔ "گل باز خاں کو لمبا لٹا کر تم نے ہم سب کو حیران کر دیا۔ مان گئے تمہیں۔ کہاں سے آئے ہو؟"

"جالندھر سے۔" میں نے کہا "مجھے معلوم ہوا تھا کہ سیف صاحب یہاں ہیں۔"

سیف نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس سے میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی کہ یہی

سیف ہے۔ سیف نے حیرانی سے کہا "تمہیں کس نے بھیجا ہے؟"

"آپ کے بھائی پرویز نے۔ وہ خود بھی آپ کی تلاش میں ہے۔ آپ کے گھر والے سخت پریشان ہیں۔"

سیف نے خاموش نظروں سے مختار علی کو گھورا۔ مختار نے کہا "چلو سیف اندر چلتے ہیں۔ آ جاؤ جوان تم بھی۔ وہیں باتیں ہوں گی۔"

میں مختار اور سیف کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتا اوپر چلا آیا۔ ہوٹل کے ملازمین گل باز خان کو ڈنڈی ڈولا کر کے ٹوائلٹ سے باہر لا رہے تھے۔ تمام نظریں مجھ پر جمی تھیں۔ ایک سجے سجائے کمرے میں پہنچ کر مختار علی اور سیف اللہ باتوں میں مصروف ہو گئے۔ لگتا تھا جب نیچے لڑائی شروع ہوئی تو وہ دونوں اسی اہم مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے۔ اب یہ سلسلہ پھر وہیں سے شروع ہو گیا تھا۔ فی الوقت مجھے ایک غیر متعلقہ آدمی سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا یا شاید وہ سمجھ رہے تھے کہ مجھ میں اتنی اہلیت ہی نہیں کہ ان کی باتیں سمجھ سکوں۔ وہی لین دین کا تنازعہ تھا۔ بہت کچھ طے ہو چکا تھا اور اب کچھ آخری شرائط طے ہونا باقی تھیں۔ سیف اللہ کا کہنا تھا کہ وہ باقی رقم تین تین ہزار کی آٹھ قسطوں میں ادا کرے گا جبکہ مختار کا کہنا تھا کہ یہ رقم چھ چھ ہزار کی چار قسطوں میں ادا ہونی چاہیے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ رقم چار چار ہزار کی چھ قسطوں میں ادا ہو گی۔ پھر اس معاہدے کا کاغذ لکھ کر دستخط کر لیے گئے۔ مختار علی نے اُٹھ کر سیف سے مصافحہ کیا اور سیف نے اجازت چاہی۔ بظاہر تو لگتا تھا کہ یہ دو کاروباری افراد کا عام سا معاہدہ ہے لیکن سیف کے چہرے پر چوٹوں کے نشان ابھی تازہ تھے اور مختار جس قسم کا کاروباری شخص تھا یہ مجھے اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا۔ یہ کوئی گہرا چکر تھا۔

مختار ہوٹل سے نکل کر میں اور سیف اللہ ایک دوسرے چائے خانے میں جا بیٹھے۔ کلائی کے زخم پر میں نے ہوٹل میں ہی پٹی باندھ لی تھی۔ پستول ابھی تک میری قمیص کے نیچے موجود تھا۔ سیف اللہ اس بات سے بہت متاثر نظر آتا تھا کہ پستول موجود ہونے کے باوجود میں نے اسے لڑائی کے دوران استعمال نہیں کیا۔ خالی ہاتھوں گل باز خاں جیسے غنڈے کی پٹائی اس کے نزدیک زبردست کارنامہ تھا..... چائے خانے کی کڑوی کسیلی چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے میں نے سیف کو اپنے کوائف سے آگاہ کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ شہناز ہماری ایک دُور کی رشتہ دار ہے۔ جب یہ لوگ لاہور میں تھے، ہمارا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا۔ کل دوپہر جالندھر میں اچانک شہناز نے مجھے دیکھا اور روک لیا۔ اس نے مجھے اپنی پریشانی سے آگاہ کیا اور مدد مانگی۔ وہ پولیس کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی اس لیے میں خود تمہاری تلاش میں روانہ ہوا۔ اس سلسلے میں تمہارے بھائی پرویز سے بھی ملنا پڑا۔"

میں امرتا سنگھ کا قصہ گول کرنا چاہتا تھا لیکن سیف ایک گھاگ شخص تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھ ہی لیا کہ مختار کا پتہ مجھے کیونکر چلا۔ بہرطور میری پوری بات سن کر وہ بہت متاثر ہوا۔ میری دلیری نے تو اسے پہلے ہی قائل کر لیا تھا۔ اب اسے یہ بھی پتہ چل گیا کہ میں ایک اچھا دوست ثابت ہو سکتا ہوں۔ پوچھنے لگا "جالندھر میں کیا کر رہے تھے؟"

مجھے اس معاملے میں جرم کی بُو آ رہی تھی۔ اپنے بارے میں ٹھیک بتانا درست نہیں تھا۔ "نوکری کی تلاش میں ہوں۔ شاید کہیں کلرک کی جگہ مل جائے۔"

کہنے لگا "تم تو یار اچھے خاصے آدمی ہو۔ کلرک بن کر کیا کرو گے۔ نوکری کا زیادہ ہی شوق ہے تو فوج میں چلے جاؤ نہیں تو پولیس میں چلے جاؤ۔ کانسٹیبل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی اچھی خاصی روٹی کھا لیتے ہیں۔"

میں نے کہا "یار! ایسی روٹی تنگ بہت کرتی ہے۔"

بولا "ساری دنیا کھاتی ہے، اس کے بغیر گزارا ہی نہیں میرے یار۔ میں پانچ سال ریلوے میں رہا ہوں۔ ایسے ایسے تماشے دیکھے کہ خدا کی پناہ۔" باتوں میں دھیرے دھیرے سیف اللہ کھلنے لگا۔ مجھے توقع تو پہلے سے تھی اب یقین ہو گیا کہ ریلوے سے ریٹائرمنٹ میں ضرور کوئی چکر تھا۔ عین ممکن تھا سیف نے کوئی بڑا ہاتھ مارا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا تھا مختار علی سے تنازعے کی وجہ بھی یہی "بڑا ہاتھ" ہو۔ مجھے یہ جان کر افسوس ہونے لگا کہ شہناز جیسی لڑکی اس شخص کی بیوی ہے۔ میرا دل چاہنے لگا کہ اس شخص کو یہیں سے خدا حافظ کہہ کر چلا جاؤں۔ شہناز نے مجھ سے مدد کی درخواست کی تھی اور اپنی طرف سے میں نے کوئی سستی نہیں کی تھی۔ اب سیف علی مل گیا تھا اور گھر واپس جا رہا تھا۔ مجھے بھی واپس چلا جانا چاہیے تھا۔ پتہ نہیں یہ کیا معاملہ تھا۔ ہو سکتا تھا آگے چل کر میں لاتعلق نہ رہ سکتا۔ میں نے سیف سے کہا کہ بھائی صاحب اب مجھے جانے کی اجازت دو۔

اس نے کہا "یہ کسی صورت نہیں ہو سکتا۔ تمہیں میرے ساتھ گھر چلنا ہو گا۔ میری بیوی کہے گی گم ہونے والا آ گیا اور ڈھونڈنے والا گم ہو گیا۔"

بہت اصرار کر کے سیف نے مجھے اپنے ساتھ لے لیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس اصرار کے پیچھے کوئی اور وجہ بھی ہے۔ شاید سیف مجھ سے کوئی کام لینا چاہتا تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ ہوٹل میں میں نے ایک نامی غنڈے کی ٹھکائی کی ہے۔ بعض پیشوں میں ایسے ہتھ چھٹ لوگوں کی بہت قدر ہوتی ہے۔

ہم نے باقی کی رات بس اڈے کے اسی چائے خانے میں گزاری اور علی الصبح جالندھر کے لیے روانہ ہو گئے۔ میں چاہتا تھا کہ پرویز کو سیف کے ملنے کی اطلاع دے دی جائے لیکن سیف رضامند نہیں ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ جالندھر سے اسے تار دے دیگا۔

سیف اللہ نے اصرار کیا کہ جب تک مجھے نوکری نہیں ملتی میں ان کے گھر میں رہوں۔ ایک انجانے تجسس کی وجہ سے میں نے بھی زیادہ انکار نہیں کیا۔ میری ابھی پندرہ دن کی چھٹی باقی تھی اور اس چھٹی کا کوئی اہم "استعمال" بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔ میں ان لوگوں کے ہاں منتقل ہو گیا۔ ایک ہفتے کے قیام کے بعد دونوں میاں بیوی مجھ سے کافی گھل مل گئے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ شہناز اپنے شوہر کی بے حد عزت کرتی ہے۔ اس بیچاری کے نزدیک وہ ایک محنتی اور ایماندار شخص تھا جو وقتی طور پر کاروباری مشکلات کا شکار تھا جبکہ حقیقت اس کے برعکس اور خاصی تلخ تھی۔ میرے قیافے کے مطابق سیف کسی جرم کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا اور یہ دلدل اسے آہستہ آہستہ نگل رہی تھی۔ میں نے خود کو سیف کے سامنے ایک سیدھا سادا ایف اے پاس بیروزگار ظاہر کیا تھا۔ جان بوجھ کر میں نے اسے ایسے مواقع دیئے تھے کہ وہ خود کو مجھ سے برتر سمجھنے لگا تھا۔ یہی احساس برتری اسے بعض اوقات ایسی بات کہنے پر مجبور کر دیتا تھا جسے وہ ایک پولیس والے کے سامنے کہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

ایک روز جب وہ دکان پر گیا ہوا تھا، میں گھر واپس آیا تو شہناز محلے میں ہونے والی کسی "میلاد" میں شرکت کے لیے چلی گئی۔ میں یونہی گھومتا پھرتا سیف کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس کمرے میں لوہے کی ایک الماری (سیف) تھی۔ ظاہر ہے اس میں نقدی، زیورات وغیرہ رکھے جاتے ہوں گے۔ میں نے دیکھا کہ الماری کھلی ہے اور چابیاں سوراخ میں لٹک رہی ہیں۔ صبح جلدی میں سیف اسے بند کرنا

بھول گیا تھا۔ میں آگے بڑھ کر الماری کا دروازہ بند کرنے لگا تو میری نظر نیچے گرے ہوئے چند اخباری تراشوں پر پڑ گئی۔ ایک تراشے پر مختار علی کا نام پڑھ کر میں چونک گیا۔ میں نے جلدی سے وہ تراشے اٹھائے۔ ان کے ساتھ کچھ اور کاغذات اور ایک ڈائری بھی تھی۔ میں نے الماری تو بند کی اور یہ کاغذات لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ ان تراشوں، کاغذات اور ڈائری نے سیف کے ایک اہم راز سے پردہ اٹھا دیا۔ دو گھنٹے بعد جب شہناز واپس پہنچی تو مجھ میں اس سے نظر ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ اس کا شوہر جسے وہ مجازی خدا سمجھتی تھی، ایک عیار مجرم ثابت ہوا تھا۔ میں نے وہ تمام کاغذات الماری میں واپس رکھ دیئے تھے لیکن ان ہلکے پھلکے کاغذات کا تکلیف دہ بوجھ میرے دل پر منتقل ہو چکا تھا۔

انکشاف یہ ہوا تھا کہ آج سے تین سال پہلے جب سیف ریلوے پولیس میں تھا، اس نے مختار علی کے ساتھ مل کر ایک بہت بڑی چوری کی تھی۔ اس چوری کی تفصیلات اس وقت کے اخباروں میں موجود تھیں۔ ریلوے کے ایک گودام سے لاکھوں روپے کی لکڑی چوری ہو گئی تھی۔ یہ لکڑی سلیپروں کی شکل میں تھی۔ بعدازاں مختار علی کو یہ لکڑی بیچنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا لیکن گرفتاری سے پہلے وہ قریباً دو لاکھ روپے کی لکڑی فروخت کر چکا تھا۔ مختار علی پر زیر دفعات ۳۷۸ اور ۳۸۰ اور ریلوے ایکٹ کی مختلف دفعات کے تحت کیس درج ہوا۔ یہ معلومات تو تراشوں میں موجود تھیں لیکن کچھ معلومات مجھے ڈائری اور دوسرے کاغذات سے حاصل ہوئیں۔ درحقیقت اس چوری کا دوسرا کردار سیف اللہ تھا۔ چونکہ وہ ریلوے میں ملازم تھا اس لیے اس نے ہر ممکن طریقے سے مختار علی کا کام آسان بنایا تھا۔ فروخت شدہ لکڑی کی رقم بھی اسی کے پاس تھی۔ وہ اس رقم سے عیش کرتا رہا۔ کچھ رقم اس نے بینک میں جمع کرا دی تھی۔ اس دوران اس کی شادی بھی ہو گئی۔ جب مختار علی کی رہائی کا وقت آیا تو اسے فکر لاحق ہوئی۔ اس نے مختار کے خوف سے نقل مکانی کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے نوکری چھوڑی اور جالندھر میں آ کر ایک دکان خرید لی۔ اس کا خیال تھا کہ اس شہر میں وہ مختار سے محفوظ رہے گا مگر مختار بھی کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ اس نے سیف کو جا لیا اور اپنی رقم کا مطالبہ کیا۔ سیف کے ساتھ مار پٹائی بھی اسی سلسلے میں ہوئی تھی۔ بعدازاں وہ اسے زبردستی امرتسر اپنے ہوٹل لے آیا۔ یہاں پہنچ کر سیف کو جان کے لالے پڑے تو وہ قریباً نصف رقم کی ادائیگی پر تیار ہو گیا۔ یہ تھی وہ کہانی جس کا کچھ حصہ کاغذوں کی زبانی مجھ تک پہنچا اور کچھ میں نے اپنے ذہن سے مکمل کر لیا۔

اس رات میں نے پختہ فیصلہ کر لیا کہ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں ایک فرض شناس سب انسپکٹر ضرور تھا لیکن اپنے دل کو اتنا پتھر نہیں کر سکتا تھا کہ شہناز جیسی معصوم اور فرشتہ سیرت لڑکی سے اس کا شوہر جدا کر دیتا۔ اگر یہ کام ہونا ہی تھا تو کسی اور پولیس اہلکار کے ہاتھوں ہو سکتا تھا۔ میں کیوں اس کا گناہگار بنتا۔ شام کے کھانے پر میں نے دونوں میاں بیوی کے سامنے کہہ دیا کہ صبح میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میری یہ اطلاع دونوں کے لیے حیران کن ثابت ہوئی۔ شہناز کھانا چھوڑ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ سیف نے غصے سے کہا "کیوں بھئی کیا تکلیف ہے تمہیں ہم سے؟"

میں نے کہا "بس میرا انٹرویو ہو گیا ہے۔ اب یہاں کیا کروں گا!"

سیف نے کہا "انٹرویو کا کیا ہے، دو چار اور دے ڈالو۔"

وہ میرے پیچھے ہی پڑ گیا کہ میں ابھی یہاں سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں جا سکتا۔ میں نے سنجیدگی سے کہا "سیف صاحب! میری یہ میزبانی آپ کو مہنگی نہ پڑے۔"

وہ بے تکلفی سے بولا "میری بیوی کو بھگا کر لے جاؤ گے؟"

میں نے کہا "فی الحال تو آپ پر نظر ہے۔"

شہناز اور سیف ہنسنے لگے۔ میں نے سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے کہا "سیف صاحب! اب میرا یہاں رہنا مشکل ہے۔"

سیف بیوی سے کہنے لگا "بھئی تم ہی سمجھاؤ اپنے اس رشتہ دار کو۔" اور خود اندر چلا گیا۔

شہناز مجھ پر زور ڈالنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے اسے صاف جواب تو نہیں دیا مگر ذہنی طور پر میں جانے کا پکا ارادہ کر چکا تھا۔

.....لیکن اس رات ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے مجھے اپنا پروگرام تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ رات کوئی دس بجے میں نے اپنا مختصر سامان ہینڈ بیگ میں ڈالا اور علی الصبح جانے کی تیاری کر کے بستر پر لیٹ گیا۔ کوئی بارہ ایک کا عمل ہوگا جب میری آنکھ کھلی اور میں ایک اجنبی آواز سن کر چونک گیا۔ یہ آواز ساتھ والے کمرے سے آ رہی تھی۔ یہ کمرہ سیف اللہ بیٹھک کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ رات کے اس پہر بیٹھک میں کون ہو سکتا ہے؟ میں نے حیرانی سے سوچا۔ باتیں کرنے کا انداز بھی پراسرار تھا۔ تجسس سے مجبور ہو کر میں چارپائی سے بے آواز اُترا اور دونوں کمروں کی درمیانی دیوار میں موجود دروازے سے کان لگا دیئے۔ اس دروازے کو کیل لگا کر مستقل بند کر دیا گیا تھا لہٰذا اس کے کھلنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ میں نے غور سے سنا۔ گفتگو سرگوشیوں میں ہو رہی تھی۔ یہ گفتگو میرے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھی۔ جلد ہی مجھ پر واضح ہو گیا کہ سیف اللہ کسی شخص کے ساتھ مل کر "کرنل" نامی کسی آدمی کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ سیف کا خیال تھا کہ یہ فتنہ مکمل طور پر ختم کرنے کے لیے کرنل کا مرنا لازمی ہے۔

زندگی میں میرا پہلا اتفاق تھا کہ میں کسی مجرم کو قتل کا منصوبہ بناتے ہوئے سن رہا تھا۔ وہ دونوں نہایت سنجیدگی سے اس بھیانک منصوبے کی تفصیلات طے کر رہے تھے۔ چاقو ٹھیک رہے گا، پستول کہاں سے مل سکے گا، مقتول فلاں وقت کہاں ہوگا۔ یہ سب کچھ سن سن کر میں حیرت میں ڈوب رہا تھا۔ اس دوران شاید سیف کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا۔ وہ اپنے ساتھی سے بولا "ادھر دروازہ ہے یار۔ ساتھ کے کمرے میں میری بیوی کا رشتہ دار سو رہا ہے۔ چل ادھر چارپائی پر بیٹھتے ہیں۔"

پھر وہ دونوں کرسیوں سے اٹھ کر دوسری جانب چلے گئے۔ اب ان کی آواز سننا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ چارپائی پر واپس آ گیا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیا واقعی سیف جرم کی راہ پر اتنی دور نکل چکا تھا۔ ایک انسانی جان کا قتل کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ذہن میں بہت سے سوال کلبلا رہے تھے۔ یہ کرنل کون ہے؟ اسے قتل کر کے سیف کون سا مسئلہ ختم کرنا چاہتا ہے۔ سیف کا ساتھی کون ہے۔ عین ممکن تھا یہ وہی دو لاکھ کی چوری والا معاملہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس قتل کا امریتا سنگھ سے کوئی تعلق ہو۔ بہرحال میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ قتل، سیف اللہ کا پہلا قتل ہوگا۔ یہ خیال بار بار ذہن میں آ رہا تھا کہ مجھے اس قتل کو روکنا چاہیے۔ اگر سیف نے ریلوے کے دو لاکھ روپے کھائے تھے تو یہ ایسا جرم نہیں تھا جو اس کی پوری زندگی کو برباد کر دیتا۔ مختار علی کو اگر ڈھائی سال کی سزا ہوئی تھی تو سیف کو تین سال کی ہو جاتی لیکن اگر اس کے ہاتھوں کسی کا خون ہو جاتا تو اس کے ساتھ ساتھ شہناز کی زندگی بھی تباہ ہو جاتی..... میں تادیر سوچتا رہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر میں نے وہیں لیٹے لیٹے فیصلہ کیا کہ میں صبح واپس نہیں جاؤں گا۔ عین ممکن تھا کہ کسی طرح میں اس جرم کو روکنے میں کامیاب ہو جاتا۔ میری نگاہوں میں بار بار شہناز کا چہرہ گھوم جاتا تھا۔ یہ معصوم چہرہ سوال کر رہا تھا کہ کیا میں اس کی مدد نہیں کروں گا؟"

اگلے روز میں نے سیف اور شہناز کو بتا دیا کہ ان کے اصرار پر میں ایک ہفتہ اور رُک جاتا ہوں۔ میرے اس فیصلے کی زیادہ خوشی سیف کو ہوئی۔ بہت جلد مجھے اس خوشی کی حقیقت معلوم ہو گئی۔ اس روز سیف مجھے اپنے ساتھ ہی دکان پر لے گیا۔ وہاں ایک دوسرا شخص بھی موجود تھا۔ کوئی چھوٹا موٹا وارداتیا لگتا تھا۔ جب وہ بولا تو مجھے پتہ چلا کہ رات سیف کے ساتھ یہی شخص تھا۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک گھورا اور معنی خیز نظروں سے سیف کی طرف دیکھنے لگا۔ سیف نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ ہے نواز خاں۔ اسی نے گل باز خاں کو ہوٹل میں پھینٹی لگائی تھی۔ قسم خدا کی اُٹھا اُٹھا کر پھینکا تھا۔ دیکھنے والے دنگ رہ گئے تھے۔ اس کے جسم پر نہ جاؤ۔ بڑا ہمت والا آدمی ہے۔" سیف کے ساتھی نے گرمجوشی سے میرے ساتھ مصافحہ کیا پھر دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ ان کے نزدیک میں ایک جھگڑالو اور جذباتی سا دیہاتی نوجوان ہوں جسے ورغلا کر کوئی بھی مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ایسا سمجھنے میں ان کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے سیف کے سامنے خود کو شروع سے پیش ہی اس انداز میں کیا تھا اور اب مجھے اپنی اس دور اندیشی پر مسرت ہو رہی تھی۔ دوپہر تک ہم بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ سیف اللہ آہستہ آہستہ مجھے کس طرف لے جا رہا ہے..... آپ کو سن کر شاید حیرت ہو کہ وہ مجھ سے قتل کروانے کے چکر میں تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد اس نے شراب کی ایک بوتل منگوائی۔ دکان کے عقبی حصے میں بیٹھ کر اس نے مجھے بھی پینے کی دعوت دی لیکن میں خود کو اس لعنتی شغل سے بچانے میں کامیاب رہا۔ باتوں باتوں میں بالآخر سیف کے دل کی بات اس کی زبان پر آ گئی۔ کہنے لگا "یار نواز! زندگی نہ تو دکانداری سے بنتی ہے اور نہ نوکری اور محنت سے۔ زندگی تو بنتی ہے ہمت سے..... کیوں شیرے ٹھیک کہہ رہا ہوں نا!" شیرے نے اپنی موٹی گردن ہلا کر شراب کو حلال کیا.....

قصہ مختصر سیف نے کھلے لفظوں میں مجھ سے کہا کہ اگر میں ایک شخص کا قصہ تمام کر دوں تو وہ مجھے مالا مال کر دے گا۔ اس نے کہا "نواز! یہ کام میں خود بھی آسانی سے کر سکتا ہوں لیکن چونکہ اس سے میری دشمنی ہے اس لیے مجھ پر الزام آ سکتا ہے۔ تمہاری طرف کسی کا دھیان تک نہیں جائے گا۔ تمہیں سوئے ہوئے بندے پر صرف ایک گولی چلانا ہو گی اور کھڑکی سے کود کر واپس آ جانا ہو گا..... بس چالیس ہزار روپیہ تمہاری جیب میں پہنچ جائے گا....."

وہ دیر تک مجھے سمجھاتا رہا اور میں دیر تک سوچتا رہا۔ آخر میں نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا "اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ میں پکڑا گیا تو....."

شیرے نے ایک قہقہہ لگایا اور میرے کندھے پر دھپ مار کر بولا "کیسی بات کرتا ہے یار! ہم کس لیے ہیں۔ قسم خدا کی پہلی پیشی پر ضمانت نہ کرواؤں تو نام شیرا نہیں۔"

میں نے شیرے کی طرف دیکھا اور اس کی شان میں ایک موٹی سی گالی میرے دل کی گہرائی سے نکل گئی۔ گمبخت کس طرح شہر کا ماما بن کر مجھے تسلیاں دے رہا تھا حالانکہ مجھے یقین تھا کہ کوئی کانسٹیبل بھی اسے پکڑ لیتا تو جان چھڑانی مشکل ہو جاتی اسے۔ ایسے کنگلوں کا تو جوتے مار مار کر بھرکس نکال دیتے

ہیں تھانے والے۔ مجھے اس کی شکل دیکھ کر منڈی بہاؤ الدین کے ایک نواحی گاؤں کا وہ رسہ گیر یاد آ گیا جو اس کی طرح نام کا شیرا تھا اور جس نے ایک سکھ ایس ایچ او کی مار سے بچنے کے لیے اپنی کنواری بہن پولیس چوکی بھیج دی تھی۔ بعد ازاں میں نے اس لڑکی کو شرابی ایس ایچ او کے چنگل سے نجات دلائی تھی۔

میں نے سیف کے ساتھی سے کہا "شیر محمد صاحب! یہ نہ ہو کہ کوئی پکی شہادت پڑ جائے یا میں موقع پر ہی پکڑا جاؤں۔"

شیرا سینہ پھلا کر بولا "او یارا! ہم نے تجھے یار کہا ہے یار مار نہیں بنیں گے۔"

سیف بولا "ایسی بات تو دل میں بھی نہ لاؤ نواز خاں لیکن فرض محال کچھ ہوا بھی تو تمیں ہزار والا وکیل "ٹنک" سے تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔"

سیف اور شیرا جانتے تھے کہ میں بیروزگار ہوں۔ اس لیے وہ مجھے ہر طرح سے پیسے کا جھانسہ دے رہے تھے۔ آخر میں نے ان کے سامنے ہتھیار ڈال کر نیم رضامندی کا اظہار کر دیا۔ اس اظہار کے بعد اصل منصوبے پر بات شروع ہوئی اور اس مرحلے میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ "کرنل" دراصل مختار علی کا ہی بگڑا ہوا نام ہے۔ اس کا پورا نام مختار علی عرف کرنل تھا۔ سیف مجھ سے مختار علی کو گولی مروانا چاہتا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچنے لگا۔ اس کا مطلب تھا کہ سیف اللہ معاہدے کے مطابق مختار کو اس کے حصے کی باقی رقم نہیں دینا چاہتا تھا لیکن ایک بات اُلجھن میں ڈال رہی تھی۔ اگر سیف نے اسے قتل ہی کرنا تھا تو پھر پچاس ہزار روپے یکمشت اسے کیوں دیئے۔ اب تو صرف چوبیس ہزار کی رقم باقی تھی اور وہ بھی قسطوں میں ادا کرنا تھی۔ اس چوبیس ہزار کے لیے وہ مختار کے خون سے ہاتھ کیوں رنگ رہا تھا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ معاملہ یہ نہیں جو نظر آ رہا ہے۔ چوبیس کیا چوہتر ہزار کے لیے بھی سیف قتل جیسے جرم کا حوصلہ نہیں کر سکتا تھا..... پھر میرا دھیان امرتا سنگھ کی طرف چلا گیا۔ کہیں یہ وہ چکر تو نہیں تھا۔ امرتا نے بتایا تھا کہ مختار علی ان دونوں کے پیار کا دشمن تھا۔ اگر یہ اسی رقابت کا شاخسانہ تھا تو یقینی بات تھی کہ سیف اب بھی امرتا کے پاس آتا جاتا ہے۔ دوسری طرف وہ اپنی بیوی سے بھی محبت کرتا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے کہا "سیف صاحب! میں ایک شرط پر یہ کام کر سکتا ہوں۔ آپ مجھے پہلے یہ بتائیں کہ مختار علی کو قتل کیوں کروانا چاہتے ہیں؟"

سیف ہنس کر بولا "تم اب اپنے جگر بن گئے ہو۔ بتا دیں گے تمہیں بھی لیکن اس کام کے بعد۔ وعدہ رہا۔"

میں نے بہت کوشش کی لیکن وہ اتنا کچا نہیں تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ پہلے میں جرم کی دلدل میں پھنس جاؤں پھر وہ اپنے راز سے آگاہ کرے گا۔

اب میرے سامنے تین راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ میں خود کو شہناز پر ظاہر کر دیتا۔ اسے ایک خط لکھتا جس میں اسے بتاتا کہ اس کا شوہر کیا کر چکا ہے اور کیا کرنے جا رہا ہے اور اسے ہدایت کرتا کہ وہ اسے روک لے۔ پھر سب کچھ اس پر چھوڑ کر چپ چاپ نکل جاتا لیکن میرے نزدیک یہ اس لڑکی پر بہت بڑا ظلم تھا۔ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ سیف کو روکنے کی کوشش میں وہ خود اس کے ہاتھوں قتل ہو جاتی۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ میں سیف کو ارادۂ قتل کے پیش نظر گرفتار کرا لیتا۔ اس سے پوچھ گچھ کی جاتی کہ وہ مختار کو کس بنا پر ہلاک کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس پر چوری کا کیس بھی بنایا جاتا تاکہ وہ اپنے کیے کی سزا پا سکے۔ اس طریقے سے میں سیف کو ایک سنگین جرم سے روک تو سکتا تھا لیکن شاید یہ سب وقتی طور پر ہوتا۔ جرم کا حقیقی سبب میری نظروں سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اوجھل ہو جاتا۔ جو باتیں مجھے بیروزگار مہمان کی حیثیت سے آسانی سے معلوم ہونے والی تھیں، سب انسپکٹر کے روپ میں کبھی معلوم نہ ہو سکتیں۔ تیسرا طریقہ یہ تھا کہ میں اسی روپ میں سیف کے ساتھ رہتا اور جیسا کہ اس نے کہا تھا، وہ مختار کے خاتمے کے بعد مجھے سب کچھ بتائے گا وہ بتاتا اور میں اس کی روشنی میں کوئی قدم اٹھاتا۔

میں نے فوری سوچ بچار کر کے تیسرے طریقے پر عمل کا فیصلہ کیا۔ تھوڑا سا ہوشیار بنتے ہوئے میں نے سیف اور شیرے سے کہا کہ اگر وہ مجھ سے مختار علی عرف کرنل کو قتل کروانا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ کار مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں اپنے طور پر جالندھر پہنچوں گا۔ وہاں موقع واردات کا جائزہ لوں گا اور موقع ملتے ہی اسے ٹھکانے لگا دوں گا۔ ریوالور میرے پاس موجود ہے صرف چند سو روپے مجھے دے دو، باقی میں جانوں اور کرنل۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ سیف تو پہلے ہی اس کام سے دُور رہنا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ قتل کے وقت وہ کسی ایسی جگہ ہو جہاں آٹھ دس آدمی موقع واردات سے اس کی غیر موجودگی کے گواہ بن سکیں۔ تھوڑی سی بحث کے بعد طریقہ کار طے ہو گیا۔ اگلے روز میں اعشاریہ پچیس کے ایک بھرے ہوئے ریوالور کے ساتھ جالندھر سے امرتسر روانہ ہو گیا۔ وقت رخصت شہناز کے پوچھنے پر میں نے اسے بتایا کہ سیف کے ایک کام سے جا رہا ہوں۔ اس بیچاری کو کیا معلوم تھا کہ اس کا شوہر نامدار مجھ سے کیا کام لے رہا ہے۔

چوتھے روز کے اخبارات میں یہ خبر موجود تھی کہ مختار ہوٹل کے مالک مختار عرف کرنل کو نامعلوم افراد نے اغوا کر لیا۔ مختار رات گئے ہوٹل سے گھر جا رہا تھا کہ راستے میں کسی نے گھات لگا کر اس پر حملہ کیا اور زخمی کرنے کے بعد ٹیکسی میں ڈال کر لے گیا۔

اخبار سیف اللہ کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا اور وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا ''سیف صاحب! مختار اب کبھی برآمد نہیں ہو گا۔'' سیف اس خوفناک جملے کا مطلب سمجھتا تھا۔ وہ اُٹھا اور اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ کانپتے لہجے میں بولا

''نواز! یار تُو نے میری زندگی کو عذاب بننے سے بچا لیا۔ جی چاہتا ہے تجھے بھائی بنا لوں۔ اس روز سیف بہت خوش تھا۔ وہ گھر میں رات دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ کس طرح میں نے مختار کو اغوا کیا اور پھر ایک ویران جگہ جا کر اسے گولی ماری اور لاش پتھر باندھ کر نہر میں بہا دی۔ وہ میری باتیں سُن سُن کر خوف سے کانپ بھی رہا تھا اور حیرت سے گنگ بھی ہو رہا تھا۔ اس روز اس نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ مختار کو راستے سے ہٹانا کیوں ضروری تھا۔ اس نے کہا

''نواز یار! بندہ جرم کرتا نہیں حالات اس سے کرواتے ہیں۔ اپنی مثال لے لو۔ کچھ حالات کی سختی اور کچھ دوستی سے مجبور ہو کر تم نے کرنل کو قتل کیا حالانکہ اس سے تمہاری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ یہی کچھ آج سے چار سال پہلے میرے ساتھ ہوا۔ تم امریتا سے مل ہی چکے ہو۔ میں اس کی خوبصورتی کے جال میں پھنسا ہوا تھا۔ ہمارے تعلقات کا کسی کو علم نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے یہ تعلقات اس مرحلے پر پہنچ گئے کہ امریتا نے مجھے بتایا کہ وہ حمل ضائع کروانا چاہتی ہے۔ میں بہت پریشان ہوا۔ اس سلسلے میں میں نے اپنے ایک ڈاکٹر دوست سے رابطہ قائم کیا۔ اس نے رازداری سے میرا یہ کام کر دیا لیکن یہ راز دیر تک راز نہ رہ سکا..... مجھے آج تک یہ پتہ نہیں چلا کہ کس طرح مختار علی کو اس واقعے کا علم ہو گیا۔ اس نے مجھے دھمکی دی کہ تمہیں اور ڈاکٹر دونوں کو قتل کے جرم میں اندر کروا دوں گا۔ اس کے پاس ٹھوس ثبوت موجود تھے۔ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دھمکی نے میرے لیے دنیا اندھیر کر دی۔ اگر میرے گھر والوں کو یہ بات معلوم ہو جاتی تو قیامت ٹوٹ پڑتی۔ میری بڑی بہن کی شادی ہونے والی تھی۔ والد سارے علاقے میں نیک اور پرہیزگار مشہور تھے۔ دوسری طرف ڈاکٹر کے بھی پسینے چھوٹ گئے۔ وہ بھی ایک عزت دار خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ کم عمری کی وجہ سے سمجھ بوجھ زیادہ نہیں تھی۔ میں اس صورتحال میں بہت گھبرایا۔ مختار علی نے میری اس مجبوری سے فائدہ اُٹھایا اور مجھے اشاروں پر نچانے لگا۔ میں ان دنوں ریلوے میں نیا نیا ملازم ہوا تھا۔ وہ مجھ سے چھوٹے چھوٹے ناجائز کام کروانے لگا۔ مجھے اس وقت پتہ چلا جب میں گردن تک اس دلدل میں دھنس چکا تھا۔ پھر اس نے لکڑی کے سلیپر چوری کرنے کا پروگرام بنایا۔ یہ چوری اسے تو لے بیٹھی لیکن مجھے اس جنجال سے نکلنے کا موقع فراہم کر گئی۔ ویسے بھی میں فطری طور پر اس مزاج کا آدمی نہیں ہوں۔ شادی کے بعد میرے اندر باعزت زندگی کی خواہش اور تیز ہو گئی تھی۔ مختار علی کو کورٹ سے ڈھائی سال قید کی سزا ہوئی۔ میں اس دوران آئندہ زندگی کی منصوبہ بندی کرتا رہا بالآخر میں نے نوکری چھوڑی اور شہناز کے ساتھ یہاں چلا آیا لیکن جیسا کہ تم جانتے ہو، مختار نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا اور رہا ہونے کے بعد چند ماہ میں مجھے یہاں ڈھونڈ لیا۔ اس نے مجھ سے فروخت شدہ لکڑی کی رقم کا تقاضا کیا۔ جیسے بھی ہو سکا میں نے اسے رقم دے دی اور باقی رقم قسطوں میں دینے کا وعدہ کیا مگر بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ مختار علی اب بھی میری جان بخشی کو تیار نہیں تھا۔ وہ مسلسل مجھے بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔ ریلوے کے محکمے میں اس کی دال بہت گلتی تھی اور اب میرا چھوٹا بھائی پرویز ریلوے میں ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ جو کام اس کے لیے پہلے میں کرتا تھا اب وہ پرویز کرے۔ میں نے سمجھ لیا کہ جیتے جی اس بلا سے پیچھا چھڑانا ممکن نہیں۔ اگر میں اپنی اور شہناز کی زندگی کو محفوظ بنانا چاہتا ہوں تو اس موذی کا خاتمہ ضروری ہے..... اور میرے بھائی! تم نے یہ کام کر دکھایا۔"

باتوں میں وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ رات بہت ہو گئی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور شہناز اندر آ گئی۔ "آپ نے آج سونا نہیں؟" وہ شوہر کو شکوے کی نظر سے دیکھتی ہوئی بولی۔ پھر اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا "سہ پہر کو ڈاکیا دے گیا تھا۔ مجھے دینا یاد نہیں رہا۔" اس نے کہا اور واپس چلی گئی۔ سیف نے لفافہ اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ جالندھر کی مہر لگی ہوئی تھی۔ اس نے لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنے لگا۔ جوں جوں وہ پڑھتا گیا اس کا رنگ زرد ہوتا چلا گیا اور پھر جیسے اس کی ٹانگیں بے جان ہو گئیں۔ وہ جلدی سے مسہری پر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا سیف صاحب؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

سیف نے خط مکمل کیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ خط اس کے ہاتھوں سے نیچے گر گیا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور روشنی کی طرف کر کے پڑھنے لگا لکھا تھا،

"سیف اللہ! تمہارے پہلے کرتوت ہی کچھ کم نہ تھے جو اب تم نے ایک اور ہاتھ دکھا دیا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ مختار کرنل کو اٹھانے والے تم ہی ہو اور اب تک تم اسے "منزل" پر پہنچا چکے ہو گے۔ مجھے تم پر ترس آ رہا ہے کہ اتنا بڑا کام کرنے کے باوجود تمہاری گردن اسی طرح پھنسی ہوئی ہے جیسے مختار کی زندگی میں پھنسی ہوئی تھی بلکہ اب تو تم اور بھی پھنس گئے ہو لہٰذا میں یہ توقع رکھنے میں حق بجانب ہوں کہ تم جو کچھ مختار کے لیے کرتے تھے اس سے بڑھ کر میرے لیے کرو گے۔ اب کام کا طریقہ کیا ہو گا؟ اس کے بارے میں تمہیں جلد ہی بتاؤں گا۔ میرے اگلے خط کا

انتظار کرو۔"

ایک مخلص

خط لکھنے والے نے گو احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشاروں کی زبان استعمال کی تھی لیکن اگر وہ سیدھی سیدھی بات بھی کرتا تو اس سے زیادہ کچھ نہ سمجھا سکتا۔ خط پڑھ کر میں بھی ششدر رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا..... مختار عرف کرنل اصل مجرم نہیں تھا۔ بیچ کا آدمی تھا۔ اس کے علاوہ بھی کوئی شخص تھا جسے سیف کا کچا چٹھا سب معلوم تھا۔

یہ شخص کون ہو سکتا ہے؟ پہلا سوال میرے ذہن میں یہی ابھرا۔ یہی سوال سیف کی آنکھوں میں بھی نظر آ رہا تھا۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنا سیف کے نزدیک مشکل ہو سکتا تھا میرے نزدیک نہیں۔

.....وہ رات سیف پر یقیناً بہت بھاری تھی۔ مجھے برآمدے سے ساری رات اس کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی۔ جاگتا تو میں بھی رہا لیکن میری سوچوں کا رُخ مختلف تھا۔ صبح ناشتہ کیے بغیر سیف کسی کام سے نکل گیا۔ میں بھی جلد جلد جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ شہناز میرے کمرے میں چلی آئی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی اجنبیت نظر آ رہی تھی۔ بولی

"نواز صاحب! کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے کہا "ایک جگہ انٹرویو ہے۔"

وہ بولی "دیکھیے نواز صاحب! میں نے اس روز آپ کو تھانے کے سامنے اس لیے آواز دی تھی کہ میں ایک مشکل میں گرفتار تھی اور آپ کی مدد چاہتی تھی لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ میں یہ قدم اٹھا کر ایک دوسری مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہوں۔ اگر آپ بُرا نہ منائیں تو میں کہوں گی کہ مجھے سیف اور آپ کا گٹھ جوڑ بالکل پسند نہیں۔ نجانے کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ آپ دونوں کسی غلط راستے پر جا رہے ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کی ہتھیلی پر یہ پٹی کیسی بندھی ہوئی ہے؟"

میں نے بوکھلا کر ہاتھ کی طرف دیکھا۔ درحقیقت میں نے یہ پٹی سیف کو یہ بتانے کے لیے باندھی تھی کہ میں نے سچ مچ مختار علی کو اغوا کیا ہے اور یہ چوٹ اس کارروائی کے دوران لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں شہناز کے سامنے کوئی معقول عذر پیش کرتا، اس نے یہ کہہ کر میرے قدموں تلے سے زمین نکال دی کہ وہ کل آنے والا خط دیکھ چکی ہے اور اس خط کی تحریر سے اسے کسی جرم کی بُو آ رہی ہے۔ میں نے شہناز کے سامنے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مشرقی عورت کا مکمل روپ دھار چکی تھی.....

وہ عورت جسے اپنا سہاگ سب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے اور جس کے تحفظ کے لیے وہ ہر رشتے اور ہر جذبے کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتی ہے..... میں کئی دن سے محسوس کر رہا تھا کہ شہناز اب میرے یہاں رہنے میں خوش نہیں ہے لیکن اس روز اس نے صاف کہہ دیا کہ اگر میرا کام جالندھر میں ختم ہو چکا ہے تو میں واپس چلا جاؤں۔ شہناز کی باتیں بہت تلخ تھیں لیکن مجھے بالکل بُری نہیں لگیں۔ ان باتوں میں شوہر پرستی اور وفاشعاری کی مہک تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کل یہاں سے جانے کا پروگرام بنا چکا ہوں۔

شہناز سے رخصت ہو کر میں سیدھا تھانے پہنچا۔ میرے پہنچنے تک رگھبیر سنگھ، مختار عرف کرنل کی اچھی خاصی مرمت کر چکا تھا۔ اس کے کس بل نکلے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ دراصل مختار علی نہ اغوا ہوا تھا اور نہ قتل۔ اسے میں نے امرتسر سے مقامی پولیس کی مدد سے نہایت خاموشی کے ساتھ گرفتار کیا تھا اور ٹیکسی کار میں ڈال کر جالندھر لے آیا تھا۔ اب وہ رگھبیر سنگھ کے آہنی شکنجے میں تھا۔ میں تھانے پہنچا تو دو حوالدار اس کے منہ میں پانی ڈال رہے تھے۔ اس کی ایک آنکھ سوج کر کپا بنی ہوئی تھی۔ رگھبیر نے بتایا کہ مختار نے چوری، ڈکیتی اور فراڈ کی کئی وارداتوں کا اعتراف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے ہوٹل کی آڑ میں جواخانہ چلانے کا اقرار بھی کیا ہے۔

میں نے رگھبیر سے کہا کہ مجھے ابھی اس سے ایک اور بات کا اقرار کرانا ہے۔ ذرا بلاؤ اپنے ''چھتر والے'' کو چھتر کا نام سن کر مختار علی نے جھرجھری لی اور اس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ رگھبیر مجھے آنکھ مار کر بولا ''بادشاہو! چھتر کی کوئی ضرورت نہیں۔ چھتر تو استعمال کیا جاتا ہے وگڑوں تگڑوں پر..... اور اپنے مختار صاحب تو بڑے بھلے مانس آدمی ہو گئے ہیں..... کیوں مختار جی، قسم کھا کر بتاؤ کوئی آکڑ شاکڑ باقی رہ گئی ہے تم میں؟''

مختار بے بسی سے کراہ کر رہ گیا۔ واقعی رگھبیر سنگھ نے اس شیر ببر پر ہنٹر کا ماہرانہ استعمال کر کے اسے سرکس کا شیر بنا دیا تھا یعنی بلال شاہ کی زبان میں ''سدھا تگ'' کر دیا تھا۔

رگھبیر سنگھ لہجہ بدل کر غصے سے بولا ''نواز خاں! جو جی چاہے پوچھو اس سے۔ دونی کے پہاڑے کی طرح فرفر نہ بتائے تو نام بدل دینا۔''

اور رگھبیر سنگھ نے ٹھیک کہا تھا۔ مختار علی نے سب کچھ فرفر بتایا۔ میں نے مختار علی کے سامنے وہ خط رکھا جو رات شہناز نے اپنے خاوند کو دیا تھا۔ مختار غور سے خط کو دیکھتا رہا۔ میں نے کہا ''مختار صاحب! یہ کس کا محبت نامہ ہے؟''

مختار علی کراہتے ہوئے بولا ''موہن کا''

''موہن؟ کون موہن؟'' میں نے پوچھا۔

''امریتا کا چاچا'' وہ کراہ کر بولا۔

''امریتا کا چاچا؟'' ایک دم میرے ذہن میں وہ بڈھا گھوم گیا جو اس رات نشہ کر کے چارپائی پر پڑا تھا اور امریتا نے اسے ''چاچا چاچا'' کہہ کر جگانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں وہ قیمتی ولایتی شراب کی بوتل بھی آ گئی جو گندے فرش پر لڑھکی ہوئی تھی۔ میں نے غصے سے کہا ''مختارے! مجھے پوری بات تفصیل سے بتا۔ یہ خط امریتا کے چاچے نے کیوں لکھا؟''

جواب میں مختار نے ہائے ہائے کر کے اور پانی پی پی کر جو روئیداد مجھے سنائی اس سے یہ معلوم ہوا کہ امریتا کے اسقاطِ حمل کا راز مختار علی تک پہنچانے والا یہی اس کا چاچا موہن سنگھ تھا۔ سیف اور ڈاکٹر کے سوا صرف اور صرف موہن سنگھ کو معلوم تھا کہ امریتا نے بچہ ضائع کروایا ہے۔ اس بدبخت نے بھتیجی کے اس اہم راز سے فائدہ اٹھانے اور سیف کو پھنسانے کا سوچا لیکن یہ کام وہ خود نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لیے اس نے اپنے جگری یار مختار علی کو اپنے ساتھ ملایا۔ اس کی یہ پلاننگ بہت کامیاب رہی۔ ریلوے میں سیف کی پوزیشن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے بڑا مال بنایا۔ بلیک میلنگ کے اس کاروبار میں وہ دونوں ساجھے دار تھے۔ بالآخر جب مختار علی عرف کرنل پکڑا گیا تو موہن سنگھ کو سامنے آنا پڑا۔ اسے شک ہو چکا تھا کہ مختار کو سیف نے ہی تنگ آ کر مروا ڈالا ہے۔ اس نے سیف کے پتے پر خط لکھ دیا۔ یہ جانے بغیر کہ مختار ابھی زندہ ہے اور پولیس کی حراست میں ہے۔ اس کے خط نے مجھ پر ثابت کر دیا کہ اس کام میں مختار تنہا نہیں۔ میں نے مختار سے پوچھ گچھ کی..... اور جو نتیجہ نکلا وہ آپ کے سامنے ہے یعنی موہن سنگھ کے چہرے سے نقاب اُٹھ گیا۔

موہن سنگھ کی گرفتاری بڑے دلچسپ طریقے سے عمل میں آئی۔ خدشہ تھا کہ پولیس کو دیکھ کر وہ بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ میں اکیلا سادہ لباس میں اوپر گیا۔ امریتا نے مجھے دیکھا اور خوفزدہ ہو گئی۔ اسے میرے دو تھپڑ ابھی تک بھولے نہیں تھے۔ میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پوچھا کہ ''چاچا کہاں ہے؟'' اس نے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔

میں نے بہ آہستگی دروازہ کھولا۔ موہن سنگھ دروازے کی طرف پشت کیے چارپائی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اتفاقاً یہ وہی خط تھا جو اسے سیف اللہ کو پوسٹ کرنا تھا۔ ایک نوجوان لڑکا ساتھ والی چارپائی پر سویا تھا۔ غالباً وہ امریتا کا بھائی ہو گا۔ میں نے موہن کو آواز دی تو وہ اچھل پڑا۔ پھر اس نے خط جلدی سے کاپی میں چھپا دیا۔ عینک کے پیچھے سے مجھے گھور کر وہ امریتا کو بے تحاشہ گالیاں دینے لگا۔ اسے غصہ تھا کہ امریتا نے کسی کو اندر کیوں آنے دیا حالانکہ اس نے کہا بھی تھا کہ وہ ایک ''ضروری کام'' کر رہا ہے۔ گالیاں بکنا شاید اس کی عادت تھی۔ نوجوان لڑکی کے سامنے وہ ایسی غلیظ خرافات بک رہا تھا کہ وہ غصے اور شرم سے سرخ ہو کر واپس چلی گئی..... بعد ازاں میرے لیے موہن سنگھ سے اپنا تعارف کرانا اور اسے گرفتار کرنا نہایت آسان ثابت ہوا۔ صرف ایک گھنٹے بعد موہن سنگھ قریبی تھانے کی حوالات میں ''جمع'' ہو چکا تھا۔

اسی شام سات بجے کے قریب میں جالندھر میں سیف اللہ کے گھر داخل ہوا۔ ایک باوردی اے ایس آئی اور ہیڈ کانسٹیبل میرے ہمراہ تھے۔ شہناز اور سیف مجھے پولیس والوں کے ساتھ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ میری ہدایت پر اے ایس آئی نے سیف کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی۔ شہناز حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا ''کہو شہناز! اب تو خوش ہو؟ تمہیں ہمارا گٹھ جوڑ پسند نہیں تھا نا۔ لو میں نے اسے گرفتار کروا دیا۔''

شہناز سراسیمہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ''کون ہو تم؟'' وہ ہراساں لہجے میں بولی۔ اس سوال کا جواب دھماکہ خیز تھا۔ اے ایس آئی نے میرا تعارف کروایا تو شہناز کے ساتھ ساتھ سیف بھی بھونچکا رہ گیا۔ میں نے اے ایس آئی کو اشارہ کیا۔ وہ سیف کو لے کر باہر نکل گیا۔ صحن میں اب ہچکیاں لیتی ہوئی شہناز تنہا رہ گئی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا ہوا ہے۔ میں نے کہا،

''شہناز! تمہارے نزدیک اس وقت میں ایک دغاباز شخص ہوں جس نے تمہارے گھر میں رہ کر تمہاری میزبانی سے فائدہ اٹھا کر تم سے تمہارا شوہر جدا کر دیا ہے لیکن میں صرف ایک بات کہوں گا، میں نے جو کچھ کیا تمہاری بہتری کے لیے کیا۔ سیف اللہ کو زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو سال کی قید ہو گی۔ اس کے بعد وہ گھر واپس آ جائے گا۔ تمہاری خوشیاں پھر سے لوٹ آئیں گی۔ یہ جدائی اس جدائی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو وہ تمہیں دینے والا تھا۔ شاید کبھی وہ خود ہی تمہیں اس بارے میں بتا دے گا۔ اس وقت ٹھنڈے دل سے سوچنا میں نے اچھا کیا یا بُرا۔ ہو سکتا ہے تمہیں میری نیت کے بارے میں کوئی شبہ ہو لیکن تمہارا یہ شبہ جلد ہی دُور ہو جائے گا۔ آج کے بعد ہماری ملاقات شاید ہی کبھی ہو۔'' شہناز نے بھیگی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے مسکرا کر خدا حافظ کہا اور باہر نکل آیا۔

.....اس کے بعد واقعی شہناز سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ ہاں ایک دفعہ رگھبیر کی زبانی یہ ضرور پتہ چلا کہ سیف کو ڈیڑھ سال قید اور چند ہزار روپے جرمانہ ہوا تھا۔ سزا میں اس تخفیف کا سبب رگھبیر سنگھ کی وہ کوششیں بھی تھیں جو اس نے میرے کہنے پر کی تھیں۔ موہن سنگھ کو تین سال قید ہوئی۔ مختار علی عرف کرنل پر چونکہ کئی اور وارداتیں بھی ثابت ہو گئی تھیں لہٰذا اسے مجموعی طور پر دس سال قید بامشقت سنائی گئی۔ سیف سے جوانی کے جوش میں غلطیاں ضرور ہوئی تھیں لیکن وہ فطرتاً بُرا شخص نہیں تھا۔ شاید اسی لیے قدرت نے مجھے وسیلہ بنا کر اسے ایک بڑے جرم سے بچا لیا۔

.....❁.....❁.....

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زرگزیدہ

محمد سلیم اختر

گیمبل نہ حرکت کر سکا نہ بول سکا۔ اس کا چہرہ تمام تر سنجیدگی کے باوجود پیلا پڑ گیا۔ اس نے خاموشی سے انکار میں سر ہلایا..... ''تمہارے بیٹے کو!'' سرائے کے مالک نے کہا۔ گیمبل اپنی ٹانگوں پر زور دے کر اُٹھا۔ اُٹھتے ہوئے اس نے جام نیچے گرا دیا۔ پھر اس نے اپنی ٹوپی اٹھائی اور تیزی سے گلی میں بھاگ گیا۔

بوڑھے جوڑے کی کہانی، دولت کی چمک نے انکی آنکھیں چندھیا دی تھیں

چھوٹی سی سرائے کا دروازہ کھلا اور بند ہو گیا..... سرد ہوا کا جھونکا کمرے میں در آیا۔ باتوں اور قہقہوں کا شور یک لخت بند ہو گیا۔ جیسے کسی نے سحر پھونک دیا ہو۔ درجن بھر کسانوں کی سوالیہ نگاہیں اجنبی پر مرکوز ہو گئیں۔ ان کی نگاہوں میں تجسس بھی تھا اور شک بھی۔ اجنبی نے اپنی برساتی سے پانی جھٹکا اور تیز روشنی سے بچنے کے لیے نیم وا آنکھوں سے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ سرائے کے بوڑھے مالک نے کاؤنٹر پر اپنی دونوں کہنیاں ٹکا دیں اور مسکرا کر اسے خوش آمدید کہا۔ اجنبی کو صرف وہی بوڑھا کچھ شناسا اور ہمدرد نظر آیا..... دراز قامت اجنبی بوڑھے کی طرف غور سے دیکھتا ہوا اس کی طرف بڑھا..... بوڑھا بولا ''کتنی سرد رات ہے جناب!''

''جی ہاں۔ بے حد سرد'' اجنبی نے کہا۔

''کیا مجھے کھانے کے لیے کچھ مل سکتا ہے..... روٹی، پنیر، کوئی بھی چیز؟''

سرائے کا مالک کھانے کی چیزیں لینے کے لیے چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوٹ آیا اور اس نے دو چیزیں کاؤنٹر پر رکھ دیں..... ''جناب کیا پینے کے لیے بھی کچھ چاہیے؟''

''جی ہاں۔'' اجنبی نے کہا ''وہی تلخ شے..... کیا آپ مجھے اس کا ایک جام دے سکتے ہیں؟''

بوڑھے نے جام بھرتے ہوئے پوچھا ''کیا آپ سیدھے سٹیشن سے آ رہے ہیں جناب؟''

''جی ہاں..... سیدھا سٹیشن سے آ رہا ہوں۔''

''آپ بے حد خوش نصیب ہیں۔ اس لیے اجنبی ہونے کے باوجود اس اندھیری اور سرد رات میں میری سرائے تک پہنچ گئے۔''

نوجوان نے مسکرا کر کہا ''میں اس گاؤں کے چپے چپے سے واقف ہوں۔''

''عجیب بات ہے۔'' بوڑھا بولا..... ''مجھے یاد نہیں کہ میں نے پہلے بھی آپ کو دیکھا ہو۔ شاید آپ خاصی مدت سے اس طرف نہیں آئے؟''

''پورے بیس برس بعد آیا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے پہچانے جانے کی قطعی امید نہیں ہے۔ یہ بتائیے.....'' وہ آواز دھیمی کر کے کاؤنٹر پر جھک گیا..... ''کیا مسز گیمبل یہیں رہتی ہیں؟''

بوڑھے کے چہرے پر درشتی پیدا ہو گئی.....

''ہاں وہ یہیں رہتی ہیں۔''

''ابھی تک اسی جگہ جولوٹ کٹیا کہلاتی ہے؟''

''ہاں جناب..... وہیں رہتی ہے۔''

''اور کیا ضعیف گیمبل بھی زندہ ہیں؟''

''بدقسمتی سے وہ بھی زندہ ہے۔'' دونوں ہنس پڑے۔

''وہ کیسے ہیں؟'' اجنبی نوجوان نے پوچھا۔

بوڑھے نے کندھے اچکائے..... ''یہاں ان کے متعلق کسی کو زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔ بوڑھا گیمبل کبھی کبھی یہاں بیئر لینے آ جاتا ہے لیکن بڑھیا کبھی نظر نہیں آئی..... وہ ہر سال پہلے سے زیادہ بوڑھے، پہلے سے زیادہ تنگ دست، پہلے سے زیادہ اس کے رازدار اور پہلے سے زیادہ بدمعاش ہوتے جا رہے ہیں۔ کسی طرح کوئی بہتری کی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ بوڑھا اتنا برا آدمی نہیں جتنی بڑھیا ہے۔ پھر بھی وہ ایک نامقبول جوڑا ہے۔''

اس نے کاؤنٹر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا..... ''ہاں جناب..... وہ ایک خراب جوڑا ہے۔''

اجنبی کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں سے افسردگی جھلکنے لگی۔

''تعجب ہے۔'' اس نے کہا..... ''کیا آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مجھے کچھ خوف محسوس ہو رہا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا..... بوڑھا اس کی ہر حرکت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ اسے کوئی شخص اگر زبردستی وہاں سے اٹھا دیتا تو اور بات تھی۔ وہ خود وہاں سے ہرگز نہ ہلتا۔ اس نے سوچا کہ اس نوجوان سے ضرور کوئی سنسنی خیز خبر معلوم ہو گی۔ ایسی خبر جسے بعد میں وہ فخر اور مسرت سے اپنے خریداروں کو سنا سکے گا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اجنبی نے ہاتھ دھو کر جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ ''اب مجھے چلنا چاہیے۔'' اس نے کہا۔ ''کیا پیش کروں؟''

بوڑھے نے رقم بتانے کے بعد کہا..... ''مجھے امید ہے کہ آپ اس اندھیری اور سرد رات میں کہیں دُور نہیں جائیں گے۔''

''صرف لوٹ کٹیا تک جاؤں گا۔'' اجنبی نے کہا..... ''میرا خیال ہے کہ وہاں مجھے ٹھہرنے کی جگہ مل جائے گی۔'' بوڑھا حیرت سے اسے تکتا رہ گیا..... ''اچھا شب بخیر'' اجنبی دروازے کی طرف جانے لگا پھر وہ اچانک مڑا..... ''میں یہ بات کہنا بھول گیا تھا کہ اگر میرے نام کوئی خط آئے تو حفاظت سے رکھ لیجئے گا..... میں نے یہیں کا پتہ دیا ہے میرا نام الفریڈ ہے۔''

''نہیں'' بوڑھے نے شدید حیرانی سے کہا..... ''کیا تم گمشدہ الفریڈ ہو؟''

''جی ہاں..... میں اسی نامقبول جوڑے کا لڑکا ہوں۔ وہ لڑکا جو بیس برس قبل بھاگ گیا تھا شاید آپ کو یاد ہو۔ خیر شب بخیر''..... وہ طوفانی رات میں باہر نکل گیا۔

بوڑھا سٹول پر بیٹھ گیا۔ استعجاب سے اس کا منہ نصف کھلا ہوا تھا تاہم وہ مطمئن تھا۔ اسے مطلوبہ خبر مل گئی تھی۔ یہ خبر اس کی توقع سے زیادہ سنسنی خیز تھی۔ اس خبر سے اس کے خریداروں میں اضافہ ہونا یقینی تھا۔

.....

گاؤں سے گزر کر بڑی سڑک پر نصف کلومیٹر بعد کھیتوں کے بائیں طرف لوٹ کٹیا واقع تھی۔ اجنبی کٹیا کے قریب پہنچا تو اس کی ناک میں سڑی ہوئی گوبھی کی بو آئی۔ بارش اور ہوا شور پیدا کر رہی تھی لیکن یہ شور بھی سنسان خاموشی میں اضافے کا باعث معلوم ہو رہا تھا۔ ہر طرف پژمردگی کا تسلط تھا۔ نیچے کے کمرے میں ایک روشن دان تھا۔ روشن دان سے آنے والی روشنی تاریکی میں اضافہ کر رہی تھی۔ گزرے ہوئے دنوں کا تصور اور بچپن کا ماحول نوجوان کے دل و دماغ پر مسلط تھا۔ اس نے جذباتی ہو کر آہستہ سے ایک قسم کھائی اور دروازے پر دستک دی۔ دستک کی بازگشت سنائی دی۔ چند منٹ گزر گئے۔ کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے دروازہ دوبارہ کھٹکھٹایا۔ اس دفعہ اندر کچھ حرکت ہوئی اور دروازے کی دراڑوں سے روشنی کی کرن نظر آئی۔ ناہموار قدموں کی چاپ قریب آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ پھر قدم رُک گئے۔ اس نے اپنے سے ایک میٹر کے فاصلے پر دمے کے مریض کی سانس سنی..... پھر ایک سال خوردہ اور تھکی ہوئی آواز..... اس کے باپ کی آواز آئی..... ''کون ہے؟''

''میں مسٹر یا مسز کیمبل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیوں؟ کیا کام ہے آپ کو؟'' دروازہ بند رہا۔

''میں یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ کیا وہ مجھے کچھ دن یہاں ٹھہرا سکتے ہیں؟ قریب ہی مجھے کچھ کام ہے..... یہ گھر بہت قریب پڑے گا۔''

''ہم اپنے ہاں کسی کو نہیں ٹھہراتے۔'' آواز آئی۔

''لیکن میں آپ کو معقول کرایہ ادا کروں گا۔ کیا فی ہفتہ پانچ سو ڈالر کافی ہوں گے؟''

''کتنے ڈالر؟'' آواز میں تعجب تھا۔

''پانچ سو ڈالر۔'' نوجوان نے کہا۔

بوڑھا واپس چلا گیا۔ روشنی کی کرن بھی غائب

ہوگئی۔ اجنبی کے پورے جسم میں غصے کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے سوچا..... یہ میرے والدین ضرور ہیں لیکن اگر انہوں نے انسانیت کا مظاہرہ نہ کیا تو میں انہیں کچھ نہیں دوں گا اور ان کا سلوک میرے ساتھ اچھا نہ رہا تو میں انہیں ہرگز یہ نہیں بتاؤں گا کہ میں کون ہوں..... پھر مجھے ان کی پرواہ نہیں ہوگی۔ چاہے یہ فاقے کر کے مر جائیں۔

اسی وقت تکلیف سے سانس لینے کی آواز پھر آئی..... ''اگر آپ چھ سو ڈالر فی ہفتہ دیں تو ہم آپ کو ٹھہرا لیں گے۔'' آواز آئی۔

''چھ سو ڈالر ہی سہی۔'' نوجوان نے آمادگی ظاہر کی۔

دروازہ کھل گیا۔ اس کا پستہ قد باپ گندے اور میلے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں تیل کا دیا تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں روشنی سے بچانے کے لیے ایک ہاتھ سے اوٹ کر رکھی تھی۔ بوڑھا چند لمحوں تک اسے شبہ کی نظر سے دیکھتا رہا پھر بظاہر مطمئن ہو کر وہ اسے چھوٹے سے میلے کچیلے باورچی خانے میں لے گیا۔ اس کی کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہوا کہ بوڑھا اسے پہچان گیا ہے۔ فضا میں ایک ناخوشگوار بو تھی۔ چولہے کے قریب پیڑھے پر ایک قد آور اور بدشکل بڑھیا بیٹھی تھی۔ جب وہ باورچی خانے میں داخل ہوئے تو بڑھیا نے کوئی جنبش نہیں کی لیکن اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اجنبی پر گاڑھ دیں۔ نوجوان نے بیس برس بعد اپنی ماں کو دیکھا تھا۔ اسے پھر خوف کا احساس ہوا۔ بڑھیا کی موجودگی اور اس کی صورت اتنی بھیانک تھی کہ نوجوان اسے اپنے متعلق کچھ بتا دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ بڑھیا نے تحکم کے ساتھ بوڑھے سے کہا..... ''جاؤ اس کے لیے کمرہ کھول دو۔'' بوڑھا فوراً تعمیل کے لیے چلا گیا۔ چند منٹ دونوں خاموش رہے۔ اجنبی کھڑا ہوا سر کھجاتا رہا..... بڑھیا اچانک بولی ''تمہارا سامان کہاں ہے؟''

''سٹیشن پر۔''

''اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ تم کرایہ ادا کرنے کے اہل ہو؟''

نوجوان نے جیب سے بٹوا نکالا اور نوٹوں کی گڈی اسے دکھائی۔ ''میرے پاس اسی ہزار ڈالر ہیں۔'' بڑھیا نے نوٹوں کی طرف حریص نظروں سے دیکھا۔ ''تمہارے پاس تو بہت رقم ہے'' اس نے بھاری آواز میں کہا..... ''اچھا ہمیں سات دن کا کرایہ پہلے دے دو۔ کچھ ضرورت ہے۔''

''ضرور'' نوجوان نے کہا اور چھ نوٹ نکال کر اسے دے دیئے۔ اسی اثناء میں اس کا باپ واپس آ گیا۔

''کیا کسی کو یہ بات معلوم ہے کہ تم ہمارے ہاں آئے ہو؟'' بڑھیا نے پوچھا۔

''نہیں یہ بات کوئی نہیں جانتا۔'' نوجوان جھٹ سے بولا۔

''تمہیں پورا یقین ہے؟''

''ہاں..... لیکن آپ کو اس سے کیا غرض؟''

بڑھیا نے اسے کوئی جواب دینے کی بجائے بوڑھے سے پوچھا ''کمرہ تیار کر دیا؟'' بوڑھے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو اسے وہاں پہنچا آؤ۔'' بڑھیا نے کہا۔

بوڑھا بجلی جیسی تیزی سے نوجوان اجنبی کو اوپر کمرے میں لے گیا۔

ایک گھنٹے بعد میاں بیوی بجھتی ہوئی آگ کے قریب بیٹھے تھے۔ جب سے وہ اجنبی کو اوپر پہنچا کر آیا تھا، ان دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑھیا ٹکٹکی باندھ کر سرد ہوتے ہوئے انگارے دیکھ رہی تھی۔ اس کا شوہر دوسرے پیڑھے پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ بیوی کی آواز سن کر وہ چونکا..... ''وہ ایک امیر آدمی ہے۔'' بڑھیا نے بھاری آواز میں کہا۔

''کون.....؟'' بوڑھے نے غنودگی میں کہا۔

''وہ'' اس نے اپنے سر سے اوپر کے کمرے کی طرف اشارہ کیا..... ''اس کے پاس اسی ہزار ڈالر ہیں۔ یہ بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔''

بوڑھے نے بے چینی سے پہلو بدلا..... ''ہم یہ رقم آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں۔'' بڑھیا کہنے لگی ''کوئی نہیں جانتا کہ وہ یہاں آیا ہے۔''

''تمہارا مطلب کیا ہے؟'' بوڑھے نے گھبرا کر پوچھا۔

بڑھیا ناگواری سے ہنسی ''کسی کو کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ کسی کو یہاں کا خیال تک نہیں آئے گا۔ اسے کچھ بھی ہو جائے، اس کے ساتھ کوئی بھی حادثہ پیش آئے، وہ سیڑھیوں سے گر پڑے یا کسی اور طرح ختم ہو جائے، ہم سے اس کے متعلق کوئی نہیں پوچھے گا اور اس میں ہمارا کوئی قصور بھی نہ ہوگا۔''

بوڑھا لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا ''تمہارا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ.....''

''یہی مطلب ہے۔ تم ٹھیک سمجھے۔ ہمیں اس کام سے کون روک سکتا ہے؟ بہتر ہے کہ اسے کوئی حادثہ پیش آ جائے اور اس حادثے کا ذریعہ تم بنو۔''

''میں'' بوڑھے نے پلکیں جھپکائیں۔

''ہاں تم..... اور یہ کام جس قدر جلد ہو جائے بہتر ہے۔ پیشتر اس کے کہ لوگ اسے کہیں آس پاس دیکھیں۔'' وہ پیڑھے پر سیدھی بیٹھ گئی.....

''آج ہی رات۔''

''میں..... میں یہ کام نہیں کر سکتا۔''

''تم کر سکتے ہو بیوقوف! اٹھو۔''..... وہ غیر ارادی طور پر اُٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔ وہ خاموش کھڑا تھا۔ ''تم ڈر رہے ہو'' بڑھیا نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا..... ''کیسے مرد ہو؟ چلو سر پر ٹوپی رکھو۔ ذرا سرائے سے کچھ پی پلا کر آ جاؤ۔ تم دو جام پی لو گے تو تم میں جواں مردی آ جائے گی۔ جاؤ جلدی کرو۔''

بوڑھے نے ٹوپی اٹھائی اور چھینکتا ہوا باہر چلا آیا۔ وہ خواب کی سی حالت میں چلتا رہا۔ اس میں بغاوت سر اٹھا رہی تھی۔ اس نے بڑھیا کے کہنے پر بہت سے ایسے کام کئے تھے جو دوسرے لوگ نہیں کر سکتے تھے لیکن قتل؟ یہ بہت بڑا جرم تھا تاہم اسی ہزار ڈالر..... اچھا میں سوچوں گا..... جلدی کرنی چاہیے ورنہ سرائے بند نہ ہو جائے۔ یہ کام میں پئے بغیر نہیں کر سکتا۔

جب وہ سرائے میں داخل ہوا تو سب لوگ جا چکے تھے۔ بوڑھا مالک انگیٹھی کے پاس بیٹھا آخری سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے بعد سرائے بند کر کے اسے سونے کے لیے جانا تھا۔

''آؤ کیمبل!'' اس نے نرمی سے کہا..... ''آج تو تم بالکل اجنبی نظر آ رہے ہو۔''

''مجھے ایک دو آتشہ جام دو۔'' کیمبل ایک سٹول پر بیٹھ گیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ کمرہ اسے گھومتا ہوا نظر آیا۔ اسے کمزوری اور بیماری کا احساس بھی ہوا۔

سرائے کے مالک نے جھاگ سے لبالب ایک جام اسے دیتے ہوئے کہا..... ''اپنے بیٹے کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ بیس برس میں وہ ایک مضبوط جوان بن گیا ہے۔''

کیمبل سامنے سٹول پر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سٹول کے کونے سختی سے پکڑ رکھے تھے۔ اس کی انگلیاں دباؤ کی وجہ سے کچھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خوشحالی لانے والی سات چیزیں

(۱) قرآن پاک کی تلاوت

(۲) نماز کی پابندی

(۳) اللہ کا شکر ادا کرنا

(۴) مجبور کی مدد کرنا

(۵) گناہوں سے توبہ کرنا

(۶) رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرنا

(۷) صبح کے وقت سورۂ یٰسین اور شام کے وقت سورۂ واقع کی تلاوت کرنا

☆☆☆

سفید نظر آ رہی تھیں..... ''کون.....؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔ سرائے کا مالک اسے حیرت سے تکنے لگا۔ ''کیا تم گھر نہیں گئے؟ اچھا میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ جب تم گھر جاؤ گے تو ایک بہت بڑی خوشخبری تمہاری منتظر ہو گی۔'' اس نے خوشی سے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا ''تمہیں معلوم ہے کہ آج میں نے کسے تمہارے گھر بھیجا ہے؟''

گیمبل نہ حرکت کر سکا نہ بول سکا۔ اس کا چہرہ تمام تر سنجیدگی کے باوجود پیلا پڑ گیا۔ اس نے خاموشی سے انکار میں سر ہلایا..... ''تمہارے بیٹے کو!'' سرائے کے مالک نے کہا۔

گیمبل اپنی ٹانگوں پر زور دے کر اُٹھا۔ اُٹھتے ہوئے اس نے جام نیچے گرا دیا۔ پھر اس نے اپنی ٹوپی اٹھائی اور تیزی سے گلی میں بھاگ گیا۔

سرائے کے مالک نے گردن ہلاتے ہوئے اپنے آپ سے کہا..... ''بیچارہ بوڑھا! یہ اتنا بُرا آدمی نہیں ہے۔ میری اطلاع سن کر اسے بجلی کا ایک جھٹکا لگا ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ بیس برس بعد گم شدہ بیٹے کا ملنا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوتا۔''

.....

ہوا تھم گئی تھی۔ نہایا ہوا چاند بادلوں سے جھانک رہا تھا۔ سارا گاؤں خواب اور خاموشی میں غرق تھا۔ گیمبل بھاگتا ہوا جا رہا تھا۔ اسے سانس لینے میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ تھکن نے اس کا جسم چور چور اور اس کا دماغ ماؤف کر دیا تھا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کیوں بھاگ رہا ہے!

بڑی سڑک سے پگڈنڈی پر قدم رکھتے ہی اسے اپنا گھر نظر آنے لگا۔ اوپر کی کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ جب وہ نزدیک پہنچا تو اسے کھڑکی کے پردے کے پیچھے ایک سایہ متحرک نظر آیا۔ یہ اس کی بیوی کا سایہ تھا۔ اس کا دل ایک لمحے کے لیے جیسے ساکت ہو گیا..... وہ اس کے کمرے میں کیا کر رہی ہے؟ وہ پوری رفتار سے دوڑنے لگا۔

کھڑکی کی روشنی غائب ہو گئی۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے ایک ثانیے کے لیے کانپتے ہاتھوں سے کنڈی ٹٹولی اور دروازہ کھول کر بلا تاخیر اندر دوڑا..... اس کی بیوی سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔ جب وہ اندر داخل ہوا تو بڑھیا نے رُک کر اندھیرے میں اس کی طرف دیکھا۔ اس نے ماچس کی ایک تیلی جلا کر اپنے سر کے اوپر کر لی۔

بڑھیا ایک ہاتھ میں گنڈاسا لئے کھڑی تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ کی آستین اوپر چڑھی ہوئی تھی۔ گنڈاسے کے علاوہ اس کا بازو بھی خون سے بھرا ہوا تھا..... ''وہ سو رہا تھا'' بڑھیا نے سرگوشی میں کہا ''مجھے تم پر بھروسہ نہیں تھا کہ تم یہ کام کر سکو گے۔''

.....

نکولس آگسٹ اوٹو

(1832ء-1891ء)

مائیکل ہارٹ

ترجمہ: عاصم بٹ

اوٹو نے علی الآخر آتش گیری کا ایک بہتر نظام تیار کیا۔ اس سے وہ عملی طور پر کامیاب چار سٹروک انجن بنانے کا اہل ہوا۔ چار سٹروک انجن کی اعلیٰ ترین استعداد اور کارکردگی واضح تھی۔ اسے فوراً تجارتی سطح پر کامیابی حاصل ہوئی۔ صرف اگلے دس برس میں ایسے تین ہزار انجن فروخت ہوئے!

جدید موٹر کاروں کے لیے بنیاد فراہم کرنیوالے موجد کی داستانِ حیات

نکولس آگسٹ اوٹو جرمن موجد تھا جس نے 1876ء میں داخلی افروختگی والا چار سٹروک کا انجن بنایا۔ یہ ان کروڑ ہا انجنوں کا ابتدائی نمونہ تھا جو آج تک تیار ہو رہے ہیں۔

داخلی افروختگی والا انجن ایک ہمہ صفت آلہ ہے۔ یہ کشتیوں اور موٹر سائیکلوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے صنعتی استعمالات بہت زیادہ ہیں جبکہ ہوائی جہاز کی ایجاد کے لیے اس کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل تھا۔ (1939ء میں پہلے ''جیٹ'' ہوائی جہاز کی اُڑان سے قبل تمام ہوائی جہاز داخلی افروختگی والے انجنوں کی مدد سے اوٹو کے اصولوں کے مطابق ہی چل رہے تھے)۔ بہرکیف داخلی افروختگی والے انجن کا سب سے اہم استعمال موٹر کاروں میں ہوا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اوٹو کی کامیاب کاوش سے پہلے موٹر کار بنانے کی متعدد کاوشیں ہو چکی تھیں۔ سیگفرائیڈ مارکس (1875ء)، ایٹی نی لینوئر (1862ء) اور جوزف کوگنٹ (1769ء) انجن کے ایسے نمونے بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے جو بھاگ سکتے تھے لیکن مناسب انجن کی عدم موجودگی میں جو کم وزن ہونے کے ساتھ زیادہ توانائی پیدا کر سکے۔ ان میں سے کوئی نمونہ عملی طور پر کامیاب نہ ہو سکا تاہم اوٹو کے چار سٹروک والے انجن کی تیاری کے بعد قریب پندرہ برس میں دو مختلف موجدوں کارل بینز اور گوٹلیب ڈیملر نے عملی اور کاروباری طور پر کامیاب کاریں بنا لی تھیں۔ متعدد دیگر انواع کے انجن بھی ان کاروں میں استعمال ہوئے ہیں۔ ایسا ممکن ہے کہ مستقبل میں کاریں دھانی انجن، برقیاتی بیٹری یا کسی دوسرے ذریعے سے چلائی جائیں۔ گزشتہ صدی میں جو لاکھوں کاریں تیار ہوئی ہیں ان میں سے ننانوے فیصد کاروں میں یہی داخلی افروختگی والا چار سٹروک کا انجن استعمال ہوا ہے۔ (ڈیزل انجن، داخلی افروختگی والے انجن کی ایک بہتر قسم ہے، جو ٹرکوں، بسوں اور بحری جہازوں میں استعمال ہوتا ہے، یہ اوٹو کے چار سٹروک والے چکر کی بنیاد پر ہی کام کرتا ہے تاہم اس میں تیل کے دخول کے لیے ایک جدا ترکیب استعمال ہوتی ہے)۔

سائنسی ایجادات کی عظیم اکثریت کو (ہتھیاروں اور گولہ بارود کے استثناء کے ساتھ) انسان کے لیے سودمند تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایسا تو کوئی نہیں کہے گا کہ ہم ریفریجریٹر یا پنسلین سے دستبردار ہوئے ہیں یا ان کے استعمال پر پابندی ہے۔ ان ذاتی کاروں کے وسیع تر استعمال کی قباحتیں بالکل واضح ہیں۔ یہ شور اور آلودگی پیدا کرتی ہیں، تیل کے وسائل میں کمی اور ہر سال حادثات میں متعدد لوگوں کے مرنے یا زخمی ہونے کا باعث بنتی ہیں۔

ظاہر ہے اگر ہمیں ان گاڑیوں سے فائدہ نہ حاصل ہو تو ہم کب کا ان کے استعمال کو متروک قرار دے چکے ہوتے۔ نجی گاڑیاں عوامی ٹرانسپورٹ سے کہیں زیادہ تعداد میں ہیں۔ ریل گاڑیوں کے برعکس ایک نجی گاڑی ہر جگہ آپ کو لے جا سکتی ہے اور گھر گھر میں اس سہولت سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ سریع الرفتار، آرام دہ ہے اور زیادہ سامان کو لاد لیتی ہے۔ نیز یہ ہمیں ایک بینظیر انداز میں ہماری مرضی سے کسی جگہ رہنے اور اپنے انداز میں وقت گزارنے کے انتخاب میں رکاوٹ نہیں بنتی۔

تاہم کیا یہ فوائد اس قیمت سے زیادہ ہیں جو یہ گاڑی معاشرے سے وصول کرتی ہے؟ یہ ایک بحث طلب سوال ہے۔ تاہم اس حقیقت سے کسی کو ''انکار'' نہیں ہوگا کہ گاڑی نے ہماری تہذیب پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ صرف امریکہ میں ہی 180 ملین سے زائد کاریں زیر استعمال ہیں اور ایک سال میں وہ من حیث المجموع تین کروڑ کھرب (3 Trillion) میل کا فاصلہ طے کرتی ہیں۔ یہ فاصلہ اس مجموعی فاصلہ سے زیادہ ہے جو اس وقفہ میں پیدل ہوائی جہاز، ریل گاڑی، کشتی یا آمد و رفت کے دیگر ذرائع سے طے کیا جاتا ہے۔

ان گاڑیوں کے لیے ہم نے سینکڑوں میلوں پر مشتمل پارکنگ سٹینڈز اور طویل سڑکیں بنائی ہیں جبکہ اس عمل میں تمام زمینی منظر بدل گیا۔ اس کے بدلے میں گاڑی نے ہمیں سفر کی وہ سہولت دی ہے جس سے گزشتہ نسلیں محروم تھیں۔ بیشتر کار

مالکان کی سرگرمیوں کا دائرہ کار بہت وسیع ہے جبکہ آج وہ تمام سہولیات انہیں با آسانی مہیا ہو جاتی ہیں جن سے وہ گاڑی کے بغیر محروم ہی رہتے۔ یہ ہمارے انتخاب کے دائرے کو پھیلا دیتی ہے کہ جہاں چاہے ہم رہیں اور جو چاہے کریں۔ ہر گاڑی کی عنایت ہے کہ متعدد سہولیات جو کبھی شہریوں کو بھی حاصل نہیں تھیں، آج قصباتی باشندوں کو بھی اس کی بدولت حاصل ہیں (حالیہ دہائیوں میں قصبات کے پھیلاؤ کی بنیادی وجہ بھی یہی ہے اور اسی سبب امریکہ میں اندرونی شہروں کا زوال ہوا ہے)۔

نکولس آگسٹ اوٹو جرمنی کے ایک قصبہ ہولزہاسن میں 1832ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اس کے بچپن میں ہی فوت ہو گیا۔ اوٹو ایک ہونہار طالبعلم تھا تاہم سولہ برس کی عمر میں اس نے سکول کو خیرباد کہہ کر کام تلاش کیا اور کاروبار کا تجربہ حاصل کیا۔ کچھ عرصہ اس نے ایک چھوٹے قصبہ میں ایک پنساری کی دکان پر بھی کام کیا۔ پھر وہ فرینکفرٹ میں کلرک بھرتی ہوا۔ بعد ازاں وہ ایک سفر بردار تاجر بن گیا۔

1860ء میں اوٹو نے ایٹی نی لینوئر (1900ء-1822ء) کے ایجاد کردہ گیس انجن کے بارے میں سنا۔ یہ پہلا متحرک داخلی افروختگی والا انجن تھا۔ اوٹو کو محسوس ہوا کہ اگر لینوئر کے انجن میں سیال تیل استعمال کیا جائے تو اس کے استعمالات میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ نیز اس میں گیس کے نکاس کا خانہ بھی نہیں رکھنا پڑے گا۔ اوٹو نے ایک کاربوریٹر تیار کیا تاہم اسے اس ایجاد کے حقوق کی سند نہیں دی گئی کیونکہ ایسے ہی آلات پہلے بھی زیر استعمال تھے۔

وہ مایوس نہ ہوا۔ اس نے لینوئر کے انجن کو بہتر بنانے کی طرف توجہ صرف کی۔ 1861ء کے اوائل میں اسے ایک نئی طرح کے انجن کا خیال سوجھا جو چار سٹروک کے تسلسل کے ساتھ چلے (یہ لینوئر کے انجن سے مختلف تھا جو دو سٹروک پر چلتا تھا)۔ جنوری 1862ء میں اوٹو نے چار سٹروک کے انجن کا ایک نمونہ بنایا تاہم وہ مشکلات کا شکار ہوا۔ خاص طور پر آتش گیری کے مسئلے میں جو اس نئے انجن کو عملی طور پر قابل استعمال بنانے کی راہ میں حائل تھا۔ اس نے اسے ایک طرف ڈال دیا۔ اس کی بجائے اس نے ایک ہوائی دباؤ والا دو سٹروک انجن بنایا جو گیس کی طاقت سے چلتا تھا۔ 1863ء میں اس نے اس کی سند حقوق حاصل کی، مالی معاونت کے لیے جلد ہی اسے ایوگن لینگن کی شراکت حاصل ہوئی۔ انہوں نے ایک چھوٹا کارخانہ بنایا اور انجن کو بہتر بناتے رہے۔ 1867ء میں ان کے دو سٹروک انجن نے ''پیرس ورلڈ فیئر'' میں طلائی تمغہ حاصل کیا۔ اس کے بعد اس کی فروخت انتہا پر جا پہنچی۔ 1872ء میں انہوں نے ذہین انجینئر گوٹلب ڈیملر کو اپنے کارخانے کی انتظامیہ میں شامل کیا تاکہ وہ انجن کی تیاری میں ان کی معاونت کرے۔

اگرچہ دو سٹروک انجن سے منافع بے پایاں وصول ہوا لیکن اوٹو اپنے ذہن سے چار سٹروک انجن کا خیال نہیں نکال سکا جو اصل میں وہ بنانا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایک چار سٹروک کا انجن جو تیل اور ہوا کے آمیزے کو آتش گیری عمل سے پہلے بھینچ دیتا تھا، لینوئر کے دو سٹروک انجن میں کسی نجی بہتر ترمیم کی نسبت زیادہ موثر ثابت ہو سکتا تھا۔ 1876ء کے اوائل میں اوٹو نے علی الآخر آتش گیری کا ایک بہتر نظام تیار کیا۔ اس سے وہ عملی طور پر کامیاب چار سٹروک انجن بنانے کا اہل ہوا۔ ایسا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہلا نمونہ مئی 1876ء میں تیار ہوا۔ اگلے برس اس نے ایجاد کی سند حقوق حاصل کر لی۔ چار سٹروک انجن کی اعلیٰ ترین استعداد اور کارکردگی واضح تھی۔ اسے فوراً تجارتی سطح پر کامیابی حاصل ہوئی۔ صرف اگلے دس برس میں ایسے تین ہزار انجن فروخت ہوئے جبکہ لینوئر کے انجن کے تمام نمونے متروک ہوئے۔

چار سٹروک انجن کے اوٹو کی جرمن سند حقوق پر 1886ء میں مقدمہ چلا۔ یہ موقف اختیار کیا گیا تھا کہ ایک فرانسیسی الفونس بیوڈی روکاس نے ایسا ہی ایک نمونہ 1862ء میں اختراع کیا تھا اور اس کی سند حقوق حاصل کی تھی۔ (ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ بیوڈی روکاس کوئی اثر انگیز شخصیت تھی۔ اس کی ایجاد کبھی بازار میں نہیں آئی، نہ کبھی اس نے ایسا کوئی نمونہ تیار کیا، اور نہ ہی اوٹو نے اپنی ایجاد کے لیے اس سے خیال مستعار لیا)۔ کسی معتبر سند کی عدم موجودگی میں اوٹو کا ادارہ پیسہ بناتا رہا۔ 1891ء میں وہ ایک عیش و آرام کی زندگی گزار کر فوت ہوا۔

اس دوران میں 1882ء میں گوٹلب ڈیملر ادارے سے کنارہ کش ہو گیا۔ وہ اوٹو کے انجن کو گاڑیوں میں استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ 1883ء تک اس نے ایک بہترین آتش گیر نظام ایجاد کیا (وہی جو آج زیر استعمال ہے)، جس سے فی منٹ 700 سے 900 تک ضربیں لگتی ہیں (اوٹو کے نمونوں کی استعداد 1800 سے 2000 ضرب فی منٹ تھی)۔ مزید یہ کہ ڈیملر نے ایک بہت ترقی یافتہ ہلکے وزن کا انجن تیار کیا۔ 1885ء میں اس نے اپنا ایک انجن بائیسکل سے جوڑا اور دنیا کی پہلی موٹر سائیکل تیار کی۔ اگلے برس ڈیملر نے ایک چار پہیوں والی گاڑی تیار کی۔ بعد ازاں یہ معلوم ہوا کہ کارل بینز نے بازی مار لی تھی۔ اس نے اس سے فقط تین ماہ قبل ایک تین پہیوں والی گاڑی تیار کر لی تھی۔ ڈیملر ہی کی طرح بینز کی کار اوٹو کے چار سٹروک انجن ہی کے ایک نمونے سے چلتی تھی۔ بینز کا انجن ایک منٹ میں 400 ضربوں کی استعداد رکھتا تھا تاہم اس سے اس کی گاڑی قابل عمل ہو گئی بینز نے رفتہ رفتہ اسے بہتر بنایا اور چند برس میں ہی وہ اسے بازار میں فروخت کرنے کے لیے لے آیا۔

گوٹلب ڈیملر نے بینز سے کچھ عرصہ بعد اپنی کاروں کی فروخت شروع کی۔ تاہم اسے بھی کامیابی ہوئی (آخر ڈیملر اور بینز کے ادارے باہم ضم ہو گئے۔ اس نئے ادارے نے معروف مرسڈیز بینز موٹر کاریں تیار کیں)۔

گاڑیوں کی تاریخ میں ایک اور معروف ہستی کا ذکر ضروری ہے۔ یہ امریکی موجد اور صنعتکار ہنری فورڈ تھا جس نے پہلی بار کم نرخوں پر بڑی تعداد میں موٹر کاریں تیار کیں۔

داخلی فروختگی والے انجن اور موٹر گاڑی بے پایاں اہمیت کی حامل ایجادات تھیں۔ اگر اس تمام ترقی کا سہرا کسی ایک شخص کے سر باندھا جا سکے تو اس کا شمار یہاں سرفہرست ہونا چاہیے تاہم اس تمام پیشرفت کے اعزاز کو ان چند افراد میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ لینوئر، اوٹو، ڈیملر، بینز اور فورڈ، ان تمام میں اوٹو کا حصہ البتہ سب سے زیادہ ہے۔ لینوئر کا انجن نہ طاقت اور نہ استعداد کار میں ہی موٹر گاڑیوں کے لیے مناسب تھا۔ اوٹو کے انجن نے ہر کمی پوری کی۔ 1876ء سے پہلے جب اوٹو نے اپنا انجن ایجاد کیا، ایک قابل عمل موٹر گاڑی کی تیاری ناممکن تھی لیکن 1876ء کے بعد یہ ناگزیر ہو گئی۔ نکولس اگسٹ اوٹو بجا طور پر جدید دنیا کے معماروں میں سے ایک ہے۔

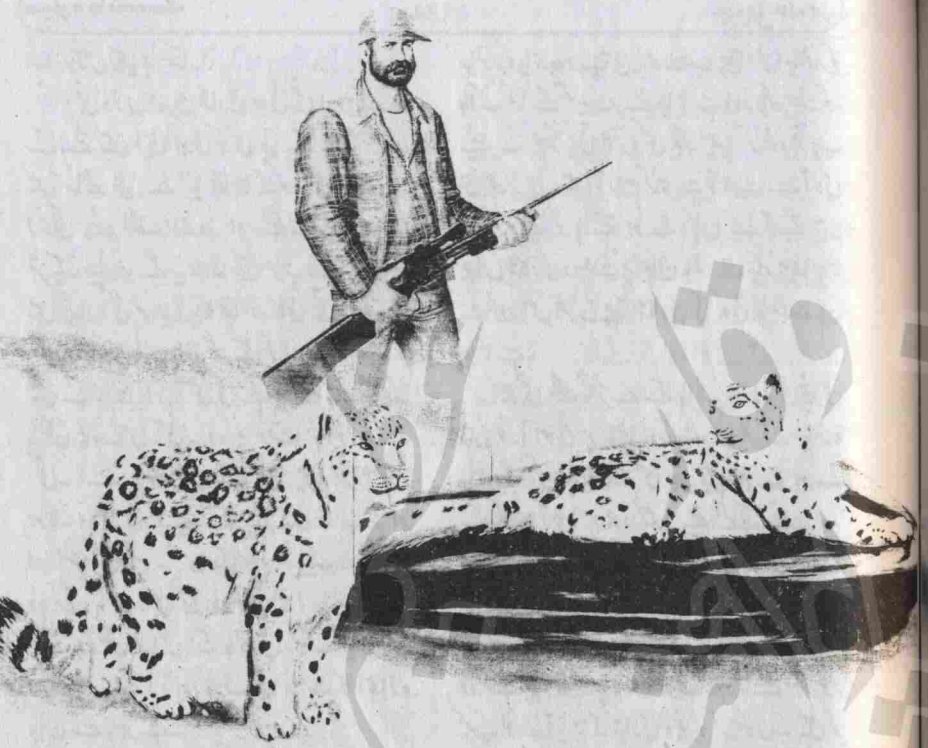

خون آشام محافظ

ترجمہ: محی الدین

شکار بعض اوقات منطق کے بل بوتے پر بھی کھیلے جاتے ہیں.....
آپ یہ کہانی پڑھ کر فیصلہ کیجیے کہ میری منطق صحیح تھی یا غلط؟

جو حضرات ہندوستان کے جنگلوں میں شکار کھیل چکے ہیں وہ کم از کم میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ چیتا، اگر آدم خور نہ ہو تو اتنا خونخوار نہیں ہوتا جتنا کہ تیندوا۔ چیتا صرف ان حالات میں ہی حملہ کرتا ہے جب اسے زخمی کر دیا جائے یا کسی جگہ گھیر لیا جائے لیکن تیندوے کی فطرت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہ اس قدر خطرناک اور مکار ہوتا ہے کہ اس کے ارادوں کا پہلے ہی سے کچھ بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

انہی دنوں میری شادی ہوئی تھی اور ایک ماہ کے لئے میں اپنی بیوی کو سی پی کے گھنے جنگلوں میں ساتھ ہی لے آیا تھا تاکہ وہ بھی وہاں کی زندگی سے لطف اندوز ہو سکے۔ اگرچہ میری شریک حیات نے یہ علاقہ پہلی مرتبہ دیکھا تھا لیکن میں یہاں کئی مرتبہ آچکا تھا اور کافی تجربہ رکھتا تھا لیکن مجھے احساس ہوا کہ سیلی کو اپنے ساتھ لاکر میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے کیونکہ اسے وہ جگہ بالکل پسند نہیں آئی۔ وہ ہر وقت خوفزدہ رہنے لگی۔ اسے ہر جھاڑی میں چیتا چھپا ہوا معلوم ہوتا۔ وہ ڈرتی کہ میز کے نیچے کہیں سانپ نہ ہو اور بستر میں بچھو نہ گھس گئے ہوں۔ ایک روز جب وہ برتن مانجھ رہی تھی اور ایک بڑا سا ساحل چٹا اسفنج سے نکل کر اس کے ہاتھ پر رینگ گیا تو اس وقت اس کے ڈر اور خوف کی حالت کا اندازہ بیان سے باہر ہے۔

ایک رات چاند کی ہلکی روشنی میں ہم دونوں ایک درخت پر مچان باندھے نیچے پانی کے جوہڑ پر آنے والے جنگلی جانوروں کو دیکھ رہے تھے۔ اس دوران میں نے محسوس کیا کہ سیلی ڈر کی وجہ سے کانپ کانپ جاتی ہے۔ رات کے وقت جنگل میں سنائی دینے والی آوازوں نے اسے کافی خوفزدہ کر دیا تھا۔ شروع میں میرا خیال تھا کہ جنگلی جانوروں کو اس طرح گھومتے پھرتے دیکھ کر سیلی کے دل سے خوف بالکل دُور ہو جائے گا لیکن میرا خیال درست ثابت نہ ہوا۔

میری چھٹیوں کا آخری ہفتہ تھا جب ایک صبح مجھے معلوم ہوا کہ جو بچھڑا ہم نے گارے کے لیے جنگل میں باندھا تھا اسے چیتے نے ہلاک کر دیا ہے۔ چیتے کے شکار کے لیے شکاری جنگل میں کسی جانور کو باندھ دیتے ہیں اور جب چیتا اس جانور کو ہلاک کر کے گھسیٹ لے جاتا ہے اور کچھ حصہ کھا لینے کے بعد باقی لاش کسی جگہ چھپا کر خود قریب ہی جھاڑیوں میں آرام کرتا ہے تو بہت سے آدمی مل کر چیتے کو ہانکتے ہوئے وہاں لے آتے ہیں جہاں شکاری درخت پر مچان باندھے تیار بیٹھا ہوتا ہے اور اس طرح چیتا شکاری کی گولی کا نشانہ بن جاتا ہے۔

جونہی مجھے بچھڑے کے ہلاک ہونے کی خبر ملی میں فوراً موقع پر پہنچا اور چاروں طرف جائزہ لینے لگا لیکن چیتے کے کسی جگہ چھپے ہوئے ہونے کے کوئی آثار موجود نہیں تھے کیونکہ بندر اور پرندے بھی بالکل خاموش تھے۔ اگر چیتا کہیں قریب ہی موجود ہوتا تو وہ ضرور شور مچاتے۔ چنانچہ میں نے ایک آدمی کو وہاں چھوڑا تاکہ وہ درخت پر بیٹھ کر چاروں طرف نگاہ رکھے اور خود کیمپ لوٹ آیا تاکہ تیاری وغیرہ کر سکوں۔ سیلی کو اس روز ہلکا سا بخار تھا اس لئے میں اس کی منشا کے خلاف اسے کیمپ ہی میں رہنے اور آرام کرنے دینے پر رضامند ہو گیا۔

دوپہر ڈھل چکی تھی اور تین بجے کا وقت تھا جب میں دو شکاریوں کو ساتھ لے کر موقع کی طرف روانہ ہوا لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس وقت تک کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا چنانچہ میں نے اس دیہاتی کو واپس بھیج دیا اور خود ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ ممکن ہے قریب ہی کسی جگہ چیتا چھپا ہوا ہو۔ اس دوران دونوں شکاریوں نے جو میرے ساتھ آئے تھے مل کر درخت پر مچان باندھی اور رسیوں کی سیڑھی نیچے لٹکا دی تاکہ میں اوپر آ سکوں۔

شام کے ساڑھے چار بج چکے تھے جب میں

نے اپنی تمام چیزوں کا جائزہ لیا۔ میرے پاس ایک کمبل، کچھ کھانے کی چیزیں اور بندوق جس پر ٹارچ لگی ہوئی تھی غرضیکہ تمام چیزیں مکمل تھیں۔ اس طرف سے اطمینان کرنے کے بعد میں نے شکاریوں کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ وہ کیمپ لوٹ جائیں اور صبح دن نکلنے کے ایک گھنٹہ بعد آئیں۔ جب وہ چلے گئے تو میں آرام سے کمبل اوڑھے درندے کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

اندھیرا پھیل چکا تھا اور جنگل میں خلاف معمول موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چند موروں کے سوا جو مُردہ بچھڑے کے قریب جوہڑ پر پانی پینے کے لیے آئے، میں نے کسی زندہ مخلوق کو نہیں دیکھا بلکہ کوے اور بندر بھی جو اکثر ایسی جگہ منڈلاتے پھرتے ہیں، غائب تھے۔ شاید اس خاموشی اور تنہائی کا اثر تھا کہ مجھے آہستہ آہستہ عجیب طرح کے وسوسوں اور خوف نے آلیا۔

میں درخت پر خاموش بیٹھا کسی آنے والے خطرے کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک مجھے فارسٹ آفیسر کے اس خط کا خیال آیا جو مجھے دو دن پہلے ملا تھا اور جس میں لکھا تھا کہ ایک تیندوا جو کہ آدم خور ہو چکا ہے اس نے وہاں سے تقریباً بیس میل دور کچھ بستیوں میں تباہی مچا رکھی ہے۔ پہلے تو مجھے اس لیے خیال نہیں آیا تھا کہ وہاں سے وہ علاقہ کافی دور تھا لیکن اب مجھے احساس ہوا کہ بیس میل کا فاصلہ ایک تیندوے کے لیے کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ ہو سکتا ہے وہ ادھر ہی آنکلے اور یہ خیال آتے ہی میرا دل ڈوبنے لگا۔

تاریکی اور زیادہ گہری ہوتی گئی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا کہ اچانک میں نے اپنے پیچھے پتوں کی سرسراہٹ سنی۔ میں فوراً ہوشیار ہو گیا۔ خطرہ سر پر آپہنچا تھا۔ بندوق پر میری گرفت اور مضبوط ہو گئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ چیتا قریب پہنچ چکا ہے۔ میں نے سانس روک لیا اور کان آواز پر لگا دیئے۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔ وقت چیونٹی کی طرح رینگ رہا تھا۔ کچھ دیر گزر گئی لیکن اس کے بعد پھر کوئی آواز پیدا نہ ہوئی بلکہ خاموشی اور زیادہ گہری ہو گئی۔ آدھ گھنٹے کے صبر آزما انتظار کے بعد بھی جب کوئی واقعہ پیش نہ آیا تو میرے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے اور میں نے ایک گہرا سانس لے کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس وقت مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی چنانچہ کھانا نکال کر کھانے لگا۔

رات کے نو بجے تھے جب میں نے درخت کے نیچے ہلکی سی آہٹ سنی اور اس کے بعد کسی جانور کے مُردہ لاش کو کھانے کی آواز آنے لگی لیکن یہ آواز چونکہ نہایت دھیمی تھی اس لئے میں نے اندازہ کر لیا کہ یہ چیتے کی آواز نہیں ہو سکتی کیونکہ چیتے جیسے بڑے جانور کے چلنے یا مُردہ لاش کو کھانے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اس قدر دھیمی نہیں ہو سکتی تھی۔ چند لمحوں تک تو میں نے انتظار کیا لیکن اس کے بعد مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ وہ غلطی ایسی تھی کہ اگر گردونواح میں چیتا موجود بھی تھا تو اسے ہوشیار کر دینے کے لیے کافی تھی حالانکہ میں نے اپنے پاس کچھ کنکر وغیرہ رکھ لیے تھے تاکہ چھوٹے موٹے جانوروں کو گارے سے دُور بھگایا جا سکے لیکن کنکر پھینکنے کی بجائے میں نے بڑی ٹارچ کا رُخ اس طرف کرتے ہوئے بٹن دبا دیا۔

ٹارچ کی تیز روشنی سے ڈر کر دو گیدڑوں نے فوراً سر اٹھایا اور لمحہ بھر کے لیے بے حس و حرکت دیکھتے رہے لیکن دوسرے ہی لمحے اندھیرے میں چھلاوے کی طرح غائب ہو گئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسی لمحے درخت کی عقبی جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی لیکن فوراً ہی خاموشی چھا گئی اور میرے سر کے گرد بھنبھناتے ہوئے مچھروں کے سوا کوئی بھی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

رات کافی جا چکی تھی اور نیند سے میری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ میں چیتے کے انتظار کا ارادہ ترک کر کے سونے کے متعلق سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے ایک ایسی آواز سنی جس سے لرز اٹھا اور نیند کی غنودگی دفعتاً غائب ہوگئی۔ یہ آواز بلی کے غرانے کے مشابہ کئی سو گنا بلند اور ہر طرف سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے اچانک یہ احساس ہوا کہ چیتا آ پہنچا ہے لیکن اس بات کا ہرگز اندازہ نہ ہو سکا کہ اب وہ کیا کرنے والا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے میں نے کئی مرتبہ چیتے کے غرانے اور دھاڑنے کی آوازیں سنی تھیں لیکن ایسی دل ہلا دینے والی آواز اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔

اب میں نے غور کرنا شروع کیا۔ مجھے علم تھا کہ اکثر گارے پر گیدڑ وغیرہ بھی پہنچ جاتے ہیں لیکن پھر بھی وہ چیتے کے پیٹ بھر کر لوٹنے سے پہلے ہرگز مُردہ جانور کے قریب نہیں پھٹکتے۔ چونکہ میں نے خود گیدڑوں کو لاش کھاتے دیکھا تھا اس لیے اندازہ لگایا کہ غالباً چیتا اپنا حصہ کھا کر واپس لوٹ چکا ہے لیکن اس کے باوجود ہر طرف سے آنے والی غراہٹ کا کوئی معقول جواب نہ سوجھتا تھا۔ میں نے سوچا کہ میرے اندازہ کرنے میں ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے پھر یہ خیال آیا کہ شاید وہ چیتا نہ ہو بلکہ کوئی اور جانور ہو۔ غالباً تیندوا..... میں بالکل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے فاریسٹ آفیسر کے خط کا خیال آیا پھر اس بدنصیب عورت کا جو ایک جھونپڑے میں اپنے خاوند کے قریب ہی سو رہی تھی اور آدم خور تیندوا اسے گھسیٹ لے گیا تھا اس کے ساتھ ہی میرے تصور میں اپنا کیمپ گھوم گیا جو گاؤں سے دو فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھا جہاں میری جان سے زیادہ عزیز سیلی تنہا اور بیمار ایک ٹینٹ میں پڑی کروٹیں لے رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ خوف کی وجہ سے سوئی تک نہ ہوگی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ہر قیمت پر سیلی کے پاس پہنچنا چاہیے۔ میں اپنے اس اقدام سے بہادری کا اظہار نہیں کر رہا بلکہ سیلی کے خیال نے مجھے اس قدر بے حس کر دیا تھا کہ یہ بھی نہ سوچ سکا کہ آدھی رات کے وقت اس خطرناک جنگل میں یوں سفر کرنا موت کو دعوت دینا ہے۔

وہ درخت جس پر مچان باندھی گئی تھی کافی بلند تھا اور زمین سے اوپر تقریباً بارہ فٹ تک کوئی شاخ وغیرہ نہیں تھی۔ مچان پر چڑھنے کے لیے میں نے رسیوں کی سیڑھی استعمال کی تھی اور اوپر آ کر گولیوں کا گٹھا ایک شاخ میں لٹکا دیا تھا تاکہ نیچے گرنے سے محفوظ رہے اور کھانا وغیرہ بھی اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اب میں نے سیڑھی کو نیچے لٹکایا۔ ارادہ یہ تھا کہ چند قدم اُتر کر کارتوس کا گٹھا نیچے پھینک دوں گا جو راستے میں حفاظت کے لیے ضروری تھا لیکن جونہی میں گٹھے کو شاخ سے اُتارنے کے لیے آگے جھکا سیڑھی کا آہنی کنڈا جو ایک موٹی سی شاخ میں اٹکا ہوا تھا پھسل گیا اور میں بارہ فٹ کی بلندی سے پیٹھ کے بل زمین پر آ رہا لیکن رائفل میرے بائیں ہاتھ میں رہی اور خوش قسمتی سے اسے کوئی نقصان نہ پہنچا۔ وہ تھیلا جس میں ٹارچ تھی میرے گلے میں لٹکا ہوا تھا۔

اس حادثے کی وجہ سے میں چند لمحوں تک بے حس و حرکت پڑا ہانپتا رہا لیکن فوراً ہی اُٹھ بیٹھا۔ مجھے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ میں ادھر ادھر

آہٹ سننے کی کوشش کرنے لگا لیکن مجھے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ اب میں نے اپنی حالت پر غور کیا۔ تھیلے سے ٹارچ نکالی اور گردونواح کا جائزہ لینے کے لیے بٹن دبایا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ غالباً میرے گرنے کی وجہ سے ٹارچ کا بلب ٹوٹ چکا تھا..... اب میں نے رائفل پر لگی ہوئی ٹارچ کو آزمایا اور اس گھپ اندھیرے میں روشنی کی پتلی سی شعاع دور تک چلی گئی جس نے جنگل کی تاریکی کو اور زیادہ ہیبت ناک بنا دیا۔

اب میری زندگی کا خوفناک ڈرامہ شروع ہوا اور جس طرح برف باری میں بھوکے بھیڑیے کسی مسافر کو یا جنگل میں شکاری کتے کسی ہرن کو نرغے میں لے لیتے ہیں اسی طرح اس نظر نہ آنے والے چیتے کی آوازوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا جو مجھے پورے دو میل تک سنائی دیتی رہیں۔ یہ آوازیں کبھی پگڈنڈی کے ایک طرف ہوتیں تو کبھی دوسری طرف۔ غراہٹ کبھی تو دھیمی ہو جاتی اور کبھی اس قدر بلند کہ خوف کے مارے میرا دم نکلنے لگتا تاہم یہ آوازیں ایسی نہیں تھیں جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ چیتا اچانک حملہ کرنے والا ہے۔ اگرچہ میں خوف سے لرز رہا تھا لیکن مجھے یہ احساس ضرور تھا کہ ایسی حالت میں بھاگنا موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہے۔ میں رائفل پر لگی ہوئی ٹارچ سے چاروں طرف دیکھتا بھالتا آگے بڑھتا ہی رہا۔ کم از کم مجھے اتنا اطمینان ضرور تھا کہ اگر یہی صورت رہی تو اسلحہ کی کمی سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوگی اور رائفل میں جو دو کارتوس ہیں وہ کافی ثابت ہوں گے۔

ابھی درختوں کی شاخوں اور گھنی جھاڑیوں میں سے دُور گاؤں کی روشنیاں نظر آئی ہی تھیں کہ اچانک ٹارچ کی روشنی میں مجھ سے صرف پانچ گز کے فاصلے پر دو سبز آنکھیں زمین سے تقریباً دو فٹ اوپر ہوا میں معلق نظر آنے لگیں۔ لمحہ بھر کے لیے میں نے ٹارچ کی روشنی ان چمکتی ہوئی آنکھوں پر مرکوز رکھی لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اچانک تھا اور اس کے لیے میں ہرگز تیار نہیں تھا۔ غراہٹ جو مجھے اپنے پیچھے سنائی دیتی تھی اب گرج کی صورت اختیار کر گئی اور دوسری طرف سے اس کا جواب دھاڑ سے دیا جانے لگا۔ پھر وہ خوفناک آنکھیں اندھیرے میں غائب ہوگئیں اور ایسی آوازیں بلند ہونے لگیں جس طرح دو خونخوار درندے آپس میں لڑتے ہیں۔ ان کی آوازیں اس قدر ہیبت ناک تھیں کہ مجھ پر سکتے کا عالم طاری ہوگیا۔ جس طرح چھت پر بلیاں آپس میں لڑتی ہیں ان درندوں کی آوازیں اسی طرح کی تھیں لیکن بلیوں کی چیخوں سے کئی سو گنا بلند میرے بالکل قریب جھاڑیوں میں یہ لڑائی ہو رہی تھی اور درندوں کی گرج سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ خونخوار اور عظیم بلیاں میرے چیتھڑے اُڑا دیں گی۔ کچھ دیر تک یہ جنگ جاری رہی لیکن پھر یہ جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی اسی طرح ختم بھی ہوگئی اور ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

اب درندوں کا خوف میرے اعصاب کے لیے ناقابل برداشت ہوگیا تھا اور میں مدد کے لیے پکارتا ہوا وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ کچھ ہی دُور بھاگا ہوں گا کہ سامنے سے میرے دونوں ساتھی کچھ دیہاتیوں کے ساتھ ہاتھوں میں مشعلیں لیے آتے دکھائی دیئے۔ انہیں قریب پا کر میری ڈھارس بندھی اور میں ان کے ساتھ گاؤں کی طرف چل پڑا لیکن اپنے خوف کو چھپانے کے لیے میں نے راستے میں ان سے کوئی بات نہیں کی اور خاموشی سے کیمپ آ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سیلی اپنے بستر میں بیٹھی کانپ رہی تھی اور اسے مطمئن کرنے کے لیے مجھے کافی وقت صرف کرنا پڑا۔ اسے تسلی دینے کے لیے مجھے کسی قدر جھوٹ بھی بولنا پڑا۔

دوسری صبح دونوں شکاریوں کو ساتھ لے کر میں جنگل کی طرف اسی راستے پر روانہ ہوا جس سے میں رات کیمپ واپس لوٹا تھا۔ کیمپ سے تقریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر ہمیں مادہ چیتے کے پنجوں کے نشانات نظر آئے جو جنگل کی طرف چلے گئے تھے۔ اس درخت تک جس پر میں رات مچان باندھے بیٹھا تھا یہ نشانات صاف نظر آ رہے تھے اور اس سے آگے گھنی جھاڑیوں میں گم ہو گئے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تقریباً بیس مرتبہ ایک اور مادہ چیتے کے پنجوں کے نشانات پگڈنڈی پر سے ادھر ادھر گزرتے ہوئے صاف نظر آ رہے ہیں۔ دونوں شکاری جو ایسے نشانات سمجھنے میں کافی مہارت رکھتے تھے اور میں نے ان نشانوں کا بڑے غور سے جائزہ لیا اور ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ ایک ہی درندے کے پگ ہیں اور اس طرح یہ بات بالکل واضح تھی کہ جو پگ پگڈنڈی پر سیدھے چلتے ہوئے درخت تک پہنچے ہیں ان نشانات سے بعد کے ہیں جو درندے کے راستے پر سے ادھر ادھر گزرنے سے بنے ہیں۔

مچان کے قریب پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ درندے بچھڑے کی لاش تقریباً ہڑپ کر چکے تھے اور بچی کھچی ہڈیوں کے گردنز اور مادہ چیتے کے بے شمار پگ موجود تھے۔ یہاں پہنچ کر میری کھوج لگانے کی صلاحیت نے جواب دے دیا لیکن دونوں شکاریوں نے مچان سے تقریباً چالیس گز کے فاصلے پر وہ جگہ تلاش کر لی جہاں چیتے نے جھاڑیوں میں آرام کیا تھا۔ پھر ہم نے اپنے قدموں کے نشانات کے ساتھ ساتھ واپس چلنا شروع کیا۔ ایک شکاری راستے کے بائیں طرف رہا اور دوسرا دائیں طرف، میں پگڈنڈی کے درمیان چل رہا تھا۔ بڑی احتیاط سے ہم نے مادہ چیتے کی حرکات کا جائزہ لیا۔ نشانات سے معلوم ہوا کہ درندہ کسی مقام پر بھی پگڈنڈی سے تیس گز سے زیادہ دور نہیں رہا اور اس نے دو مرتبہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر آرام بھی کیا لیکن اس بات کا اندازہ لگانا مشکل تھا کہ میرے گزر جانے کے بعد یا پہلے اس نے آرام کیا۔

اب ہم اس جگہ پہنچ گئے تھے جہاں درندہ آخری مرتبہ پگڈنڈی پر سے گزر کر دوسری جانب گیا تھا۔ یہ وہی مقام تھا جہاں سے میں پچھلی رات بھاگا تھا۔ اچانک دائیں طرف کا شکاری چلایا اور ہم فوراً اس کے پاس پہنچ گئے۔ تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر تھوڑی سی جگہ کھلی تھی اور وہاں جھاڑیاں وغیرہ نہیں تھیں۔ اس جگہ گھاس بالکل روندی ہوئی تھی اور ادھر ادھر خون کے بڑے بڑے دھبے صاف نظر آ رہے تھے۔ شکاری نے ایک خاردار جھاڑی کی طرف اشارہ کیا اور جلدی سے کہا ''صاحب وہ دیکھئے بگھیرا'' کوئی سیاہ رنگ کی چیز جھاڑیوں میں پڑی نظر آ رہی تھی اور جب ہم نے قریب جا کر دیکھا تو ایک بڑا تیندوا مُردہ حالت میں پڑا تھا اور اس کے سر اور گردن کی کھال بالکل ادھڑی ہوئی تھی۔

اب میں نے معلومات کی روشنی میں ان تمام سوالوں کا حل تلاش کرنا شروع کیا جو ابھی تک میرے ذہن کو پریشان کر رہے تھے۔ گیدڑ، بچھڑے کی لاش پر چیتے کے آنے سے پہلے کس طرح پہنچ گئے؟ مجھ پر نر یا مادہ چیتے نے حملہ کیوں نہیں کیا؟ کیا اس جگہ کے درندے بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

افریقہ کے شیروں کی طرح اکٹھے شکار کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں؟ مادہ چیتے کے پگڈنڈی پر سے ادھر ادھر گزرنے کا کیا سبب تھا اور آدم خور تیندوا اس ڈرامے میں کب اور کس طرح ظاہر ہوا؟ یہ تھے وہ سوالات جن کا صحیح طور پر کوئی حل میرے پاس نہیں تھا لیکن میرا ایک نظریہ ہے جو واقعات سے مطابقت رکھتا ہے۔ بالکل سائنسدانوں کا سا نظریہ۔

اس سے پہلے کہ میں یہ نظریہ پیش کروں آپ کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حیوان ایک دوسرے پر اپنے خیالات کسی نہ کسی طرح ظاہر کر سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ درندے دراصل جوڑا تھے۔ نر چیتے نے بچھڑے کو ہلاک کیا اور اپنا پیٹ بھرنے کے بعد باقی وہیں چھوڑ دیا اور حسب معمول قریب ہی جھاڑیوں میں آرام کرنے لگا کیونکہ اسے اپنی مادہ سے بھی محبت تھی چنانچہ اس نے رات کے وقت مادہ کے ہمراہ دعوت اُڑانے کا فیصلہ کیا لیکن جب وہ آرام کر رہا تھا تو اس نے ہمیں مچان باندھتے ہوئے دیکھا اور یہ بھی دیکھ لیا کہ میں سرِشام مچان پر رائفل لے کر بیٹھ گیا ہوں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ سورج غروب ہوتے وقت میں نے قریب ہی کچھ جھاڑیوں میں سرسراہٹ کی آواز سنی تھی اس وقت وہ اپنی مادہ کو خبردار کرنے کے لیے چلا گیا تھا اور پھر جلد ہی لوٹ کر حالات کا جائزہ لینے لگا۔ گیدڑوں کا لاش پر پہنچ جانا اس کی منشا کے خلاف نہ تھا چنانچہ اس نے شان استغنیٰ سے انہیں پیٹ بھرنے کی اجازت دے دی اور دیکھنے لگا کہ اب کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اس وقت جو میں نے ٹارچ روشن کی وہ بھی اس کی توقع کے خلاف نہیں تھی لیکن تیز روشنی نے اسے بے چین ضرور کر دیا ہو گا اس لئے مجھے ایک مرتبہ پھر سرسراہٹ سنائی دی تھی۔ پھر جب کوئی خطرناک صورت پیش نہیں آئی تو اس نے اپنی مادہ سے مشورہ کرنا چاہا۔ مادہ چونکہ صنف نازک کا مزاج رکھتی تھی اور تریاہٹ کے تمام تر اوصاف سے مزین تھی چنانچہ اس نے مجھے وہاں سے ڈرا کر بھگا دینے کا مشورہ دیا تاکہ وہ دونوں پرسکون ہو کر نرم نرم گوشت سے لطف اندوز ہو سکیں۔ اس کے بعد جو حادثہ مجھے پیش آیا یقیناً ان دونوں کے لیے خوش کن تھا۔ جس وقت میں درخت سے نیچے گرا تو شاید چیتے نے اپنی مادہ سے یہی کہا ہو گا ''جان من! وہ گدھا تو خود ہی نیچے آ گرا ہے ذرا اس گاؤدی کو جلد رخصت کر آؤ تاکہ ہم سامان کام و دہن کریں۔'' اور اس طرح مادہ میرے پیچھے پیچھے چل دی۔ کبھی پگڈنڈی کی دائیں تو کبھی بائیں جانب۔ اس کے ساتھ ہی وہ کبھی کبھی غراتی بھی رہی تاکہ میں جلد از جلد اس جگہ سے دفعان ہو جاؤں۔

یہ مہم بالکل صحیح طور پر انجام پا رہی تھی کہ اچانک اس کی مڈبھیڑ ایک تیندوے سے ہو گئی۔ گویا یہ اس کے نجی معاملات میں بلاوجہ کی مداخلت تھی چنانچہ بغیر وقت ضائع کئے وہ تیندوے پر پل پڑی۔ شاید تیندوا میری گھات میں تھا کیونکہ وہ آدم خور تھا اس نے جب اپنے شکار کو یوں جاتے دیکھا تو اسے بھی غصہ آ گیا اور مادہ چیتے کے سامنے ڈٹ گیا لیکن جیسا کہ ظاہر ہے اس لڑائی میں اس نے اپنی جان گنوائی۔ اس خوفناک جنگ کے ختم ہونے سے پہلے ہی میں وہاں سے بہت دور نکل آیا تھا اور چونکہ مادہ چیتے کا مشن پورا ہو چکا تھا اس لیے وہ فتح مندی کی شان سے چلتی ہوئی واپس چیتے کے پاس پہنچ گئی۔

.....❁.....❁.....

ڈاکٹر محمد طارق اُپل

مچھروں سے بچاؤ کی آسان تراکیب

جولائی اگست میں چونکہ مچھروں کی ''آمد'' نسبتاً زیادہ ہو جاتی ہے اور ڈینگی، ملیریا سمیت متعدد خطرناک بیماریاں پھیلنے لگتی ہیں لہٰذا ان دنوں خصوصی احتیاط کی ضرورت ہے۔ خیال رکھیں کہ تقریبات میں شرکت کرتے ہوئے یا اہلخانہ کیساتھ تفریح کرتے آپ خود مچھروں کے لیے ''سویٹ ڈش'' یا ''لذیذ مینیو'' نہ بن جائیں۔

خوف کی علامت بنکر حواس پر چھا جانیوالے مچھروں سے بچنے کے موثر طریقے

مچھر..... خوف اور دہشت کی علامت بن کر ہمارے یہاں لوگوں کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے جس کی وجہ یقیناً یہ ہے کہ ہر سال ڈینگی، ملیریا اور دیگر خطرناک بیماریوں کے ذریعے یہ مچھر سینکڑوں لوگوں کی جان لے لیتے ہیں۔ چنانچہ گھروں کے اندر اور باہر کھلی فضا میں بھی ان مچھروں کے کاٹنے کا ڈر لگا رہتا ہے۔

گرمی کے ساتھ لوڈشیڈنگ سے تنگ لوگ کھلی فضا میں فرصت کے لمحات گزارنا پسند کرتے ہیں۔ پوش طبقہ کے لوگ بھی بڑے بڑے کشادہ لانز میں منعقد ہونے والی تقاریب میں شرکت کرتے نظر آتے ہیں تو متوسط اور کم آمدنی والے طبقہ کے افراد پارکوں کا رُخ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خصوصاً صبح اور شام کے وقت پارکس وغیرہ میں لوگوں کا رش

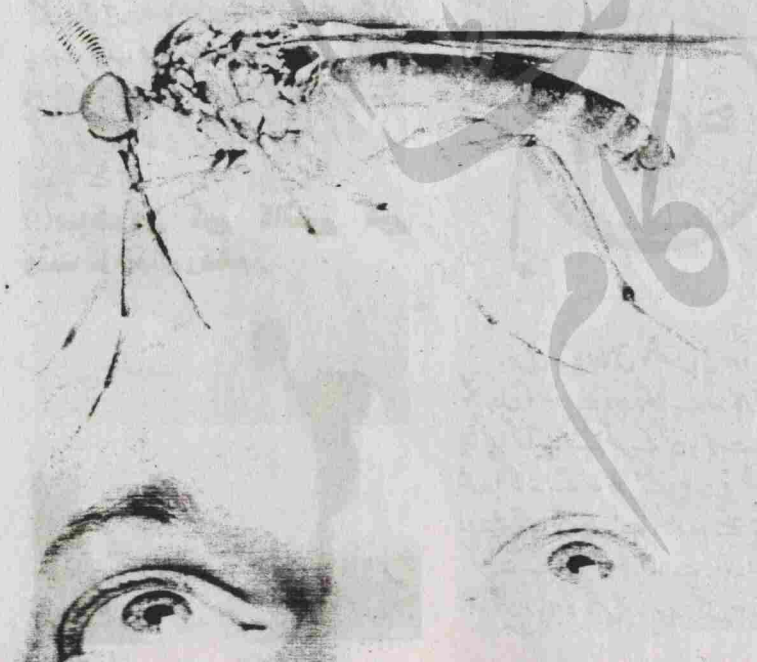

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار لوگ گھروں میں چھتوں پر اور کھلے صحن میں سونا پسند کرتے ہیں۔ ان کا یہ فعل کسی حد تک گرمی کی شدت کو کم کرنے اور لوڈشیڈنگ کے عذاب کو برداشت کرنے کے لیے ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ خود کو مچھروں کے لیے آسان ہدف بھی بنا لیتے ہیں۔ جولائی اگست میں چونکہ ویسے بھی مچھروں کی ''آمد'' نسبتاً زیادہ ہو جاتی ہے اور ڈینگی، ملیریا سمیت متعدد خطرناک بیماریاں پھیلنے لگتی ہیں لہٰذا ان دنوں خصوصی احتیاط اور بچاؤ کے لیے اقدامات کی ضرورت ہے۔ خیال رکھیں کہ تقریبات اور پارٹیوں میں شرکت کرتے ہوئے یا اہلخانہ کے ساتھ تفریح کرتے ہوئے آپ خود مچھروں کے لیے ''سویٹ ڈش'' یا ''لذیذ مینیو'' نہ بن جائیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ان دنوں مچھروں کے باعث ملک بھر میں خطرناک بیماریاں پھیل رہی ہیں اور بالخصوص کچھ خاص علاقوں میں تو یہ بہت مہلک ثابت ہو رہی ہیں۔ ذیل میں ہم ماہرین کے بتائے وہ آسان اور کارآمد طریقے بیان کر رہے ہیں جن پر عمل کر کے آپ خود کو مچھروں سے بچا سکتے ہیں:

(۱)مچھروں کے کاٹنے کے وقت کا خیال رکھیں:

زیادہ تر مچھر مخصوص اوقات میں زیادہ سرگرم ہوتے ہیں اور ان اوقات میں ان کے کاٹنے کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔ یہ اوقات صبح سورج نکلنے سے پہلے اور شام کے ہیں۔ مجبوری یہ ہے کہ ہمارے یہاں گرمی کے باعث لوگ زیادہ تر انہی اوقات میں ورزش، سیر و تفریح اور دیگر سرگرمیوں کے لیے کھلی فضا میں نکلتے ہیں اور ان مچھروں کا نشانہ بن جاتے ہیں لہٰذا کوشش کیجیے کہ صبح اور شام کے وقت اپنی سرگرمیاں محدود کر دیں اور انتہائی مجبوری کے علاوہ ان اوقات میں باہر نہ نکلیں۔ اگر بالامر مجبوری ان اوقات میں باہر نکلنا ضروری ہو تو دیگر حفاظتی اقدامات اختیار کریں جیسا کہ مچھروں کو دور بھگانے والے لوشن یا کریم کا استعمال وغیرہ۔

(۲)پنکھے کی ہوا:

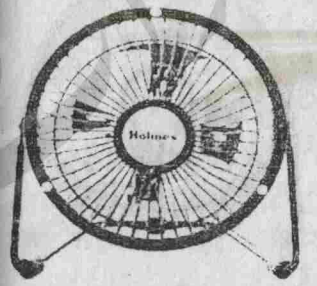

ماہرین کے مطابق پنکھوں کی ہوا کے ذریعے مچھروں کو خود سے دُور رکھنا بے حد کارآمد نسخہ ہے چنانچہ اگر آپ اپنے گھر کے صحن یا چھت یا لان وغیرہ میں اہلخانہ کے ساتھ بیٹھے ہوں تو فلورفین کے ذریعے آپ مچھروں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ یہ نسخہ کمرے کے اندر بھی کارآمد ہے کیونکہ اگر تیز رفتار پنکھا چل رہا ہو تو مچھر عموماً سرگرم نہیں ہو پاتے۔ اسی

وجہ سے بیٹری والے پنکھوں کی مانگ میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ خاص طور پر سائیڈ ٹیبل پر رکھے جانے والے منی بیٹری فین تیزی سے مقبول ہو رہے ہیں کہ یہ لوڈشیڈنگ کے باوجود آپ کو گرمی اور مچھروں سے بچاتے ہیں۔ منی بیٹری فین کو باآسانی تفریح گاہوں اور صحن یا چھت پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے لہٰذا یہ مچھروں سے بچاؤ کا اہم طریقہ ہیں۔

(۳)بگ لائیٹس استعمال کریں:

کمروں کے اندر پیلے رنگ کی بگ لائیٹس مچھروں کو دُور بھگانے کا اہم ذریعہ ہیں۔ ماہرین کے مطابق عام طور پر استعمال ہونے والی پیلی روشنی والی لائیٹس اگرچہ مچھروں کو مارتی تو نہیں ہیں لیکن یہ ان دنوں تیزی سے فروغ پانے والی دودھیا روشنی والی لائیٹس کی طرح مچھروں کے لیے باعث کشش نہیں ہوتیں چنانچہ ماہرین کا کہنا ہے کہ کمروں میں بگ لائیٹس روشن کی جائیں۔ بالخصوص اس موسم میں جب مچھروں کی بہتات ہو تو مچھروں کی آمد کو کسی حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔

(۴)لباس کا انتخاب:

لباس کے انتخاب میں چند ضروری باتوں کا خیال رکھ کر بھی آپ خود کو مچھروں کا آسان ہدف بننے سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ مچھر شوخ رنگوں والے

اور روشنی جذب کرنے والے رنگوں پر مشتمل کپڑوں کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ سیاہ یا گہرے رنگ کے کپڑے پہنے ہوں تو مچھر زیادہ سر پر منڈلانے لگتے ہیں لہٰذا اس موسم میں زیادہ سے زیادہ ہلکے رنگ اور ڈھیلے ڈھالے کپڑے زیب تن کریں۔

(۵)سپرے استعمال کریں (لیکن زیادہ نہیں):

ماہرین کے مطابق مچھر اور کیڑے مار سپرے ایک اہم ہتھیار ہے جس کی مدد سے مچھروں سے بچا جا سکتا ہے۔ یہ مچھروں، مکھیوں اور دیگر حشرات کے خلاف موثر ہے لیکن اس کے استعمال میں احتیاط ضروری ہے۔ یہ سپرے استعمال کرتے ہوئے

دھیان رکھیں کہ آپ اسے درست طریقے سے اپلائی کر رہے ہیں۔ اگر یہ کارآمد ثابت نہیں ہو رہا تو اس کا مطلب ہے کہ آپ نے یا تو اسے غلط طور پر استعمال کیا ہے...... یا اسے دوبارہ استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ سپرے اچھے برانڈ کا منتخب کریں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ سپرے میں deed تیس فیصد سے زیادہ استعمال نہ کی گئی ہو۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ سپرے استعمال کرتے ہوئے خیال رکھیں کہ بچے خصوصاً کم عمر اور نوزائیدہ بچے کمرے میں موجود نہ ہوں کیونکہ چھوٹے بچوں کے لیے دس فیصد سے زیادہ deed نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ آپ اس کے لیے کچھ قدرتی اجزاء سے بنے سپرے جو ان دنوں مارکیٹ میں عام دستیاب ہیں، استعمال کر سکتے ہیں۔

(۶) مچھروں کے لیے ٹریپ:

آپ نے ان دنوں مارکیٹ میں دستیاب بہت سی ایسی نئی پراڈکٹس کے بارے میں سنا ہو گا جو مچھروں کے لیے "ٹریپ" کا کام کرتی ہیں۔ یہ پراڈکٹس مچھر مارنے اور ان سے بچنے کا موثر طریقہ ہیں۔ ماہرین کے مطابق یہ ڈیوائسز مچھروں کی بڑی تعداد کو ٹریپ کر کے مارنے کا بہترین طریقہ ہیں۔ اگرچہ ابھی یہ ڈیوائسز ہمارے یہاں نسبتاً مہنگی ہیں لیکن جلد ان کے متبادل مارکیٹ میں آ جائیں گے اور یقیناً مچھروں سے تحفظ میں آسانی کا باعث ہوں گے۔

جہیز

ایک پارٹی میں ایک باپ بہت سے نوجوانوں سے مخاطب تھا "میری بیٹیاں شادی پر خاصا جہیز حاصل کریں گی۔ سب سے چھوٹی بیٹی ایپی سترہ برس کی ہے، اسے ایک ہزار ڈالر کا جہیز ملے گا۔ دوسری فینی پچیس برس کی ہے، اسے اڑھائی ہزار ڈالر کا جہیز ملے گا۔ پینی جو تیس برس کی ہے، اسے چار ہزار ڈالر کا جہیز ملے گا۔"

شادی

"میں نے سنا ہے کہ تم اپنی محبوبہ سے شادی کر رہے ہو؟"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔"

"میرا خیال تھا تمہاری محبوبہ اتنی آزاد خیال لڑکی ہے جو شادی کرنے پر یقین نہیں رکھتی۔"

"شادی پر تو میں بھی یقین نہیں رکھتا تھا۔"

فرار

ایک نوجوان کسی لڑکی کو لے کر فرار ہو رہا تھا۔ جب ٹیکسی سٹیشن پر پہنچے تو اس نے کرایہ ادا کرنے کے لئے اپنی جیب سے بٹوہ نکالا۔

"کرائے کا فکر نہ کیجئے جناب!" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔ "آپ کی ساتھی لڑکی کے باپ نے کرایہ پیشگی ادا کر دیا تھا۔"

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فہمیدہ کوثر

میلا لباس

اس نے ایک طائرانہ سی نظر اپنے وجود اور فائل پر ڈالی۔ اس کا سفید لباس بے داغ تھا۔ فائل بھی اپنی صحیح حالت میں تھی۔ اس نے انگلیوں کی مدد سے بالوں کو درست کیا اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ "ابھی خاصا وقت ہے"...... وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ اور کپڑوں کو سمیٹتا ہوا سڑک کے کنارے پر چلنے لگا۔

ایک شخص کا فسانہ، جو اپنے لباس پر کسی قسم کا دھبہ برداشت نہیں کر سکتا تھا

وہ جونہی گھر سے نکلا، بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔

اس نے سوچا کہ گھر واپس جایا جائے لیکن وہ گھر کو لاک کر چکا تھا اور چابی گھر میں ہی رہ گئی تھی۔ نہ جانے کب سے وہ نسیان کے مرض میں مبتلا تھا۔ اسے تو خود بھی یاد نہیں تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ آج درخواست جمع کروانے کی آخری تاریخ تھی۔

وہ جب سے اس شہر میں آیا تھا نا معلوم کتنی ہی درخواستیں جمع کروا چکا تھا لیکن یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ نوکری حاصل نہ کر سکتا تھا۔

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے، یکایک بارش شروع ہو گئی جو اس کے سفید کپڑے بھگو رہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔

وہ جلدی سے ایک چھوٹے سے جنرل سٹور کی طرف بڑھا اور چھپر نما چھت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

اس نے اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں پر نظر ڈالی جو کہ خاصے گیلے ہو چکے تھے۔

اس کی وہ فائل جس میں درخواست تھی، کئی جگہ سے گیلی ہو گئی تھی۔

وہ خاموش کھڑا بارش کے رُکنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وقت اس کے لیے اہم تھا۔ اگر وہ آج درخواست جمع نہیں کروائے گا تو اس کی نوکری کا چانس مارا جا سکتا ہے۔ وہ مسلسل سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔ اس وقت بارش کا موسم اسے بہت بُرا لگ رہا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ اس موسم میں شعر و شاعری کیا کرتا، رومانوی ناول پڑھتا اور نہ جانے کیا کیا کرتا تھا۔ اسے اب خود بھی بھول چکا تھا۔

''حارث نیچے اُتر آؤ۔ کیوں بارش میں کپڑے گیلے کر رہے ہو۔'' اماں جی صحن میں کھڑی ہو کر آواز دیتیں۔

اور وہ چھت پر بے نیازی سے بارش کے مزے لیتا رہتا۔ اس کو احساس تک نہ ہوتا کہ اس کا سفید لباس میلا ہو گیا ہے اور اس پر دھبے پڑ چکے ہیں۔

جب کبھی وہ زیادہ ترنگ میں ہوتا تو چھت پر بارش کے ٹھہرے ہوئے پانی میں زور زور سے پاؤں مار کر پھینکیں اُڑاتا۔

اس وقت اماں جی کی ڈانٹ ڈپٹ بھی اس پر کوئی اثر نہ ڈالتی۔

پھر جب وہ جوان ہوا تو رضیہ کے ساتھ بارش میں بھیگنا اسے بہت اچھا لگتا۔

''آخر تمہیں یہ موسم کیوں پسند ہے، ہر طرف کیچڑ پانی.....اور جل تھل'' رضیہ جھنجھلا کر کہتی۔

اور وہ صرف مسکرا پڑتا۔

رضیہ کے لیے ایک تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ سفید لباس بہت پسند کرتا تھا اور ایسے موسم میں تو سفید لباس کا حلیہ ہی بدل جاتا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج میں سنجیدگی آتی گئی۔ رضیہ کے اچانک فوت ہونے پر تو وہ جیسے کملا کر رہ گیا تھا۔

اب وہ اکثر خاموش رہتا۔ اکیلا گھر اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ ادھر دفتر میں بھی اس کا دل نہ لگتا تھا لیکن ایک واضح تبدیلی اس میں یہ آئی کہ اب وہ اپنے سفید لباس پر کسی قسم کا داغ یا دھبہ برداشت نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی بارش کا موسم اسے اچھا لگتا تھا۔

رضیہ کے انتقال کے بعد اسلم کے مشورے پر اس نے چند دن صحت افزا مقام پر گزارنے کا فیصلہ کیا۔

لیکن جب وہ واپس آیا تو اس کی جگہ دفتر میں کسی اور شخص کو بھرتی کر لیا گیا اور یوں وہ نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

دفتر سے وارننگ تو اسے کئی بار مل چکی تھی۔ رضیہ کے بعد تو وہ بہت سُست ہو گیا تھا لہٰذا وہ اور نوکری اب اکٹھے نہیں چل سکتے تھے۔

وہ اس جگہ سے اتنا متنفر ہوا کہ اس نے وہ شہر ہی چھوڑ دیا۔

لیکن اس شہر میں آ کر بھی وہ سکون میں نہ تھا۔

ایک تو نوکری کا حصول ناممکن تھا دوسرے اجنبی شہر میں کوئی جان پہچان نہ تھی۔

بارش تھم گئی تھی لیکن سڑک پر خاصا پانی جمع ہو گیا تھا۔

اس نے ایک طائرانہ سی نظر اپنے وجود اور فائل پر ڈالی۔ اس کا سفید لباس بے داغ تھا۔

فائل بھی اپنی صحیح حالت میں تھی۔ اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نایاب دعا

اے اللہ!

☆ہمیں بخش دے ایسی معافی جس کے بعد گناہ نہ ہو۔

☆ایسی ہدایت جس کے بعد گمراہی نہ ہو۔

☆ایسی رضا جس کے بعد ناراضگی نہ ہو۔

☆ایسی حمت جس کے بعد عذاب نہ ہو۔

☆ایسی کامیابی جس کے بعد ناکامی نہ ہو۔

☆ایسی عزت جس کے بعد ذلت نہ ہو۔

(آمین، ثم آمین)

فرمانِ حضرت علیؓ

''میں بڑوں کی عزت اس لیے کرتا ہوں کہ ان کی نیکیاں مجھ سے زیادہ ہیں..... اور میں چھوٹوں سے پیار اس لیے کرتا ہوں کہ ان کے گناہ مجھ سے کم ہیں۔''

☆☆☆

انگلیوں کی مدد سے بالوں کو درست کیا اور گھڑی پر نظر ڈالی۔

''ابھی خاصا وقت ہے''..... وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔

اور کپڑوں کو سمیٹتا ہوا سڑک کے کنارے پر چلنے لگا۔

لوگوں کی آمد و رفت پھر سے شروع ہوگئی تھی۔ دھواں چھوڑتی گاڑیاں اس کے قریب سے گزر رہی تھیں۔ وہ ان باتوں سے بے نیاز آگے بڑھ رہا تھا۔

''زندگی میں کامیابی کا راز یہ ہے کہ کبھی گزرے ہوئے حالات پر نظر نہ رکھو بلکہ مستقبل پر نظر رکھو۔''

اس کو ابا جی کی بات یاد آگئی۔

ہاں واقعی ابا جی نے کبھی بھی گزرے ہوئے حالات پر نظر نہ رکھی۔ کینیڈا جا بسے اور پھر کبھی واپس نہ آئے البتہ ان کے نصیحت آموز خطوط اور فون سال میں ایک دو مرتبہ آجاتے۔ اماں جی بچپن میں اسے کہانی سنایا کرتی تھی جس میں ایک شہزادہ تھا۔

اسے کسی نجومی نے بتایا کہ ''تمہاری سلطنت کی اور تمہاری خیروعافیت اسی میں ہے کہ جنوب کی طرف بستی میں داخل ہو جاؤ اور مشکلات کا مقابلہ کرو لیکن خبردار پیچھے مڑ کر مت دیکھنا ورنہ پتھر کے ہو جاؤ گے۔''

شہزادے کا اشتیاق بڑھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پتھر کا ہو گیا۔

لیکن ابا جی کیوں پتھر کے ہو گئے تھے۔ انہوں نے تو پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا تھا۔

ان کے احساسات و جذبات بھی پتھر کے ہو گئے تھے۔

وہ نہ جانے سڑک پر چلتا ہوا کیا سوچ رہا تھا۔

''شڑاپ''..... آواز پر وہ چونکا۔

ایک تیز رفتار گاڑی سڑک پر ٹھہرے ہوئے پانی سے گزری اور چھینٹیں اُڑاتی گزر گئی۔ اس کے سفید لباس پر گندے پانی کی چھینٹیں پڑ گئیں۔

وہ یکدم گھبرا سا گیا۔

اس نے ایک بار پھر نظر اپنے کپڑوں پر ڈالی جو نشان زدہ ہو گئے تھے جس سے اس کے لباس کا اُجلا پن ختم ہو گیا تھا۔

وہ بہت رنجیدہ ہوا۔ اس کا لباس میلا ہو چکا تھا۔ رضیہ کے مرنے کے بعد اس کے پاس صرف لباس کی ہی پاکیزگی تھی لیکن اب وہ میلا ہو چکا تھا۔

وہ سڑک کے کنارے پریشان کھڑا سوچ رہا تھا کہ وہ فائل بھی جمع نہیں کروا سکتا۔ نہ تو اب اس کے پاس وقت تھا اور نہ اُجلا لباس۔ اس نے سر کو بے دلی سے جھٹکا اور بوجھل قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔

.....❁.....❁.....

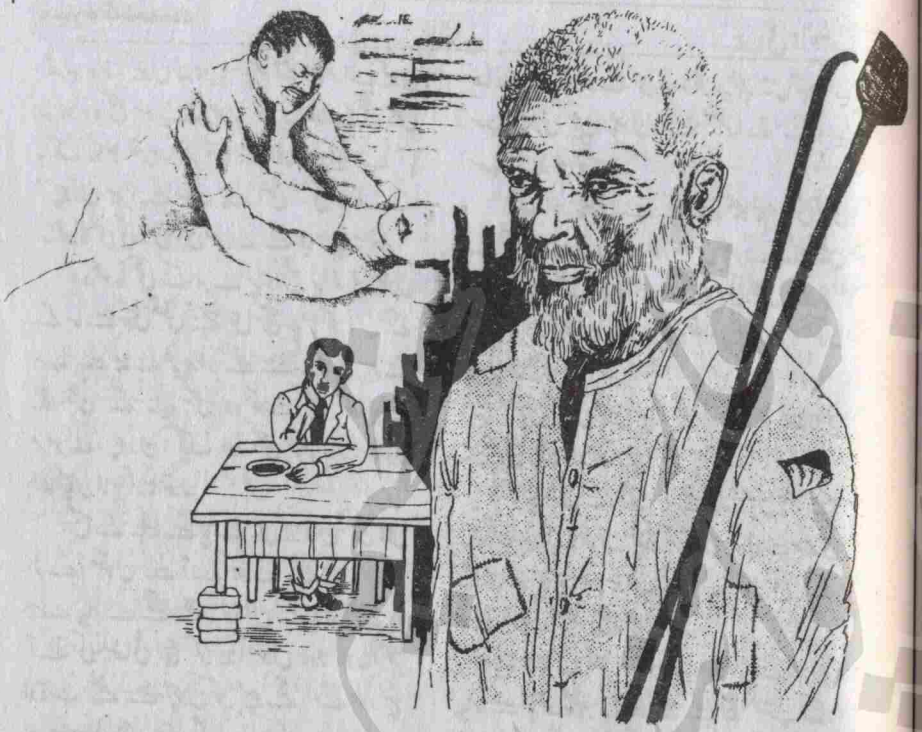

لطیف کاشمیری

دعوے دار

اسے فوراً خیال آیا کہ سکھ کے لمحوں میں بھی رشتہ دار قریب نہیں آئے تو بھلا اس غربت اور بیماری میں اسکے کام کون آئے گا۔ ابھی وہ چارپائی کے بازو پر جھکا دوا کی خوراک پینے کیلئے پیالی منہ کے قریب لے جا رہا تھا کہ شیرو اور کرم الٰہی کواڑ کھول کر کھولی میں داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر بابا کی آنکھوں میں ایک سکون آمیز چمک سی پیدا ہوگئی۔

ایک شخص کی محرومیوں کی کہانی، تنہائی ہی اس کا واحد ''اثاثہ'' تھی

بابا حسنا آج تنہا تھا۔ پتھر کی طرح خاموش اور سرما کی طویل رات کی طرح اُداس۔ اتنا ہی تنہا جتنا روز اول کو تھا۔ جب وہ اپنا الم غلم سامان سمیٹے اور خالی خوانچہ بغل میں دبائے محلے میں وارد ہوا تھا اور اس تنگ و تاریک سی کھولی میں اُترا تھا۔ اپنی ادھیڑ عمری کے باوجود اس وقت وہ بڑا چاق و چوبند تھا اور بڑی باقاعدگی کے ساتھ صبح سویرے گلی کے نکڑ پر خوانچہ لگایا کرتا تھا۔ چاہے کتنا ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شدید جاڑا کیوں نہ ہو یا موسم کتنا ہی خراب کیوں نہ ہو وہ صبح سویرے چھابا سر پر اٹھائے گلی میں ہانک لگاتا ضرور نظر آتا۔ ''مٹھائی والا اے'' یا ''چورن میرا ہے سب سے اعلیٰ'' کی ہانک کے ساتھ کانسی کی دستی گھنٹی مزے سے بجاتا جاتا تھا۔

وہ عموماً گلی کے سرے پر واقع پرائمری سکول کے سامنے پہلی گھنٹی بجتے ہی پہنچ جاتا کہ اس کے سب سے بڑے خریدار ننھے منے بچے ہی ہوتے تھے جن کے لیے کبھی وہ کھٹ مٹھی مٹھائیاں، مرمرے، چورن، کچک اور کبھی نرم اور بھربھری خطائیاں لایا کرتا تھا۔

صبح کے ہلکے ہلکے پالے میں جزدان بغل میں اڑسے، سکول سے آتے ہوئے ننھے بچے اسے بڑے پیارے لگتے تھے۔ وہ ان کے ہاتھ آنے دو آنے کی مٹھائی بیچ کر بڑا خوش ہوتا اور اکثر اوقات ننھے منے بچوں کو ''چونگے'' کے طور پر چوسنے والی ایک ایک گولی دے کر پیار سے ان کے شانوں کو تھپتھپا بھی دیا کرتا تھا۔ شاید اسے احساس تھا کہ کبھی وہ بھی اسی طرح ایک معصوم بچہ تھا یا اس کے پیچھے اس کے باپ ہونے کی حسرت یا لاشعور میں کلبلاتی پدرانہ شفقت کارفرما تھی۔

ایک بار ایک بچے نے اس کے مشفقانہ رویے سے متاثر ہو کر تجسس کے طور پر اس سے پوچھ ہی لیا ''باباجی! آپ کا اپنا کوئی بچہ نہیں ہے؟''

اس کی سپید ڈاڑھی والے بشرے پر ایک تقدس آمیز چمک اور مغموم سی آنکھوں میں شفقت و محبت کا نور سا پھیل گیا۔

''کیوں نہیں!'' بابا حسنا زیرلب مسکرایا مگر اس کی مسکراہٹ کے عقب میں ایک نظر نہ آنے والا موہوم سا کرب بدستور جھلکتا رہا۔ اس نے جھریوں بھری پیشانی کو پگڑی کے کنارے سے صاف کرتے ہوئے کسی قدر فخریہ لہجہ میں کہا ''یہ سب پھول ہیں پھول، ہنستے مسکراتے بچے، یہ سب اپنے ہی تو ہیں۔''

ایک اور پھول سے بچے نے ہمجولیوں کی ٹولی سے نکل کر بڑے ملائم اور تجسس بھرے لہجے میں پوچھا ''بابا آپ کا رشتہ دار بھی کوئی نہیں ہے؟''

ایک تحیرانہ کیفیت نے بچے کو تصویر حیرت کا نمونہ بنا دیا تھا۔

''ہیں کیوں نہیں بیٹا! مگر غریب کا بھلا دنیا میں کون رشتہ دار بنتا ہے؟''

''کیا شب کے شب بڑے لوگ ہیں؟'' بچے نے گردن ایک طرف جھکا کر کمال سعادت مندی کے ساتھ پوچھا اور جواب کے انتظار میں اس کے منہ کی طرف ٹکر ٹکر تکنے لگا۔

بابا حسنا بے اختیار ہنس دیا اور اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا ''شب کے شب بڑے لوگ نہ سہی مگر ان کا سا دماغ تو رکھتے ہیں لیکن بیٹا یہ باتیں تیرے ننھے سے بھیجے میں نہیں آئیں گی۔''

صبح سویرے اور وقفہ کے دوران بچے بابا کے گرد یوں جمع ہوئے رہتے تھے جیسے چھتے کے گرد گنگناتی ہوئی شہد کی مکھیاں۔ ابھی ایک بچے نے کچھ پیسے دے کر گول گول بھربھری خطائیاں خریدی ہیں تو ابھی دوسرے نے ایک آنے کی چوسنے والی گولیاں سینے پر سجی ننھی سی جیب میں ٹھونسی ہیں۔ ابھی ایک بچہ ''چونگا'' لینے کے لیے ٹھنک رہا ہے اور دوسرا رنگ برنگی مٹھائیوں اور بھربھری خطائیوں سے بھرے چھابے کو ایک طرف ہٹ کر بس حسرت بھری نظروں سے تکے جا رہا ہے۔ ایسے بچوں کی حسرتناک نظریں بھالے کی انی بن کر بابا کے جگر کو چھیدنے لگتی تھیں۔ وہ ان

نظروں کو فوراً بھانپ لیا کرتا۔ ایسے بچوں کو تہی دامنی کا احساس دلائے بغیر وہ اپنے پاس بلاتا۔ ان کے سر پر یوں شفقت بھرا ہاتھ پھیرتا جیسے وہ اس کے نہایت قریبی رشتہ دار ہوں۔ پھر اپنے چھابے کا شیشوں جڑا ڈھکنا کھول کر ایک ایک مٹھائی چپکے سے ان کے ہاتھ میں تھما دیتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے سوالی ہاتھ بابا حسنا کے ہاتھ کی طرف لپکنے لگتے مگر وہ ''چلو ہٹو'' کی مصنوعی غصہ ملی صدا کے ساتھ گھنٹی اٹھا کر اس زور سے بجانے لگتا کہ بات بات پر چونگے کے لیے دست سوال دراز کرنے والے نٹ کھٹ بچے نو دو گیارہ ہونے لگتے۔ اس کی کانسی کی گھنٹی دیر تک ایک شیریں نغمہ بن کر فضا میں گونجتی رہتی اور کھلنڈرے بچوں کے کانوں میں مٹھاس گھولتی رہتی۔ پھر جب سکول کی پے بہ پے بجتی گھنٹیاں بچوں کو بلانے لگتیں تو ایک بے پایاں شور و غل کے ساتھ بچے سکول کے پھاٹک کی طرف بے تحاشا لپکنے لگتے۔ بابا حسنا ان گرتے پڑتے بچوں کو سکول کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھتا تو اپنائیت اور محبت کا ایک عجیب سا احساس اس کے دل میں گدگدی سی پیدا کرنے لگتا۔ اس وقت اسے خیال آتا کہ کبھی وہ بھی انہی کھلنڈرے بچوں کی طرح شوخ و شنگ اور بے فکرا تھا اور انہی کی طرح صبح کے پالے میں ہنسی خوشی سکول جایا کرتا تھا پھر یتیم کیا ہوا کہ پڑھائی کا سلسلہ منقطع ہو کر رہ گیا۔ تب اس نے محنت مزدوری کر کے اپنا اور ماں کا پیٹ پالنے میں عافیت جانی۔ ماں اسے کس قدر پیار کرتی تھی۔ اس کے پیار کا تصور اس کی زندگی کی سب سے بڑی پونجی تھی۔ وہ اس کے چہرے پر غم کی گرد یا پریشانی کا سایہ تک نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ماں کا پیار ہی تھا جو اسے جینے کا حوصلہ اور زندگی کی تلخیوں کا مقابلہ کرتے رہنے کی قوت بخشتا تھا مگر ماں کے آنکھیں میچتے ہی وہ اپنے آپ کو تنہا، بے سہارا اور غیر محفوظ سا محسوس کرنے لگا تھا۔ اسے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سرما کی کسی برفیلی اور طوفانی رات کو کسی اجاڑ اور سنسان بیاباں میں وحشی درندوں کے درمیان گھر کر رہ گیا ہو۔

پھر ایک مدت تک وہ راستے کا پتھر بنا لڑھکتا رہا اور زمانے کی ٹھوکروں کی زد میں رہا پھر اسے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے نہ جانے کتنے جتن کرنا پڑے اور زمانے کی کتنی ذلتیں اور سختیاں سہنا پڑیں۔ کئی بار اس کا دھیان آتے ہی بابا حسنا کا دل اچانک بھر آتا اور اس کی سپید پلکوں کے کناروں پر نامعلوم سی نمی تیرنے لگتی جسے وہ اکثر اپنے میلے صافے کے کنارے سے پونچھ ڈالتا۔

کبھی چارپائی پر بیٹھے بیٹھے اس کے دل میں جانے کیا خیال آتا کہ وہ حقے کی نے منہ میں دبائے ہوئے بے اختیار مسکرا دیتا۔ شاید اس لمحے اسے زمانے کی ستم ظریفیوں کا خیال آ جاتا ہو یا شاید اپنی زندگی کو بے مصرف اور بے مقصد تصور کر کے ایک زہرخندسی اس کے لبوں پر پھیل جایا کرتی تھی۔

ایک روز اس کے شناساؤں میں سے دو ایک خوانچہ فروشوں نے فرصت کا وقت دیکھ کر اسے آ گھیرا اور اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرنے لگے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے دوران شیرو نے یونہی شاید مذاقاً اس سے وہی سوال کر ڈالا جو ایک بار ایک ننھے بچے نے بھی اس سے پوچھا تھا۔ شیرو اپنی گھنی مونچھوں کے کنارے سے برابر مسکرا رہا تھا اور اپنے سوال کو دہرا رہا تھا۔

''بابا حسن دین! میں نے پوچھا تھا کہ آپ کے کوئی بچے نہیں ہیں؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر.....

☆اگر اللہ تعالیٰ تمہاری دعائیں پوری کر رہا ہے تو وہ تمہارا یقین بڑھا رہا ہے۔

☆اگر وہ تمہاری دعائیں پوری کرنے میں دیر کر رہا ہے تو وہ تمہارا صبر بڑھا رہا ہے۔

☆اگر اللہ پاک تمہاری دعاؤں کا جواب نہیں دے رہا تو وہ تمہیں آزما رہا ہے۔

☆☆☆

''کیوں نہیں ہیں!'' بابا حسنا نے اپنی ڈھیلی ڈھالی پگڑی کو اچھی طرح سر پر جماتے اور سکول کے احاطے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ سب ہنستے دوڑتے چوکڑیاں بھرتے بچے اپنے ہی تو ہیں۔''

شیرو کے ساتھی کرم الٰہی نے شرارت سے ہنستے ہوئے طنزاً اضافہ کیا ''ارے میاں! یہ جگت ابا ہیں جگت ابا۔ یہ سب کے ہیں مگر ان کا کوئی نہیں۔''

شیرو، بابا کی بات سے کسی قدر کھسیانہ ہو گیا اور اپنی خفت مٹانے کے لیے کہنے لگا ''نہیں میرا مطلب ہے بابا! آپ کے اپنے بیوی بچے؟''

اس کا بابا حسنا نے صرف ایک پھیکی ہنسی کی صورت میں جواب دیا۔ اس پھیکی ہنسی میں اس کی زندگی بھر کی تلخی اور محرومی پڑی کراہ رہی تھی۔ اس وقت اس کی آنکھوں کے کناروں سے حسرت آمیز تحیر سا بھی جھلک رہا تھا۔

شیرو نے پھر پوچھا ''بابا بھلا آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟''

بابا حسنا تھوڑی دیر تک پتھریلے بُت کی طرح ساکن و جامد کھڑا رہا۔ اس کی اُداس آنکھوں میں یاس کے سائے اُترتے رہے اور وہ دُور افق پر رواں بادلوں کے شفق رنگ ڈولے کو بدستور گھورتا رہا پھر اس کریہناک کیفیت کو جھٹک کر خود ہی کہنے لگا ''ارے بھائی! محنت مشقت میں برسوں جتا رہا۔ شادی کا خیال ہی نہیں آیا۔ پھر میں نے اپنے چھابے سے جو بیاہ رچا لیا تھا۔ یہی میرا سب کچھ تھا اور سب کچھ ہے۔''

کرم الٰہی کے دل میں غم نصیب بوڑھے کے لیے یکا یک ہمدردی جاگ اُٹھی۔

''بابا! اس چھوٹی سی چھابڑی سے آپ کی گزر بسر ہو جاتی ہے؟''

بابا کے ستے ہوئے چہرے پر قناعت اور تیقن کی ایک لازوال جھلک نمایاں تھی۔ ''مولا کارساز ہے میاں! اتنا کچھ دے ہی دیتا ہے کہ ہاتھ پھیلانے کی حاجت نہیں رہتی۔''

کچھ ہی روز بعد شیرو اور کرم الٰہی بابا حسنا کے گھر پہنچ گئے۔ بابا نے انہیں اپنے ہاتھ سے گرم گرم چائے بنا کر پلائی اور ساتھ کھانے کو خستہ و شیریں خطائیاں بھی دیں۔ چائے پی کر شیرو پالتی سے اُٹھ کر بابا حسنا کے سرہانے بیٹھ گیا اور بڑی محبت اور عقیدت سے اس کا سر دابتے ہوئے کہنے لگا،

''بابا! معلوم ہوتا ہے آپ نے زندگی میں بڑے دکھ جھیلے ہیں۔ ہمیں اپنا ہم پیشہ ہی نہیں بلکہ اپنا ہمدرد اور دکھ سکھ کا شریک سمجھیں۔''

بابا نے لیٹے لیٹے گٹھڑی کے کھسکتے سرہانے کو اچھی طرح سر کے نیچے جماتے ہوئے متشکرانہ نظروں کا رُخ ان دونوں کی جانب پھیر دیا۔

اس دن کے بعد شیرو اور کرم الٰہی بابا کی خیر خیریت دریافت کرنے اکثر اس کی کھولی میں

جھانکنے لگے۔ بیماری نے بابا حسنا کو چلنے پھرنے سے معذور کر دیا تھا اور اس کی مالی حالت بھی ابتر کر کے رکھ دی تھی۔ جب بیماری نے کچھ طول پکڑا تو اس کے پڑوس میں رہنے والے اللہ بخش قصائی اور اس کی جورو بیمار پرسی کے لیے متواتر آنے لگے۔

اب نقاہت کے کارن وہ اپنی جھلنگا چارپائی پر لیٹا میلا چکٹ لحاف اوڑھے دن بھر چھت کی کالی کڑیاں گنتا رہتا۔ بالکل اس طرح جیسے وہ چھابے کے کونے میں دھری صندوقچی میں رکھی ریزگاری گنا کرتا تھا۔ کئی دن سے اسے بخار آ رہا تھا اور وہ بخار کی تپش میں کبھی کبھی بے سدھ سا پڑا رہتا۔ کبھی کبھی کھانسی کا ریلا سا آتا تو وہ اندر کو دھنستی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر بے طرح کھانسنے لگتا اور کھانستے کھانستے بے دم سا ہو جاتا۔ لگاتار کھانسنے سے بلغمی تھوک کی لیسدار نمی اس کی ڈاڑھی پر چپکنے لگتی جسے وہ اپنی آستین سے بمشکل صاف کر پاتا۔ اس وقت اس کے چہرے پر عجیب سی پژمردگی اور بے بسی عود کر آتی اور آنکھوں میں بے چارگی کے اندوہناک سائے اُترتے۔

ایک شام بابا حسنا کی حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ اس کے بدن پر رعشہ سا طاری رہنے لگا اور وہ بخار کی شدت میں بڑبڑانے لگا جیسے وہ اپنے کسی عزیز یا رشتہ دار کو بلا رہا ہو یا شاید وہ اپنے متعلق یا اپنے اثاثے کے بارے میں کوئی وصیت کرنا چاہتا تھا۔ اس کی آنکھیں کواڑوں پر ٹکی تھیں۔ ان آنکھوں میں انتظار کی ایک کیفیت کے پہلو بہ پہلو ایک حسرتناک اُداسی تڑپ رہی تھی۔ کاش دُکھ درد کے ان بوجھل لمحوں میں اس کا کوئی اپنا قریب ہوتا۔ پھر اسے فوراً خیال آیا کہ سکھ کے لمحوں میں بھی رشتہ دار قریب نہیں آئے تو بھلا اس غربت اور بیماری میں اس کے کام کون آئے گا۔

ابھی وہ چارپائی کے بازو پر جھکا دوا کی خوراک پینے کے لیے پیالی منہ کے قریب لے جا رہا تھا کہ شیرو اور کرم الٰہی کواڑ کھول کر کھولی میں داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر بابا کی آنکھوں میں ایک سکون آمیز چمک سی پیدا ہو گئی۔ شیرو اور کرم الٰہی بابا کی حالت پر اظہار افسوس کرنے لگے پھر انہوں نے ایک دوسرے کی سمت بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ معاً کرم الٰہی نے مڑ کر شیرو سے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا،

''تجھے معلوم ہے شیرو! بابا حسنا میرا نزدیکی رشتہ دار ہے۔ بہت عرصہ پہلے ہم دونوں چوک فوارہ میں چھابڑی لگایا کرتے تھے۔ یہ ہمارے ہی گھر میں رہا کرتا تھا پھر ایک روز جانے کس بات پر لڑ جھگڑ کر گھر سے چلا آیا تھا۔ وہ میرا سگا.....''

اتنا سن کر شیرو کو معاً طیش آ گیا۔

''تیری آنکھیں کہہ رہی ہیں بچو کہ تو جھوٹ بکتا ہے۔ بابا تیرا بالکل کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔''

کرم الٰہی کچھ دھیما پڑ گیا۔ پھر کسی قدر کھسیا کر بولا ''نہیں شیرو! مجھے پروردگار کی قسم۔ میں سچ.....''

شیرو نے غصیلے انداز میں شیر کی طرح گرج کر اس کی بات کاٹ دی۔ ''سچ کبھی زندگی میں بھول کر بھی بولا ہے کرے! تو بڑا کائیاں بنا پھرتا ہے۔ مجھ سے زیادہ چالاکی کی بات نہ کر۔ بھلا تو کہاں سے بابا کا رشتہ دار نکل آیا۔ مولا قسم، رشتہ دار تو وہ میرا ہے۔ تُو تو صرف اس کی کھولی پر قبضہ جمانے اور اس کا اثاثہ ہتھیانے کی فکر میں رشتہ داری جتانے چلا آیا ہے۔''

یہ بات کرم الٰہی کو خنجر کی نوک بن کر چبھی۔ اسے بھی اشتعال آ گیا اور آستینیں چڑھا کر اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھی سے الجھنے کے لیے تیار ہو گیا۔ پھر دونوں میں باقاعدہ گالی گلوچ اور ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ یہ شور و ہنگامہ سن کر قریبی مکان سے اللہ بخش قصائی دوڑتا ہوا آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کی جھگڑالو جورو بھی آ دھمکی اور خشمگیں لہجے میں تنک کر بولی: ''اے دفعان بھی ہو جاؤ بدبختو! ہمارے باباجی کی جان پر بنی ہے اور یہ موئے جانے کہاں سے اس کے رشتہ دار بن کر آ ٹپکے ہیں۔ پاکھنڈی اپنا حق جتانے لگے ہیں۔ کھولی تو کرائے کی ہے۔ کرائے کی۔ بابا تو ہمارا ہمسایہ ہے اور ہمسایہ ماں جایا ہوتا ہے اور دیکھو خبردار جو کسی نے باباجی کی پوٹلیوں یا گٹھیوں کو ہاتھ لگایا تو۔''

پھر وہ اپنے خاوند کو آنکھ کے اشارے سے قریب بلا کر اس کے کان میں رازدارانہ انداز میں کہنے لگی ''بابا پرانے زمانے کا آدمی تھا اور پرانے زمانے کے لوگ اپنا مال متاع بڑا سنبھال سنبھال کر رکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اب بھلا مجھے کیا معلوم کہ بڈھے نے اپنی نقدی اور اشرفیاں کہاں چھپا کر رکھی ہوئی ہیں؟''

بابا حسنا کی حالت لحہ بہ لحہ غیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی جان آنکھوں میں اٹکی تھی اور وہ اپنے زبردستی کے رشتہ داروں کو لڑتے جھگڑتے دیکھ کر تھکی تھکی آنکھوں سے احتجاج کر رہا تھا۔ اس کا دل اندرونی کرب سے ڈوب رہا تھا اور اس پر سکرات کا عالم طاری تھا۔

اللہ بخش نے بابا حسنا کی طرف نظر بھر کر دیکھا اور اطمینان کا سانس لیتے ہوئے صلاح دی ''لڑائی جھگڑا نہ کرو کم بختو! ابھی بڈھے کی آنکھوں میں جان باقی ہے۔ ذرا اسے آنکھیں میچ لینے دو پھر اٹھائے یا اشرفیوں کے حصے بخرے کرتے رہنا۔''

یہ صلاح سب کو بھائی۔ جونہی بابا نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں میچ لیں تو اس کے ڈھیل چہرے پر ایک نورانی ہالہ اور سکون کی کیفیت اُبھر آئی۔ سرما کی یخ بستہ طویل رات دم توڑ چکی تھی اور سب دعویدار ایک دفعہ پھر بڑھ چڑھ کر اپنے رشتہ دار ہونے کا دعویٰ کرنے لگے تھے اور بابا کے صحیح قانونی وارث ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔

البتہ ٹوٹتی رات کے اندھیرے میں سب دعویدار اس وقت اچانک روپوش ہو گئے اور یہ ہنگامہ مکمل طور پر فرو ہو گیا۔ جب اللہ بخش کی لڑاکا جورو نے لکڑی کا بکس اور گٹھیاں، پوٹلیاں کھول کھول کر غصے سے زمین پر پٹخنی شروع کر دیں۔ وہاں اشرفیوں یا روپوں کی جگہ ننھے منے بچوں کے لیے رکھی ہوئی ٹافیاں اور مٹھائی کی چوسنے والی گولیاں پڑی تھیں۔ صرف ایک گٹھی میں سات روپے اور کچھ ریزگاری تھی۔ ظاہر ہے اس سے بابا حسنا کے کفن دفن کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا۔

اب کمرہ پھر خالی پڑا تھا اور بابا حسنا ہمیشہ کی طرح پھر تنہا تھا۔ سرما کی طویل یخ بستہ رات کی طرح سنسان اور پتھر کی طرح خاموش۔

دوسرے روز بابا حسنا کے مرنے کی اُڑتی ہوئی خبر سکول کے احاطے میں پہنچی تو بابا سے مانوس بہت سے ننھے منے بچے سسک سسک کر روئے اور دن بھر خاموش اور کھوئے کھوئے سے رہے۔

دوپہر تک جب میونسپل کمیٹی والوں کو کسی نے اطلاع دی تو انہوں نے بابا حسنا کی لاوارث لاش کو کفنا کر کرائے کے آدمیوں کے ذریعے قریبی قبرستان میں دفنا دیا۔

.....❁.....❁.....

سیارہ مشورہ کلینک

ڈاکٹر ندیم چوہدری

ڈاکٹر ندیم چوہدری 28 سال سے لاہور میں پریکٹس کر رہے ہیں۔ آپ نے ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، آیورویدک سائنس اور یونانی سسٹم آف میڈیسن کا بغور مطالعہ کر رکھا ہے۔ مریضوں کا علاج کرتے ہوئے آپ تمام طریقہ ہائے علاج میں سے مناسب ترین ادویہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ جس گروپ کی دوائی تجویز کی جاتی ہے بالکل اسی گروپ کی غذا بھی مریض کو استعمال کروائی جاتی ہے۔ نتیجتاً مریض کی تکلیف بہت جلد کم ہونا شروع ہو جاتی ہے اور مریض اپنے مرض سے مکمل طور پر چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ آپ ہر طرح کے مرض کا علاج کرتے ہیں لیکن بالخصوص آپ کو معدہ، جگر اور جنسی امراض کے علاج میں خصوصی مہارت حاصل ہے۔ ہزاروں مریض آپ کے ذریعے سے شفایاب ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس فن میں مزید ترقی دے (آمین)

آپ میڈیکل ریسرچ سکالر بھی ہیں۔ آپ کے مضامین کئی نیشنل اور انٹرنیشنل اخبارات اور رسالوں مثلاً حکایت، نوائے وقت، دبئی نیوز وغیرہ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعہ سے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو بہت زیادہ طبی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ لوگوں کی ایک کثیر تعداد نے ان معلومات پر عمل کیا اور نتیجتاً وہ صحت مند زندگی بسر کر رہے ہیں۔

سیارہ ڈائجسٹ نے آپ کی طبی خدمات سے استفادہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور آپ کو دعوت دی ہے کہ اپنی طبی قابلیت کے جوہر ان صفحات کی زینت بنائیں۔ اس سلسلے کا پہلا حصہ مشورہ کلینک کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔

نظر کمزور ہو رہی ہے

کراچی سے اختر زمان کا خط آیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ میری عمر 25 سال ہے۔ بچپن میں میری نظر بالکل ٹھیک تھی۔ سکول کی تعلیم کے دوران مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اب تین چار سال سے میری نظر اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ میں عینک لگائے بغیر مطالعہ نہیں کر سکتا۔ مہربانی فرما کر میری مدد فرمائیں اور کوئی اچھا سا نسخہ تجویز فرمائیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تا کہ میری نظر بالکل ٹھیک ہو جائے اور مستقبل میں میں عام نوجوانوں کی طرح اپنی زندگی کی مصروفیات کو جاری رکھ سکوں۔

☆ بیٹے اختر زمان آپ واقعی ایک خطرناک مسئلے کا شکار ہیں۔ آج کل کے دور میں راتوں کو دیر تک جاگنا اور بالخصوص کمپیوٹر پر بیٹھ کر لگاتار کئی گھنٹے کام کرنا لوگوں کا معمول بن چکا ہے۔ پہلے وقتوں کے لوگ ایک ٹائم ٹیبل کے مطابق کام کرتے تھے اور اس کے بعد بھرپور نیند لیتے تھے۔ ان کی نہ صرف نظر آج کل کے نوجوانوں سے بہتر ہوتی تھی بلکہ ان کا پورا جسم ٹوٹل فٹنس کی ایک مکمل تصویر ہوتا تھا کیونکہ وہ مناسب ورزش کی طرف بھی بھرپور توجہ دیتے تھے لیکن آج کل ان چیزوں کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں۔ بہرحال آپ کے لیے ضروری ہے کہ اپنی نیند ہر حال میں پوری کریں اور ساتھ ساتھ ورزش کی طرف بھی توجہ دیں نیز آپ مندرجہ ذیل ادویات کا استعمال لگاتار تین چار ماہ تک جاری رکھیں (۱) Ruta 30 تین تین قطرے ایک گھونٹ پانی میں ڈال کر دن میں تین بار پی لیا کریں۔ (۲) کلکیر یا فلور 6x چار چار گولیاں دن میں چار بار نیم گرم پانی کے ساتھ کھا لیا کریں۔ (۳) اس کے ساتھ ساتھ ایک دوائی M-48 خرید لیں۔ اس کے دس دس قطرے ایک گھونٹ پانی میں ڈال کر دن میں تین بار پی لیا کریں۔

اپنی غذا میں کشمش اور بادام کا استعمال زیادہ کریں۔ علاوہ ازیں سیب، انار اور کھجور بھی آپ کے لیے مفید غذائیں ہیں۔

ہاتھوں کی کلائیاں بچوں کی طرح ہیں

راولپنڈی سے سلیم عباس لکھتے ہیں: ڈاکٹر صاحب السلام علیکم! امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری عمر 20 سال ہے لیکن میرے ہاتھوں کی کلائیاں 8 یا 10 سال کے بچے کی طرح لگتی ہیں۔ یہ کمزوری کسی طرح ختم نہیں ہوتی۔ اگرچہ میں خوراک بھی اچھی استعمال کرتا ہوں مگر جب دوڑتا ہوں یا کوئی کھیل کھیلتا ہوں تو پسلیوں کے نیچے درد شروع ہو جاتا ہے۔ ذہنی صلاحیت بھی عام لوگوں سے کم ہے اور جسم کے دیگر حصے بھی کمزوری کا شکار ہیں۔ شاید یہ ماضی میں کی جانے والی غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ آپ مناسب راہنمائی فرمائیں اور بہترین دوائی تجویز فرمائیں۔ اللہ آپ کا بھلا کرے۔

☆ سلیم بیٹے! آپ کا خدشہ درست ہے۔ آپ ضرور ماضی میں نامناسب حرکات کے مرتکب ہوتے رہے ہیں۔ اب تو یہ کیجئے کہ نماز پنجگانہ پابندی سے ادا کیجئے، بہتر خوراک استعمال کیجئے اور ٹائم ٹیبل کے مطابق ورزش بھی کریں۔ ساتھ ساتھ آپ مندرجہ ذیل ادویات کچھ عرصہ تک استعمال کریں۔

(۱) ایسڈ فاس 5-5Q قطرے ایک گھونٹ پانی میں ڈال کر دن میں تین بار کھانے کے دوران پی لیا کریں۔ (۲) چائنا Q کے 10-10 قطرے ایک گھونٹ پانی میں ڈال کر دن میں تین بار کھانے کے آدھا گھنٹہ بعد پی لیا کریں۔ (۳) بائیوفنکن شربت ایک ایک چمچ کھانے سے ایک گھنٹہ پہلے پی لیا کریں۔

پیشاب کی زیادتی سے تنگ ہوں

علی نواز صاحب حیدر آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں کہ میں سیارہ ڈائجسٹ کا بہت پرانا قاری ہوں۔ میری عمر 55 سال ہے۔ ویسے بھی میں شعبہ تدریس سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں اپنے

سٹوڈنٹس کو سیارہ ڈائجسٹ سے حاصل کردہ مواد کی روشنی میں بہترین لیکچر دیتا ہوں اور ان کو اس رسالے کی علمی بلندی سے آگاہ کرتا رہتا ہوں۔ چند ماہ سے میں ایک مسئلے کا شکار ہوں۔ عرض یہ ہے کہ مجھے پیشاب بہت زیادہ آتا ہے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ میں بعض اوقات چوبیس گھنٹوں میں 60دفعہ پیشاب کرتا ہوں۔ آپ مہربانی فرما کر مجھے اس مصیبت سے نجات دلائیں اور میرے لیے بہترین نسخہ تجویز فرمائیں۔

☆علی نواز صاحب! آپ کی تکلیف واقعی بڑی پریشان کن ہے۔ آپ ہومیو پیتھک دوا ایسڈ فاس Q کے دس قطرے فی خوراک آدھا گلاس تازہ پانی میں ڈال کر روزانہ دن میں تین بار پی لیا کریں۔ اس دوائی سے آپ کی یہ شکایت کافی حد تک ٹھیک ہو جائے گی۔ جسمانی کمزوری دور ہو جائے گی اور آپ کی یادداشت بہتر ہو جائے گی۔ مزید برآں آپ کے بال بھی مزید سفید ہونے سے محفوظ رہیں گے۔ آپ ٹھنڈی تاثیر والی تمام اشیاء سے پرہیز کریں اور اپنی غذا میں گرم مقوی چیزیں بڑھا دیں۔ اگر اس کے باوجود بھی مسئلہ حل نہ ہو تو اپنی پیشاب کی رپورٹ کرائیں اور میرے ساتھ بالمشافہ ملاقات کریں۔ تب آپ کی رپورٹ اور جسمانی مزاج کی روشنی میں مناسب دوائی تجویز کی جاسکتی ہے۔

بدن موٹا ہے، ہونٹ موٹے ہیں

ملتان سے مسعود بلوچ کا خط آیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ میں سیارہ ڈائجسٹ کافی عرصے سے پڑھ رہا ہوں۔ یہ واقعی ایک معیاری ڈائجسٹ ہے۔ اس ڈائجسٹ میں پایا جانے والا طبی مشوروں کا کالم بھی پریشان مخلوق خدا کے لیے بہت بڑا سہارا ہے۔

آج میں بھی اپنا ایک مسئلہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ امید ہے مایوس نہیں کریں گے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا جسم بہت موٹا ہو گیا ہے۔ یہ چیز میرے لیے سخت احساس کمتری کا باعث ہے۔ میری خواہش ہے کہ میرا جسم دبلا ہو جائے اور اس میں کشش پیدا ہو جائے۔ یاد رہے کہ میری چھاتیاں بھی بہت بڑھ چکی ہیں اور میرے ہونٹ بھی بہت موٹے اور بھدے ہیں۔ مہربانی فرما کر کوئی ایسی دوائی لکھیں جس سے میرے یہ تمام مسائل حل ہو جائیں۔ انکل پلیز مجھے احساس کمتری سے نجات دلائیں۔

☆عزیزم مسعود! آپ کے لکھے گئے خط کی روشنی میں محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے توازن کا دامن ہاتھ سے چھوڑا ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے آپ بہت زیادہ کھاتے ہوں اور پھر مناسب ورزش بھی نہ کرتے ہوں۔ جسم میں کسی ایک خلط کے بڑھ جانے سے ہی ایسا مسئلہ درپیش ہو سکتا ہے۔ بہرحال آپ ہومیو پیتھک دوائی (Dr.Reckweg) R-59 خرید لیں اور اوپر درج کردہ ہدایات کے مطابق استعمال کریں۔ انشاء اللہ اس دوائی کے استعمال سے آپ کے غدودی نظام میں پائی جانے والی پیچیدگیاں دور ہو جائیں گی۔ جب آپ کا غدودی نظام بالکل ٹھیک ہو جائے گا تو آپ کے جسم کی کیفیت ٹھیک ہو جائے گی اور انشاء اللہ آپ کا جسم متناسب اور پرکشش ہو جائے گا۔ آپ اپنی غذا میں سے آئس کریم اور دیگر ٹھنڈی اشیاء خارج کر دیں۔ سلاد میں ٹماٹر، پیاز اور مولی استعمال کریں۔ کھانا تھوڑا کم کھائیں اور روزانہ ورزش لازمی کریں۔ انشاء اللہ تعالیٰ آپ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

بیٹے کو ٹانسلز کی بیماری ہے

مسز ثمینہ آغا حسن ابدال سے لکھتی ہیں: ڈاکٹر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صاحب السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آپ لوگوں کو مشورے اور نسخے تجویز کر کے ایک بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس نیک کام کا اجر صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب! میں بھی چند مسائل لے کر حاضر ہو رہی ہوں۔ امید ہے کہ راہنمائی فرمائیں گے۔

میرا بیٹا جس کی عمر 12 سال ہے، کئی سال سے ٹانسلز کی بیماری میں مبتلا ہے۔ اس کا گلا اکثر خراب رہتا ہے۔ ہم اس مسئلے کے حل کے لیے بہت زیادہ دوائیاں استعمال کر چکے ہیں۔ صرف وقتی طور پر افاقہ محسوس ہوتا ہے اور مرض مستقل طور پر ختم نہیں ہوتا۔ اکثر گلے کے غدود سوج جاتے ہیں اور ان میں پیپ پڑ جاتی ہے۔ علاوہ ازیں بچہ نزلہ زکام کا شکار ہے جس کی وجہ سے اس کے سر کے بال سفید ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

محترم ڈاکٹر صاحب! میرے بیٹے کو اس اذیت ناک صورتحال سے نجات دلانے کے لیے کوئی اچھی سی دوائی تجویز فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے اور ہمیشہ صحت مند رکھے (آمین)

☆ثمینہ بیٹی! آپ اپنے بیٹے کو کھٹی، ٹھنڈی اور تلی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرائیں۔ علاوہ ازیں بہت زیادہ گرم گرم چائے پلانا بھی مناسب نہیں۔ آئس کریم، قلفی، برف کے گولے اور بوتل جیسی اشیاء مکمل طور پر بند رکھیں۔ ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل ہومیو پیتھک دوائیں کچھ عرصہ استعمال کرائیں۔

(۱) ٹیوبرکولینم 200 کے دو قطرے ایک گھونٹ پانی میں ڈال کر 8 دن بعد صرف ایک خوراک پلا دیا کریں۔ (۲) بیلا ڈونا 200 کے دو دو قطرے ایک گھونٹ پانی میں ڈال کر صبح دوپہر

خانپور میں سیارہ ڈائجسٹ کے سول ایجنٹ
تازہ شماروں، خاص اسلامی نمبروں اور
دیگر کتابوں کی خریداری کے لئے براہ کرم
چوہدری بشیر امانت
اینڈ برادرز
ریلوے روڈ۔ خانپور سے رابطہ کریں۔ Khanpur.Ph:72654
Email:sayyaradigest@gmail.com
پتہ لاہور آفس: 240، مین مارکیٹ ریواز گارڈن۔ فون: 042-7245412

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سائے

ایسی راتیں بھی کئی گزری ہیں
جب تری یاد نہیں آتی ہے
درد سینے میں مچلتا ہے مگر
لب پہ فریاد نہیں آتی ہے
ہر گنہ سامنے آجاتا ہے
جیسے تاریک چٹانوں کی قطار
نہ کوئی حیلہ، تیشہ کاری
نہ مداوائے رہائی، نہ قرار
ایسی راتیں بھی ہیں گزری مجھ پر
جب تری راہگزر میں سائے
ہر جگہ چار طرف تھے چھائے
کبھی آئے، کبھی بھاگے
کبھی بھاگے، کبھی آئے
تو نہ تھی، تیری طرح کے سائے
سائے ہی سائے تھے رقصاں
میں نہ تھا، میری طرح کے سائے
سائے ہی سائے تھے لرزاں لرزاں
سائے ہی سائے، تری راہگزر کے سائے
ایسی راتیں بھی ہیں گزری مجھ پر
جب تری یاد نہیں آئی ہے

محمد دین تاثیر

شام پلا دیا کریں۔(۳) Tonsitern ساختہ جرمنی کی ایک ایک ٹکیہ صبح دوپہر شام کھلا دیا کریں۔ ایک ماہ کے بعد دوبارہ مطلع کریں۔

منہ اور جسم کے دوسرے حصے بالوں سے محروم ہیں

معروف اقبال کوٹ ادو سے لکھتے ہیں: ڈاکٹر صاحب آداب عرض! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ میں سیارہ ڈائجسٹ پابندی سے پڑھتا ہوں بلکہ اس معیاری رسالے کے مطالعے کا شوق مجھے وراثت میں ملا ہے کیونکہ میرے والد صاحب بھی اس کے ریگولر قاری تھے۔ میرا مسئلہ کچھ یوں ہے کہ میرے منہ، ہاتھ پاؤں، بغل اور زیر ناف بال نہیں ہیں۔ میں نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے بڑی جگہوں سے علاج کرایا لیکن ذرا بھی فائدہ نہیں ہوا۔ منہ پر داڑھی نہ آنے کی وجہ سے میں سخت احساس کمتری کا شکار ہوں۔ کئی دوست مجھے مذاق کرتے ہیں۔ کیا اس مسئلے کو ختم کرنے کے لیے کوئی دوائی ہے؟ آپ سے درخواست ہے کہ میری مدد فرمائیں اور کوئی بہترین دوائی تجویز فرمائیں۔

☆معروف بیٹا! آپ کا خط ملا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ بہرحال آپ کا مسئلہ اتنا آسان اور سادہ نہیں ہے کیونکہ اس کا تعلق غدودی نظام سے ہے۔ آپ ہومیو پیتھک دوائی (Dr. Reckweg) R-19 ساختہ جرمنی خرید لیں۔ اس دوائی کے دس قطرے فی خوراک تھوڑے پانی میں ڈال کر دن میں تین بار پئیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں بلکہ اس کے حضور عاجزی سے دعا کریں۔ انشاء اللہ آپ کا مقصد حل ہو جائے گا۔

چہرہ کیل چھائیوں اور دھبوں سے بھرا ہوا ہے

شکیل قریشی جوہرآباد سے لکھتے ہیں: ڈاکٹر

صاحب! میں اپنے چہرے پر پائے جانے والے کیل، چھائیوں اور داغ دھبوں سے سخت پریشان ہوں۔ یہ تکلیف مجھے پانچ سال سے ہے۔ سردیوں میں ان کی شدت کم ہو جاتی ہے جبکہ گرمیوں کے موسم میں تکلیف اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ آئینہ دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ اگر ان دانوں کو چھیڑا جائے تو ان کے اندر سے پانی جیسی رطوبت نکلتی ہے۔ میں نے اس تکلیف کا بڑی جگہوں سے علاج کرایا ہے مگر مسئلہ حل نہیں ہوا۔ اب تو یہ دانے پورے جسم پر پھیلنا شروع ہو گئے ہیں۔ براہ مہربانی اس بیماری کا کوئی بہترین نسخہ تجویز فرمائیں۔ میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں گا۔

☆شکیل بیٹے! آپ پریشان نہ ہوں۔ عالم شباب میں اکثر بچوں کو اس مسئلہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعض لڑکیوں یا لڑکوں کے چہروں پر ہلکے پھلکے دانے نمودار ہوتے ہیں جو کہ غذا میں مناسب تبدیلی کے ساتھ خود بخود ختم ہو جاتے ہیں جبکہ بعض لڑکوں اور لڑکیوں میں اس مسئلہ کی نوعیت انتہائی شدید ہوتی ہے۔ بہرحال آپ مندرجہ ذیل ہومیو پیتھک ادویات خرید لیں اور استعمال کریں۔

(۱) گریفائیٹس 30 ساختہ جرمنی کے تین تین قطرے ایک گھونٹ پانی میں ڈال کر صبح دوپہر شام پی لیا کریں۔ (۲) گریفائیٹس 200 ساختہ جرمنی کے دو قطرے ایک گھونٹ پانی میں ڈال کر ایک ہفتے بعد پی لیا کریں۔ (۳) کالی آئیوڈائیڈ 3x کی دو دو ٹکیاں دن میں تین بار کھا لیا کریں۔ دو ماہ کے بعد دوبارہ مطلع کریں۔

کان سے پیپ بہتی ہے

تنویر انور کھرل حافظ آباد سے لکھتے ہیں: ڈاکٹر صاحب السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں نے سیارہ ڈائجسٹ میں آپ کا کالم پڑھا تو میرے دل میں امید کی کرن پیدا ہوئی۔ میرا مسئلہ کان سے پیپ نکلنے کا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کان میں کبھی کبھی درد بھی ہوتا ہے۔ میں نے بہت علاج کرایا۔ اس کے نتیجے میں کان کا درد تو ختم ہو گیا لیکن پیپ آنا بند نہ ہوئی۔ میں نے پاکستان نیوی میں سروس کے لیے اپلائی کیا لیکن انہوں نے مجھے میڈیکل ایگزامینیشن کے بعد ان فٹ قرار دے دیا۔ انہوں نے بتایا کہ میرے کان کے پردے خراب ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مجھے نیوی میں سروس کرنے کا بہت شوق ہے۔ مہربانی فرما کر کوئی ایسی دوائی تجویز فرمائیں جس سے میں جلدی ٹھیک ہو جاؤں تاکہ میرا نیوی میں جانے کا خواب پورا ہو سکے۔

تنویر بیٹے! آپ فکر نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ ہومیو پیتھک علاج سے بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے اور انشاء اللہ نیوی میں ضرور جائیں گے۔

آپ مندرجہ ذیل ادویات ساختہ جرمنی خرید کر کچھ عرصہ استعمال کریں۔

(۱) سیلشیا 200 کے دو قطرے ایک گھونٹ پانی میں ڈال کر ایک ہفتے کے بعد پی لیا کریں۔ (۲) سیلشیا 6x کی چار چار گولیاں دن میں چار بار نیم گرم پانی کے ساتھ کھا لیا کریں۔ (۳) کالی میور 30 کے دو دو قطرے ایک گھونٹ پانی میں ڈال کر دن میں تین بار پی لیا کریں۔

ہر قسم کے ضدی اور پیچیدہ امراض کے مستقل شافی علاج کے لیے ڈاکٹر ندیم چوہدری سے ان فون نمبرز پر رجوع کریں۔

0333-4450636,0313-4450636

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

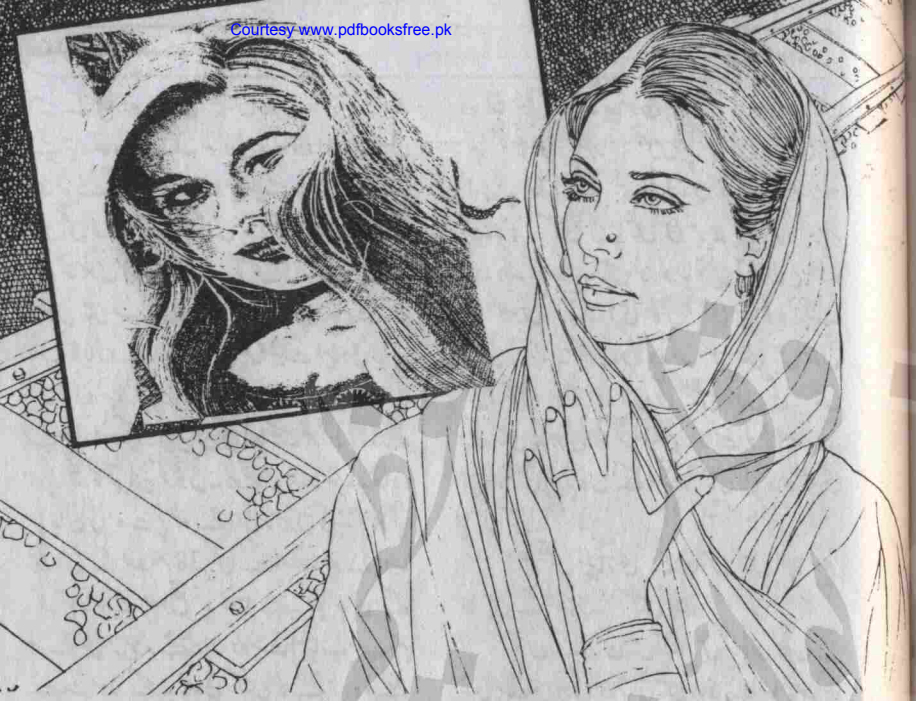

عذرا اصغر

میزبان دوشیزہ

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کا المناک المیہ.....
جسے گھریلو ذمہ داریوں کے بوجھ نے عشرت کدے کی رونق بنا دیا!

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں روزگار کی تلاش میں شہر شہر دھکے کھاتی پھر رہی تھی۔ میرے ناتواں کاندھوں پر یکا یک ذمے داریوں کا بوجھ لاد دیا گیا تھا۔ اس میں کسی انسان کا دخل ہوتا تو میں احتجاج کرتی، چیختی چلاتی مگر میرے ساتھ ہونے والا سانحہ تو مشیتِ ایزدی کی طرف سے تھا جس کا تدارک کسی انسان کے بس میں نہ تھا۔ میرا نقصان کوئی ذی روح پورا نہ کر سکتا تھا ہاں البتہ اس نقصان کا کچھ ازالہ مجھے نوکری دے کر پورا کیا جا سکتا تھا مگر انسانوں کے اس باڑے میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو مجھے سہارا دیتا اور میری یکا یک نمودار ہونے والی ذمہ داریوں سے نبٹنے کا حوصلہ دیتا۔

میں نوکری کی تلاش میں در در بھٹک رہی تھی۔ یہ میرا ایم اے سوشیالوجی کا آخری سال تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے بعد میرا روشن مستقبل میرے استقبال کے لیے تیار تھا۔ میں ایک خوشحال، باوقار اور بااخلاق معاشرے کی علمبرداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے جا رہی تھی کہ اچانک مصیبتوں کے چنگل میں پھنس گئی اور گناہوں کی دلدل میں دھنس گئی۔ میں اپنی چھ بہنوں میں سب سے بڑی تھی اور اسی رعایت سے باپ کا بازو بننے جا رہی تھی مگر مشیت ایزدی یہ تھی کہ بازو سہارا بننے سے پہلے ٹوٹ جائے سو میں بے سہارا ہوگئی۔ ابا جان کی اچانک موت ہمارے اوپر اللہ کا قہر بن کر ٹوٹی۔ جو تھوڑا بہت سرمایہ تھا وہ ابا جان کی موت پر ہونے والی رسموں کی نذر ہوگیا اور اس کے بعد ہم فاقہ کشی سے ہمکنار ہوئے جیسا کہ عموماً ایسے مواقع پر ہوتا ہے۔ ابا جان کے مرتے ہی عزیز رشتے دار، دوست احباب سب ہم سے منہ موڑ گئے۔ چھوٹی بہنیں فاقے زدہ، پیلے چہرے لیے میرے سامنے آتیں تو کلیجہ دہل جاتا۔ چنانچہ حالات کے پیش نظر میں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ بند کر دیا اور نوکری کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ پانچ عدد چھوٹی بہنوں اور ایک ادھیڑ عمر ماں کا اب میں واحد سہارا تھی۔ سب کی نظریں مجھ پر گڑی تھیں۔ میں نے اپنی ذمہ داری شدت سے محسوس کی اور روزگار کے حصول کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگی۔ درخواستیں بھیجنا، انٹرویو دینا، دفتروں کے چکر کاٹنا اور مایوس لوٹنا میری زندگی کا معمول بن گیا۔ تب گھبرا کر میں نے سوچا کہ شادی کر لوں۔ اس طرح زندگی کی یہ گاڑی آسانی کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچ سکتی ہے۔ میری چھوٹی بہنوں کو باپ کا سہارا مل جائے گا۔ ماں کو ایک بیٹا اور مجھے فکر روزگار سے نجات..... اس تصور سے میرے دل میں شہنائیاں بجنے لگیں۔

جب میں سہیل سے اس امر کا ذکر کروں گی تو وہ کتنا خوش ہوگا۔ یہ سوچ کر میں مسکرا دی۔ سہیل کہا کرتا تھا ''شہناز! تمہیں پا کر میں دنیا کی ہر نعمت پا لوں گا۔ تم میری زندگی کا عظیم مقصد ہو شہناز۔'' سہیل کی باتیں سن کر میرا سر فخر و غرور سے بلند ہو جاتا۔ میں خود کو ساتویں آسمان پر اُڑتا ہوا محسوس کرتی۔ اپنی خوش نصیبی پر خود رشک کرتی۔ کتنا پرسکون ہوگا وہ گھر جس میں میں ہوں گی، سہیل ہوگا اور اس کی محبتیں ہوں گی۔ میں نشے میں مدہوش ہو کر سوچتی۔ رات کو خوبصورت سپنے دیکھتی اور دن کے وقت سہیل کی مدھ بھری باتیں سنتی۔

''ہم کسی پہاڑی کے دامن میں اپنا گھر بنائیں گے شہناز۔'' سہیل کہتا۔

''جس کے دامن میں آبشاریں گر رہی ہوں گی، ندی بہہ رہی ہوگی اور ترائی میں ہمارا پیارا سا چھوٹا سا گھر ہوگا جہاں تم ہوگی، میری زندگی کی بہار۔''

سہیل کا دکھایا ہوا خواب کس قدر حسین تھا۔ میں اس کے سہارے تمام زندگی بتا سکتی تھی مگر ہوا یوں کہ میرا سپنا ٹوٹ گیا اور خواب کرچی کرچی ہو کر بکھر گئے۔ اس وقت تو یہی لگتا تھا کہ میں حقیقت سے آنکھیں چار نہیں کر سکوں گی مگر حقیقت میرے روبرو کھڑی میرا منہ چڑا رہی تھی۔ مجھے حالات کا سامنا کرنا ہی پڑا۔

سہیل کی اپنی ذمہ داریاں اس قدر وسیع تھیں کہ وہ مزید ایک اور ذمہ داری اس کی بے پناہ ضرورتوں کے ساتھ قبول نہ کر سکتا تھا۔ پھر میں نے خود بھی ٹھنڈے دل سے غور کیا۔ اپنی اور اس کی اہل اور لامحدود ذمے داریوں کا جائزہ لیا۔ اس کی آمدن کا حساب ان اخراجات سے کیا جو میرے اور اس کے مشترکہ ہونے والے تھے تب میں نے فیصلہ کیا کہ یہ قطعی ممکن نہیں..... میں سہیل

کے ساتھ جیون کی ایک ڈور میں تو بندھ سکتی تھی مگر اس کی قلیل آمدن کی ڈور اتنی مضبوط نہ تھی کہ میرے اور اس کے دو خاندانوں کا بوجھ سہار سکے۔ سو میں نے سہیل کو اپنی ہر ذمے داری سے آزاد کر دیا اور اپنی قوت بازو پر بھروسہ کر کے شہر شہر بھٹکنے لگی۔ مجھے اپنے بازوؤں کی طاقت بہت کمزور لگی۔ میں جو اتنی بہادر، اتنی جواں ہمت، اس قدر دلیر تھی، ریت کی بھربھری دیوار کی طرح ڈھے گئی۔ جب میں کسی کی ذمہ داری تھی تب یہ دنیا کس قدر حسین تھی..... کتنی پرکشش، کتنی دل فریب..... دل میں اُمنگیں تھیں، ولولے تھے۔ آئندہ زندگی کے پربہار منصوبے تھے..... اور اب میں تنہا تھی اور میرے اردگرد پھیلے مہیب سناٹے..... سہیل ایک خوبصورت خواب بن چکا تھا جو میں نے کبھی دیکھا تھا اور اب وہ ادھورا، حسین سپنا میری پلکوں پر تھرکتا رہ گیا تھا۔ میں چاہتی تھی پھر وہی خواب مجھے نظر آئے، پھر اسی سپنے میں کھو جاؤں مگر پانچ جوان اور ایک ادھیڑ عمر ذمہ داری نے مجھے پلک جھپکنے کی بھی اجازت نہ دی۔ پھر سپنا کیسے دکھتا.....؟ ٹوٹے شیشے کی کرچیاں بھی بھلا کبھی جڑی ہیں! وہ تو بس اکٹھی کرنے کی چاہ میں انسان کے ہاتھ لہولہان کر دیتی ہیں۔ اور وہ سپنا جسے دیکھتے دیکھتے اچانک میری آنکھ کھل گئی تھی، میری آنکھوں میں باریک ریت کے چمکیلے ذروں کی طرح چبھا جا رہا تھا۔

وہ ایک عام سا دن تھا۔ آتی سردیوں کے دن ویسے ہی کچھ ہونق قسم کے ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ایک بوجھل سا دن وہ بھی تھا جب میں اسلام آباد کی ایک پرشکوہ عمارت سے ایک انٹرویو میں ناکام ہو کر نکل رہی تھی اور سر جھکائے چل رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ نوکری کی جدوجہد میں ایک ماہ گزر چکا تھا اور میرے گھر میں فاقوں کی نوبت آنے والی تھی۔ چھوٹی بہنوں کے بھوک سے زرد، نڈھال چہرے میرا دل دہلائے دے رہے تھے۔ ماں کے بوڑھے ہوتے ہوئے وجود پر اُداسیوں کے گمبھیر سائے تیرتے دیکھ کر میں سہمی جا رہی تھی..... کیا کروں؟ یہی ایک سوال میرے پیش نظر تھا اور میں سر جھکائے چل رہی تھی کہ کسی سے ٹکرا گئی۔ گھبرا کر میں نے دیکھا ''معاف کیجئے گا۔'' پختہ عمر کا وجیہہ شخص میرے سامنے کھڑا بڑے وقار سے مسکرا رہا تھا۔

''غلطی میری بھی تھی۔ میں بغیر آگے دیکھے چل رہی تھی۔'' میں نے لجاجت سے کہا۔

''اور میں جلدی میں تھا۔ آپ سے شرمسار ہوں۔'' وہ پھر بولا۔

''کوئی بات نہیں۔'' میں آگے بڑھنے لگی تو اس نے پکارا۔

''سنیے.....!'' اس کی آواز پر میں ٹھہر گئی۔

''کہیے!''

''آپ کی ذات میں مداخلت کر رہا ہوں۔'' میں مجسم سوال بنی کھڑی تھی۔

''آپ کچھ پریشان سی لگ رہی ہیں۔'' وہ بولا۔

''لیکن آپ کو اس سے کیا.....؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کے چہرے پر ملال دیکھ کر پوچھ بیٹھا۔ آپ کو ناگوار لگا تو معافی چاہتا ہوں۔ میں نے سوچا شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔''

''میں ایک انٹرویو میں ناکام ہو کر آ رہی ہوں۔'' مختصراً میں نے بتایا۔

''ارے.....بس.....'' وہ مسکرایا۔ ''محترمہ ناکامیاں تو کامیابیوں کا راستہ ہموار کرتی ہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''جی؟'' مجھے اس کے بے تکے پن پر غصہ آنے لگا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' وہ یقین سے بولا۔

''ہوسکتا ہے آپ سچ کہہ رہے ہوں۔ میرے ساتھ ابھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔'' میں نے جھنجھلا کر کہا۔

''اب جو ہو رہا ہے۔'' وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

''مطلب.....؟'' میں حیران کھڑی تھی۔

''مطلب یہ کہ آپ کو نوکری چاہیے نا؟''

''جی ہاں.....''

''کیا آپ میری فرم میں ملازمت کرنا پسند کریں گی؟'' اس نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔ بشرطیکہ.....''

''بشرطیکہ.....؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہی کہ میں آپ کی فرم میں کام کرنے کے قابل ہوئی بھی نا۔'' میں نے جواب دیا۔

''اس کی آپ فکر نہ کریں۔ کام آپ کی مرضی کے مطابق ہوگا۔ ایسا کہ جس میں آپ کو زیادہ زحمت اٹھانا بھی نہ پڑے گی۔'' اس نے تسلی دی اور میں اس کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا اور میں اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی اپنی قسمت پر ناز کر رہی تھی۔ اب میری ماں کے موتی جیسے آنسو اس کے گالوں کی جھریوں میں نہیں اٹکیں گے۔ میری پانچ بہنوں کے گال بھوک سے زرد نہیں ہوں گے۔ مجھے ایک فرشتہ مل گیا تھا۔ خدا اپنے مجبور بندوں کو ان کی ہمت سے زیادہ نہیں آزماتا۔ میرے ذہن میں خیالوں کا بے پناہ ہجوم تھا اور سینے میں خوشیوں کا تلاطم۔ میں تصورات میں گم تیزی سے دوڑتی سیاہ کول تار کی سڑک کو تک رہی تھی اور وہ فرشتہ صفت انسان بے نیازی سے گاڑی چلا رہا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا اور چونکتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا: ''آپ تو اس دفتر میں کسی کام سے آئے تھے؟''

''جی ہاں۔'' اس نے مسکرا کر مختصر جواب دیا اور تیزی سے ایک موڑ کاٹا۔

''پھر! آپ تو باہر ہی سے واپس آ گئے ہیں۔'' میں نے تعجب سے کہا۔

''جی ہاں.....'' وہ حسب سابق مسکرا کر بولا۔

''آپ کو تو کوئی ضروری کام ہوگا نا؟''

''جی ہاں.....''

''میں نے آپ کو زحمت دی۔'' میں تاسف سے بولی۔

''جی نہیں۔'' میں دل ہی دل میں اُلجھ پڑی۔

''عجیب آدمی ہے؟ کیا جی ہاں اور جی نہیں کی رٹ لگا رکھی ہے۔''

''میری پریشانی نے آپ کو کام سے بھی روکا۔ مجھے افسوس ہے۔''

''آپ افسوس نہ کیجئے۔ میرا کام ہو چکا ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''کیسے؟''

''میری فرم کو آپ جیسی محنتی، خوش اخلاق اور خوبصورت لڑکی مل گئی ہے۔ یہ بھی تو ایک بہت ضروری اور اہم کام تھا نا جو اتنی آسانی سے ہو گیا۔'' وہ بدستور مطمئن تھا۔

''آپ کی عنایت ہے۔ ویسے آپ نے میرا نام، میری تعلیم، میرے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانا۔'' میں نے انکساری سے کہا۔

''اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ آپ صحتمند ہیں، جوان ہیں، حسین ہیں اور یہی خصوصیات

ایک دیانتداری سے کام کرنے والے شخص کے لیے بہت ہیں۔'' وہ بولا۔

''مگر میں نے تو ابھی، اس سے پہلے کہیں کام نہیں کیا۔ مجھے کسی قسم کا تجربہ نہیں۔'' میں نے کہا۔

''مجھے ایسی ہی لڑکی کی ضرورت تھی۔''

مجھے تعجب ہوا اور اچانک جیسے میری چھٹی حس بیدار ہوگئی۔ کسی نے چپکے سے مجھ سے کہا۔

''شہناز! تم ضرور کسی چکر میں پھنس رہی ہو.....'' اس خیال کے ساتھ ہی مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا لگا اور میں پسینے میں نہا گئی مگر خود کو سنبھالا اور اپنے آپ کو دلاسا دیا۔

میں بہرحال ایک پڑھی لکھی ہوشمند لڑکی ہوں۔ مجھے اس طرح گھبرانا نہیں چاہیے۔ اپنی ڈھارس بندھانے کے بعد میں نے بظاہر اطمینان سے اس شخص سے پوچھا۔

''جلدی اور گھبراہٹ میں آپ کا نام بھی پوچھنا بھول گئی۔''

''مجھے شعیب کہتے ہیں۔ سیٹھ شعیب احمد.....''

''میرے کام کی نوعیت کیا ہوگی؟''

''یہ بھی پتہ چل جائے گا۔ تسلی رکھیے۔'' وہ اطمینان سے نئے موڑ کاٹتا رہا۔ تب اچانک میری چھٹی حس تیزی سے متحرک ہوگئی۔

تم کسی چکر میں پھنس رہی ہو۔ کسی ان دیکھی قوت نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ میں نے تیز آواز میں کہا ''گاڑی روکیے۔ پلیز مجھے اُتار دیجئے۔ مجھے نوکری نہیں چاہیے۔'' اس نے تیزی سے کئی دوسرے موڑ کاٹے اور گاڑی رُک گئی۔ وہ ہنسا۔

''یہ میرا گھر ہے۔ چلیے اُتریے۔'' میں بغیر کچھ کہے باہر نکل آئی۔

یہ جدید وضع کا ایک وسیع بنگلہ تھا۔ سرسبز درختوں سے ڈھکا رنگارنگ پھولوں سے سجا۔ گاڑی رُکتے ہی نفیس وردی میں ملبوس ایک ملازم آیا۔ صاحب کو مودبانہ سلام کیا اور گاڑی سے بریف کیس اور ضروری سامان اٹھا کر اندر چلا گیا۔ ملازم کے چلے جانے کے بعد وہ صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''ابھی تک غیر ضروری باتوں اور جلدی میں میں اپنے مکمل کوائف نہیں بتا سکا جیسا کہ میں بتا چکا ہوں مجھے شعیب احمد کہتے ہیں۔ میرے کاروبار یوں تو بہت سے ہیں مگر آپ میری فرم کی ''میزبان دوشیزہ'' کہلائیں گی۔'' میں جو ابھی تک ذہنی طور پر الجھی ہوئی تھی، ایک گھر کی چہار دیواری میں آ کر خود کو کچھ اور غیر محفوظ سمجھنے لگی۔ اندیشے اور وسوسے بڑھتے جا رہے تھے اور دل پر منوں بوجھ لدا ہوا تھا۔ آج سوچتی ہوں تو یقین آتا ہے کہ واقعی چھٹی حس ضرور کوئی شے ہے جو انسان کو پیش آنے والے واقعات کا قبل از وقت احساس دلاتی ہے مگر میری چھٹی حس وقت گزر جانے کے بعد بیدار ہوئی۔ اس وقت میں پنجرے میں بند ایک چڑیا تھی اور صیاد مسلسل میری نگرانی کر رہا تھا۔

''تشریف لائیے۔'' شعیب احمد نے بڑی شائستگی سے جھک کر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر مجھے راستہ دکھایا۔ میں نے غیر ارادی طور پر قدم آگے بڑھائے اور وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

''اگر میں غلط نہیں سمجھ رہا تو آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔'' چلتے چلتے اس نے کہا۔

''میں یہ ملازمت نہیں کرنا چاہتی۔'' میں نے صاف کہہ دیا۔ وہ ٹھٹھک کر لمحہ بھر کو رُکا اور بولا ''دیکھئے! آپ خوامخواہ گھبرا رہی ہیں۔ میں آپ کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ میرے اس گھر میں آپ قطعی طور پر محفوظ ہیں۔ میں نے آپ کو پریشان دیکھ کر ازراہ ہمدردی آپ کی مدد کرنا چاہی ہے تاہم آپ کو یہ پسند نہیں تو میں آپ کو وہیں چھوڑ آتا ہوں جہاں آپ مجھے ملی تھیں۔'' وہ واپس گاڑی کی طرف پلٹتے ہوئے بولا۔

''مگر یاد رکھیں! یہ دنیا بہت خراب جگہ ہے۔ آپ خوبصورت ہیں، جوان ہیں اور ناتجربہ کار..... زمانہ آپ کے الہڑپن سے فائدہ اٹھا کر آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ سو میں گاڑی کی طرف بڑھی ہی تھی کہ پیچھے سے ایک دلفریب نسوانی آواز سنائی دی۔

''ارے کدھر چلے شعیب؟''

''پھوپھی جان ان کو واپس چھوڑنے کے لیے۔'' شعیب کے لہجے میں بڑا بجھا پن سا تھا۔

''ارے بیٹا یہ کیا۔ ادھر آئیں۔ ادھر چلیں۔ کیا ہم سے ملو گی بھی نہیں.....؟'' پھوپھی جان سیاہ ٹائلوں والے برآمدے کی ریشم کی طرح پھسلتی سیڑھیوں سے نیچے اُتر آئیں۔ مجبوراً میرا ہاتھ ماتھے سے جا لگا۔ ویسے بھی پھوپھی جان لقلقے کی خاتون تھیں۔ بھاری بھرکم سڈول جسم، کھلتا ہوا رنگ، ہلکے آسمانی رنگ کے غرارے میں ان کی شخصیت کا رعب مجھ پر پڑے بنا نہ رہ سکا۔ جھجکتے ہوئے میں نے کہا ''میں یہ نوکری نہیں کرنا چاہتی..... اس لیے.....''

''اس لیے واپس جا رہی ہوں۔'' پھوپھی جان نے میرا جملہ مکمل کیا۔

''جی۔'' میں نے کہا۔ شعیب اس دوران چپ کھڑا مسکراتا رہا۔

''اے لو۔ بھاڑ میں جائے نوکری مگر بیٹا جب آئی ہو تو دو گھڑی ہمارے پاس بیٹھو، کچھ اپنی کہو کچھ ہماری سنو۔ کہاں سے آئی ہو، کتنے بہن بھائی ہیں، ماشاء اللہ کیسی پیاری من موہنی صورت پائی ہے۔ سچ جانو میرے تو دل میں اُتر گئی ہے تمہاری بھولی بھالی شکل۔ کیا نام ہے بیٹی تمہارا؟''

''شہناز..... شہناز قمر'' میں نے بتایا اور پھوپھی اماں میرا ہاتھ پکڑ کر برآمدے کی ریشمیں سیڑھیاں چڑھ گئیں۔ میرے دل سے خوف قدرے کم ہوا مگر دل نہ جانے اس قدر کیوں دھڑک رہا تھا کہ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ شعیب ہمارے پیچھے پیچھے چپ چاپ سر جھکائے چل رہا ہے۔ میں پھوپھی جان کے ساتھ ایک لمبی راہداری سے گزر کر جس کمرے میں داخل ہوئی وہ بیش قیمت اور جدید قسم کے سامان سے آراستہ تھا۔ قالین میں ٹخنوں تک میرے پاؤں دھنس گئے اور صوفے میں تو میں پوری کی پوری اُتر گئی۔ لمحہ بھر میں کھانے پینے کی مختلف اقسام میرے سامنے ڈھیر کر دی گئیں۔ پھوپھی جان ایک ایک چیز اصرار کر کے کھلاتی رہیں اور میں انکار کے باوجود ہر چیز چکھتی رہی۔ چائے کے درمیان انہوں نے میرے سب حالات معلوم کر لیے اور اب وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتی تھیں۔ شعیب نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ چائے ختم کر کے مجھ پر نیند کا شدید غلبہ طاری ہونے لگا۔ پلکیں بوجھل ہو کر میری آنکھوں پر جھک آئیں۔ پھوپھی جان نے میری کیفیت بھانپ کر کہا ''میرا خیال ہے تم تھک رہی ہو۔ چلو دو گھڑی آرام کر لو۔'' میں صوفے سے اُٹھی اور ان کے ساتھ ایک دوسرے کمرے میں آ

گئی۔ یہ کمرہ بھی پہلے کمرے کی طرح قیمتی ساز و سامان سے مزین تھا مگر دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ یہ سونے کے لیے مخصوص ہے۔ ایک بیڈ کے اس کمرے میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ میں نے ہاتھ پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ دن کے دو بج رہے تھے۔ میں اس گدگدے بستر پر ایسی بے سدھ ہو کر سوئی کہ کچھ پتہ نہ چلا کہ میں کہاں ہوں۔ جب میری آنکھ کھلی تو رات کے نو بج رہے تھے مگر تاریخ کی سوئی ایک دن آگے تھی۔ حیرانی کے مارے میرا سر چکرا گیا اور میں ایک دم بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ گزرے وقت کی ساری باتیں ایک ایک کر کے میرے ذہن میں آنے لگیں۔ اب کیا ہوگا؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میرا دماغ ماؤف ہونے لگا تبھی دروازہ کھلا اور ایک نوکر مؤدب انداز میں میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔

''بیگم صاحبہ! صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''کون صاحب.....؟'' مجھے وہ کسی ڈرامے کا کردار لگ رہا تھا۔

''شعیب صاحب جی۔'' نوکر گردن جھکائے جھکائے بولا۔

''اچھا ..... چلو.....'' میں پلنگ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ تشریف رکھیں۔ صاحب یہیں آنا چاہتے ہیں۔'' نوکر نے جواب دیا جس کا نام مجھے بعد میں معلوم ہوا، عنایت تھا۔ عنایت ان لوگوں کا خاص آدمی تھا۔ یہ بات بھی مجھے بہت بعد میں پتہ چلی۔ عنایت کے کمرے سے نکلتے ہی شعیب اندر داخل ہوا۔ وہی مخصوص مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔

''مزاج بخیر مس شہناز۔'' اس نے اندر آتے ہی کہا۔ میں جواب میں چپ رہی۔

''بہت دیر تک سوئیں آپ۔ کیا بہت تھک گئی تھیں؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا آپ ناراض ہیں؟'' مجھے خاموش دیکھ کر اس نے پھر سوال کیا۔

''مجھے واپس بھیج دیجیے شعیب صاحب۔'' میں نے پہلی بات کی۔

''دیکھیے مجھے آپ کے تفصیلی حالات پھوپھی جان کی زبانی معلوم ہوئے ہیں۔ میں انسان ہونے کی حیثیت سے اور ہمدردی کے تحت آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ یہ کام قبول کر لیں۔ اگر بصورت دیگر آپ کو کام پسند نہ ہو تو آپ جو فیصلہ کریں مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ آپ کو کام مہیا کر کے میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ انسانیت کے ناطے یہ میرا فرض تھا۔ آپ جو کام کریں گی اس کا ہدیہ چند ہزار روپے ماہانہ پیش کروں گا۔'' شعیب تحمل سے بولتا رہا۔ چند ہزار روپوں کی جھنکار سے میرا ذہن گونجنے لگا۔ چھوٹی بہنوں کے زرد چہرے اور ماں کی پریشان شکل میری نظروں میں گھوم گئی۔ میں نے شعیب کی پیشکش قبول کر لی۔ وہ مجھے دو تین دن مزید آرام کی ہدایت کر کے چلا گیا اور پھوپھی جان کے ساتھ میں ایسے گھل مل گئی جیسے میں اسی گھر کی ایک فرد ہوں۔ پھوپھی جان تین چار دن تک بے حد الفت سے میری دیکھ بھال کرتی رہیں۔ وہ لاولد، بیوہ عورت تھیں اور شعیب کے پاس ہی رہتی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ شعیب کے بیوی بچے ملک سے باہر رہتے ہیں اور سال میں دو تین بار شعیب وہاں جا کر ان سے مل آتا ہے۔ تین دن بعد رات کے آٹھ بجے مجھے تیار ہونے کے لیے کہا گیا۔ پھوپھی اماں نے ایک قیمتی خوبصورت کامدار ساڑھی مجھے پہننے کے لیے دی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور میک اپ کرنے کو کہا۔ میں نے اس اہتمام کی وجہ پوچھی تو وہ محبت آمیز لہجے میں بولیں۔

''بیٹی تم میزبان دوشیزہ ہو۔ جن لوگوں کو تم خوش آمدید کہو گی ان پر اچھا اثر پڑنا چاہیے تمہارا۔''

ان کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اس لیے بھی کہ ان کے گھر کے طور طریقے ہر لحاظ سے میرے گھرانے سے مختلف تھے لہٰذا میں بغیر کسی احتجاج کے ان کی ہدایت کے مطابق تیار ہو گئی۔ انہوں نے جگمگاتے نگینوں کا زیور بھی مجھے پہننے کو دیا۔ اتنے خوبصورت لباس اور قیمتی زیورات سے لیس ہو کر میں نے آئینہ دیکھا تو خود اپنے عکس سے شرما گئی۔

''یہ میں ہوں..... اتنی حسین..... اس قدر خوبصورت؟'' میں حیرانی سے اپنی شبیہہ دیکھ رہی تھی کہ شیشے میں مجھے شعیب کا عکس نظر آیا۔

''چشم بد دور.....'' اس نے کہا اور میرے بالکل پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔

غیر شعوری طور پر میں شرم سے سرخ ہو گئی اور جھینپ کر آئینے سے الگ ہٹ گئی۔ سہیل سے جدا ہونے کے بعد شعیب پہلا مرد تھا جس نے میرے حسن کو سراہا اور میرے سراپے کی یوں تعریف کی جس کے اظہار کے لیے الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی مگر اس طرح تو میں کبھی سہیل کے سامنے نہ شرمائی تھی۔ خود سے جیسے میں نے سوال کیا۔

کیا میں شعیب سے متاثر ہو گئی ہوں؟ کیا شعیب نے سہیل کی جگہ لے لی ہے؟ ابھی میں خود سے اپنے سوال کا کوئی جواب نہ پا سکی تھی کہ اس نے دھیرے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''چلیے دیر ہو رہی ہے۔''

اب کیا مجھے یہ بھی بتانا ہو گا کہ میں جہاں لے جائی گئی، وہاں کوئی شریف عورت اپنی مرضی سے نہیں جاتی جب تک کہ میری طرح اس کی عقل پر کوئی افتاد نہ پڑ گئی ہو۔ یہاں آ کر عورت، عورت کے درجے سے گر جاتی ہے۔ مقدس معاشرے میں اس جگہ کی عورت کا نام طوائف ہے۔ شریف گھرانے کی عورتیں طوائف کے نام پر ناک سکیڑ لیتی ہیں مگر شریف گھرانے کی عورتیں شاید یہ نہیں جانتیں کہ عورت کو اس جگہ پہنچانے والے انہی شریف گھرانوں کے مرد ہوتے ہیں۔ بہت لمبی ناک والے، عزت دار مرد..... دولت کمانے کی ہوس میں مبتلا اور دولت لٹانے کے شائق رئیس زادے۔ میں نے کبھی سنا تھا کہ ایسے حربوں سے پیسہ کمانا حرام ہے۔ میرا معاوضہ اس حرام کی کمائی میں چند ہزار روپیہ ماہانہ ہے مگر میں سمجھتی ہوں کہ جو پیسہ میں کماتی ہوں، وہ میرے گاڑھے خون پسینے کی کمائی ہے۔ اس کمائی میں میرا نفس، میری عزت، میرا ضمیر، میرا خاندانی وقار، میری شخصیت، میرا کنوارا پن، میری معصومیت، میرا تقدس غرض ہر چیز شامل ہے۔ اپنی پانچ عدد چھوٹی بہنوں کے چہرے پر سرخ گلاب کھلانے کی دھن میں میں نے رات کی تاریکیوں کو اپنا مقدر بنا لیا۔ اداس، اجڑی ہوئی سحر کی زردی میری تقدیر بن چکی ہے۔ جانے کتنی جگمگاتی، نمائشی راتیں مہ و سال میں ڈھل چکی ہیں، مجھے تو اب اس کا اندازہ بھی نہیں رہا۔ ماں کو میں نے لکھ دیا تھا کہ مجھے ایک بہت اچھی نوکری مل گئی ہے۔ اپنا خرچ نکال کر چند ہزار روپیہ ہر ماہ آپ کو بھیجتی رہوں گی۔ جواب میں ماں نے مجھے ڈھیروں دعائیں لکھیں، میری خوشیوں کی، عزت کی اور ترقی کی اور ماں تو ہر ہفتے مجھے اسی قسم کے خط لکھتی ہیں اور پچھلے سال ماں کے بے حد اصرار پر شعیب نے مجھے ایک دن کے لیے گھر چلے جانے کو کہا۔ میں تذبذب میں پڑ گئی۔

کس منہ سے میں اپنی بوڑھی ماں کے سامنے جا سکوں گی۔ لٹی ہوئی عزت کی مرقوم تحریر میرے چہرے سے میری جہاندیدہ ماں کیا پڑھ نہیں لے گی؟ میری بھولی بھالی بہنوں پر میرے مکروہ سائے کی پرچھائیں بھی نہیں پڑنی چاہیے مگر ماں بہت اصرار کر رہی تھیں۔ اس لیے شعیب کا مشورہ مجھے ماننا ہی پڑا۔ برسوں بعد ماں سے مل کر میرے زخم ناسور بن گئے۔ میرا دل چاہا کہ ماں کے گلے لگ کر میں اتنا روؤں، اتنا روؤں کہ دنیا جل تھل ہو جائے مگر میں نے ہر خواہش کو سینے میں تھپک کر سلا دیا اور خوشیوں کا مصنوعی خول اپنے چہرے پر چڑھا لیا۔ ماں ہر ماہ پیسے بچا بچا کر میرا جہیز بنا رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے پیار کرتے ہوئے اپنی گرم آغوش میں لٹا کر کہا ''بس اب تیرا گھر بسانے کی فکر ہے۔ کوئی شریف لڑکا مل جائے تو تیرے ہاتھ پیلے کر دوں۔''

میں ماں کی گود سے ایسے نکل کر بیٹھ گئی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

''ماں میں شادی نہیں کروں گی۔'' ان کی حیران نظریں میرے چہرے کا جائزہ لینے لگیں جیسے پوچھ رہی ہوں..... ''کیوں؟ تم نے یہ فیصلہ کیوں کیا۔''

''دیکھیں نا امی! ابھی سب بچیوں کی تعلیم نامکمل ہے۔ ان کی ضروریات ادھوری رہ جائیں گی اگر میری شادی ہو گئی تو..... آپ اور میں مل کر ان کی شادی کریں گے۔'' بھرپور ایکٹنگ کے ساتھ کی گئی میری بات کی ماں قائل ہو گئیں۔ چھٹی نہ ہونے کا عذر کر کے اگلے ہی دن میں ماں کے گھر سے رخصت ہو گئی۔ ماں مجھے وداع کرنے کے لیے کسی اچھے بر کی منتظر تھیں۔ میری بھولی ماں تمہیں کیا معلوم تمہاری اس نیک نصیب بیٹی کا ڈولا ہر شب کسی نئے رئیس زادے کے کندھوں پر اٹھتا ہے۔ ہر شب یہ رٹا رٹایا ڈرامہ نئے کرداروں کے اضافے کے ساتھ کھیلا جاتا ہے اور میری جوانی کے آخری لمحے تک کھیلا جاتا رہے گا۔ ایک طوائف کی دنیا آپ شریف لوگوں کی دنیا سے مختلف ہوتی ہے اور میں تو مدتیں ہوئیں اس شریفانہ دنیا سے اپنا ناطہ توڑ چکی ہوں۔ اب میں لوٹنا بھی چاہوں تو اس دنیا میں لوٹ نہیں سکتی۔ شرافت کے دروازے میرے لیے مقفل ہو چکے ہیں۔ میرے ماتھے پر بیسوا کے نام کا کالا دھبہ میری گناہ آلود زندگی کی مہر بن چکا ہے اور یہ میرے سامنے ماں کا تازہ خط کھلا پڑا ہے۔ صبح سے جانے کئی بار میں اس کی عبارت پڑھ چکی ہوں۔

''کل سہیل میرے پاس آیا تھا۔ تمہارا پتہ مانگ رہا تھا۔ وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔ جتنی دیر بیٹھا رہا تمہارا ہی ذکر کرتا رہا۔ اچھا لڑکا ہے اور اب تو اس کی ترقی بھی ہو گئی ہے۔ بیٹی! میری بات مانو! پہاڑ سی زندگی ایسے کیسے گزرے گی۔ تم شادی کر ہی ڈالو۔ تمہارا گھر بس جائے گا تو میں بھی سکھ سے جی سکوں گی ورنہ تمام زندگی یہ ندامت مجھے کھاتی رہے گی کہ میں خودغرض بنی رہی۔ گھر کا کیا ہے۔ یہ گاڑی تو کسی نہ کسی طور چلتی رہے گی۔ اب چند ماہ ہی کی تو بات ہے۔ مہناز بی اے کر کے کوئی نوکری کر لے گی۔ میں تمہارے جواب کی منتظر ہوں۔.....''

''نہیں ماں نہیں۔ للہ مہناز سے نوکری نہ کرانا ماں..... اس بھینٹ کے لیے میں ہی کافی ہوں۔ میری قربانی کے بعد اب کسی قربانی کی ضرورت نہیں.....'' میں ماں کو جواب لکھی رہی ہوں۔ پر سوچتی ہوں میرا حال جان کر کیا ماں زندہ بچ سکے گی؟

.....❁.....❁.....

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے حصے کی روشنی

عرفان جاوید

میں گلی میں داخل ہوا تو گھر کے سامنے لوگوں کی بھیڑ دکھائی دی۔ میلے رنگوں اور سفید شلوار کُرتوں اور دھوتیوں میں ملبوس لوگ سنجیدہ چہرے بنائے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ گھر کے قریب پہنچا تو رونے کی آوازیں آئیں۔ میں ٹھٹھک گیا۔ سوچا واپس لوٹ جاؤں لیکن پھر آگے بڑھا۔ مجھے دیکھ کر لوگوں نے رستہ بنا دیا.....

ایک بچے کی کہانی جس کے سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا

ننھا ساجد اپنے کھلی آستینوں والے کُرتے کی کف سے اپنی ناک پونچھتے ہوئے مجھ سے پوچھتا ''چاچو! ننھی ایک دم کہاں سے آ گئی؟ امی کہتی ہیں کہ اسے پریاں ہمارے گھر چھوڑ گئیں۔ ابو کہتے ہیں کہ ننھی کو فرشتے ہمارے گھر بھول گئے تھے مگر چاچو ننھی تو بالکل نادو جیسی ہے۔ کیا نادو کو بھی پریاں ساتھ والے گھر میں چھوڑ گئی تھیں؟'' مجھے اس کے اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہو جاتا اور میں اسے طریقے سے ٹال جاتا۔

اگر سب جگہ سے اسے ایک سا جواب ملتا تو شاید وہ مطمئن رہتا لیکن جب کوئی اسے کہتا کہ ننھی کو پریاں چھوڑ گئیں، کوئی اس تحفے کے پیچھے جنات کا بتاتا اور کوئی کہتا کہ وہ ایک پرندے کے رنگین پر کی طرح ہوا پر تیرتی کھڑکی کے راستے گھر میں آ گئی تو ننھا ساجد اور بھی زیادہ تذبذب کا شکار ہو جاتا۔

یہ سب سُن کر وہ میرے پاس آ جاتا۔ کافی کافی دیر تک اپنی بڑی بڑی حیران آنکھوں سے مجھے، قانون کی کتابوں میں گم، انہماک سے تکتا رہتا۔ پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ ہمت کر کے میرے گھٹنے پر اپنا ایک ننھا سا ہاتھ رکھ کر اور دوسرے ہاتھ سے میری ٹھوڑی کو چھیڑ کر التجائیہ انداز میں باتیں کرنے لگتا۔ کچھ دیر گزرتی تو التجائیہ انداز کا تکلف چھوڑ کر میری گود میں اپنے ننھے ننھے پیروں سمیت چڑھ آتا۔ اس کے کُرتے کے نچلے حصے پر اکثر کیچڑ کے نشان ہوتے لیکن مجھے اپنے کپڑے خراب ہونے سے کبھی گھبراہٹ نہ ہوتی بلکہ اس کے نرم و نازک ہلکے ہلکے وجود کو اپنی گود میں بھر کر ایک عجب پدرانہ شفقت سی محسوس ہوتی اور بے اختیار اس کے بھرے بھرے سرخ گال چوم لینے کو جی کرتا۔

مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ میں ان کے گھر میں کرایہ دار ہوں۔ ان پانچ برسوں میں ننھے ساجد کے گھر والوں کے ساتھ میں اس طرح گھل مل گیا ہوں جیسے میں ان کے گھر ہی کا فرد ہوں۔ ننھے ساجد کے ابو کئی مرتبہ معمولی نوعیت کے مسائل پر میرا قانونی مشورہ لینے میرے کمرے میں آ جاتے ہیں۔ بھلے مانس آدمی ہیں۔ بجلی کے کھمبے پر فیوز بلب ہو، بے ڈھنگن گٹر ہو یا پھر گلی میں لٹکتی تاریں ہوں، وہ سرکار کی بے عملی پر کڑھ کر شاید کچھ زیادہ ہی شکوہ کر جاتے ہیں۔

ننھے کو مجھ سے خاص انس ہے۔ میرے دل میں بھی اس کے لیے ایسے ہی جذبات ہیں جیسے کسی باپ کے دل میں بیٹے کے لیے ہوتے ہوں گے۔ طاہرہ کی زچگی کے دوران پیچیدگی کی وجہ سے وفات کے بعد سے میں دوسری شادی اور اولاد پیدا کرنے کے ارادے کو ویسے ہی دل سے نکال چکا ہوں۔ ایسے میں ننھا میرے اس خلا کو بہت اچھی طرح پُر کرتا ہے۔ عدالت سے واپسی پر میں اکثر اس کے لیے کوئی نہ کوئی کھلونا، ٹافی یا بسکٹ وغیرہ لے آتا۔

ننھی بھی میرے سامنے ہی پیدا ہوئی۔ ننھا ساجد اکلوتا تھا۔ شاید حسد میں مبتلا ہو جاتا لیکن اسے تو جیسے ننھی سے عشق ہو گیا۔ ننھی پتہ نہیں کس پر گئی تھی۔ بہت چھوٹی، نرم و نازک اتنی کہ گود میں لیتے وقت ڈر لگے..... سرخ رنگت..... آنکھیں ہر وقت بند..... جب ہنستی تو منہ سے پانی کے بلبلے نکلتے لیکن مٹھیاں بھنچی رہتیں..... اور جب روتی..... اور روتی بہت کم تھی، تو آنکھیں تو بھیگ ہی جاتیں لیکن ہونٹ مسکراتے رہتے۔ مٹھیاں تب بھی بھنچی ہوئی ہوتی تھیں۔

ننھا ساجد تو ننھی پر فدا ہو گیا تھا۔ ہر وقت اسے گود میں اُٹھائے پھرتا۔ خود پاؤ بھر کا تھا۔ چھٹا نک بھر کی ننھی کو گود میں جب بمشکل اٹھاتا تو جی سہم جاتا کہ کہیں گرا نہ دے لیکن اس کی ضد کے آگے اس کے ماں باپ کی نہ چلتی۔ ننھی بھی استاد تھی۔ پلنگ پر پڑی رو رہی ہے۔ باپ گود میں جھلا رہا ہے، ماں لوریاں دے رہی ہے لیکن صاحبزادی چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ ادھر ننھے نے گود میں اٹھا کر کان میں سرگوشی کر دی، ادھر ننھی کھلکھلاتی اس کی گود میں ہمکنے لگی۔

ننھی جب ذرا بڑی ہوئی تو ننھا ساجد ایک دن مجھے بہت اصرار کر کے اپنے ساتھ بازار لے گیا۔ میں راستہ بھر پوچھتا رہا کہ کس لئے جا رہے ہو لیکن وہ بس میری انگلی پکڑے مجھے کھینچتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ شاید شافیاں لینا چاہتا ہے لیکن ٹافیوں کی دکان بھی گزر گئی۔ قلفی والے کا ٹھیلا اور میٹھے لچھوں کی ریڑھی بھی پیچھے رہ گئی، تو آخر کار کھلونوں کی دکان کے سامنے جا ٹھہرا۔ جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور دکاندار کو ڈانٹ کے انداز میں کہنے لگا ”یہ جو سامنے تین پہیوں والی سائیکل ہے نا! ہمیں پیک کر دو۔ جلدی کرو۔“ دکاندار ہنس پڑا۔ میں نے اسے آنکھوں سے اشارہ کر دیا کہ بقایا پیسے پہنچا دوں گا۔

دکاندار نے سنجیدہ چہرہ بنا کر سائیکل ہمارے حوالے کر دی۔ بس پھر کیا تھا ننھی کے لیے خریدی گئی سائیکل پر اسے بٹھا کر ننھا ساری ساری دوپہر صحن میں گھوں گھوں کی آوازیں نکالتا بھاگتا پھرتا اور میرے کمرے میں کھڑکی کے رستے ننھی کی ہنس ہنس کر چیخنے کی آوازیں آتی رہتیں۔

اسی دوران ننھے پر ایک نیا خبط سوار ہوا۔ کہیں سے سلمٰی ستارے کے کام والا ایک دوپٹہ اٹھا لایا۔ اپنی ماں کی لپ سٹک ننھی کے ہونٹوں پر بہت تشویشناک توجہ کے ساتھ لگاتا۔ ننھی بھی منہ اٹھائے آسمان کو دیکھتی رہتی۔ پھر تھوڑی سی لپ سٹک ننھی کے گالوں پر تھوپ دیتا۔ میک اپ مکمل کر کے اور دوپٹہ اوڑھا کر تنقیدی نظروں سے، ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے، مختلف زاویوں سے ننھی کا جائزہ لیتا رہتا۔ اگر میک اپ پسند آ جاتا تو بھاگا بھاگا کمرے میں جاتا۔ تھوڑی دیر بعد برآمد ہوتا تو ہونٹوں کے اوپر کالے مارکر سے مونچھیں بنی ہوتیں۔ گال پر ایک موٹا سا تل ہوتا اور سر پر پگڑی کی جگہ پرانا ہیٹ ہوتا۔ دلہا محترم مکمل تیار حالت میں ہوتے۔ پھر دلہا دلہن کا ناٹک شروع ہو جاتا۔ اسے بہت سمجھایا کہ تم دونوں بہن بھائی ہو، دلہا دلہن بننا کچھ زیادہ مناسب نہیں مگر وہ اڑ جاتا۔ پھر وجہ پوچھتا۔ جب مطمئن نہ ہو پاتا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ تنگ آ کر اسے اس کی اس حالت پر چھوڑ دیا گیا۔

ننھی اب کچھ بڑی ہو رہی تھی۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی بولی میں ضد کرنا شروع کر دی تھی۔ جب کبھی ننھا اسے گھسیٹتا، گود میں اٹھاتا اور انگلی سے پکڑے چلاتا بمشکل میرے پاس لے آتا تو ننھی اپنے ہاتھ کو آگے کر کے اور آنکھیں بند کر کے ہنستی جاتی اور کہتی جاتی ”چیجی دو نا! دو نا چیجی!“ اور میں اس مقصد کے لیے دراز میں رکھی ٹافیوں میں سے دو تین ٹافیاں اس کی سرخی مائل گوری ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ اس پر وہ اس طرح خوش ہوتی جیسے اسے دنیا جہاں کی دولت مل گئی ہو۔ وہ پہلے ایک ٹافی ننھے کو دیتی جو ٹافی کاغذ میں سے نکال کر اس کے منہ میں ڈال دیتا پھر دوسری ٹافی انتہائی فیاضی سے اسے پکڑا دیتی ”لو کھا لو۔“

جب ان کے ابو گھر میں نہ ہوتے تو وہ دھما چوکڑی مچتی کہ خدا کی پناہ۔ چھپن چھپائی کا کھیل چلتا رہتا۔ ننھی صاحبہ کبھی پلنگ کے نیچے چھپ رہی ہیں تو کبھی نیم وا دروازے کے پیچھے۔ ننھا پراسرار خاموشی سے اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ جب ڈھونڈ لیتا تو ایک دم ”چا“ کہتا سامنے آ جاتا۔ اس پر ننھی شور مچاتی، دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بھاگتی جاتی اور کہتی جاتی ”یہ میں نہیں ہوں، یہ میں نہیں ہوں۔“

ٹی وی پر کرکٹ سیریز چل رہی تھی۔ ہر جگہ گلی میں بازاروں میں کرکٹ ہی کرکٹ تھی۔ ننھا کب کسی سے پیچھے رہنے والا تھا۔ ضد کر کے گیند بلا لے آیا۔ صحن چھوٹا سا تھا۔ ایک جگہ مونڈھا رکھ کر وکٹ بنائی جاتی۔ بیٹ اٹھا ننھی کو باؤلنگ پر لگا دیا جاتا۔ بیچاری بمشکل چل پاتی تھی، باؤلنگ خاک کراتی۔ لیکن ننھے نے تھوڑے کو غنیمت جانا اور اپنی بیٹنگ پریکٹس جاری رکھی۔

برسات کے دن تھے۔ میں اپنے بالائی منزل والے کمرے میں بیٹھا فائلوں میں سر کھپاتا رہتا۔ یہ گھر اندرون شہر میں قدیمی انداز کا تھا۔ کھڑکی میں سلاخیں لگی تھیں۔ اوپر لکڑی کا مغلئی انداز کا چھجا بارش کی ٹپ ٹاپ سے گونجتا رہتا اور پانی نانک شاہی نما چھوٹی اینٹوں پر بہتا رہتا۔ سیوریج کہیں کہیں متعارف کرائی گئی تھی لیکن گٹر پانی سے اتنے بھر جاتے کہ گلی نہر سی بن جاتی۔ ایسے میں گزرنے کے لیے اینٹیں رکھ دی جاتیں جن پر راہگیر سرکس کے مشاق بازی گر کی طرح بمشکل توازن قائم کرتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گزرتے جاتے۔ میں جب کام سے تھک جاتا تو اپنی میز کرسی سے اُٹھ کر سامنے پڑی جالی دار آرام کرسی پر آن بیٹھتا اور سامنے نکڑی کے جالے میں گھر سے سرشام جلنے والے اکلوتے زرد بلب کے گرد طواف کرتے پروانوں کو دیکھتا رہتا۔

ایک روز جب بارش زور وشور سے ہو رہی تھی اور شہر کی سڑکیں پانی سے بھر گئی تھیں تو میں جلد ہی عدالت سے گھر لوٹ آیا۔ اس روز نہ جانے کیوں صبح ہی سے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

میں گلی میں داخل ہوا تو گھر کے سامنے لوگوں کی بھیڑ دکھائی دی۔ میلے رنگوں اور سفید شلوار کرتوں اور دھوتیوں میں ملبوس لوگ سنجیدہ چہرے بنائے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ گھر کے قریب پہنچا تو رونے کی آوازیں آئیں۔ میں ٹھٹھک گیا۔ سوچا واپس لوٹ جاؤں لیکن پھر آگے بڑھا۔ مجھے دیکھ کر لوگوں نے رستہ بنا دیا۔ جب گھر کی چوکھٹ عبور کی تو سامنے برآمدے میں رکھی چارپائی پر نظر جا پڑی۔ پھولی پھولی ننھی سامنے بستر پر پڑی سو رہی تھی۔ ہونٹ مسکرا رہے تھے..... اور ہاں، مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ ویسے ہی جیسے بہت چھوٹی ہوتی بھنچتی تھی۔

ننھی کی ماں بال بکھیرے پچھاڑیں کھاتی تھی۔ پڑوسنیں اور رشتہ دار عورتیں روتے ہوئے اسے سنبھالتی تھیں لیکن وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر ان کے بازوؤں سے نکل نکل جاتی تھی۔

اندر کمروں میں اور باہر صحن میں لوگ کھڑے آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ چوخانی تہہ بند باندھے ایک شخص دوسرے کو کہہ رہا تھا ''ظالموں نے یہ کیا کر دیا۔ کم از کم گٹروں پر ڈھکن ہی ڈال دیئے ہوتے۔ جہاں کچھ ڈالے تھے وہ چوری ہو گئے۔ بیچاری معصوم بچی گیند لینے باہر نکلی تھی۔ گھر کے سامنے بے ڈھکن گٹر تھا۔ کیا معلوم تھا موت کھینچ لیے جا رہی ہے.....''

اس کے بعد بارش کی بوندیں میرے سن وجود پر برستی رہیں اور میرے آنسوؤں میں شامل ہو کر بہتی رہیں۔

ننھا ساجد اب میرے پاس بہت کم آتا ہے۔ ایک دم سے بڑا بڑا سا ہو گیا ہے..... پختہ پختہ سا..... جیسے ایک پانچ چھ سال کے بچے کو پختہ مرد کا چہرہ دے دیا گیا ہو۔ ہر ایک سے روٹھا روٹھا رہتا ہے۔ جب کوئی بلائے تو بات کرتا ہے ورنہ خاموش رہتا ہے۔ ضد کرنی چھوڑ دی ہے۔

وہ جب کبھی بہت موڈ میں ہو تو میری گود میں چڑھ آتا ہے اور پوچھتا ہے ''چاچو! ننھی کہاں چلی گئی ہے اور کیوں چلی گئی ہے؟ میرا جی اس کے بغیر نہیں لگتا۔ ابو کہتے ہیں کہ جلدی واپس آ جائے گی۔ چلو چل کر خود ہی لے آتے ہیں۔ ابو تو بس بہانے بناتے رہتے ہیں۔''

میں بھیگتی آنکھوں سے سوچتا رہتا ہوں کہ جب ننھا بڑا ہو گیا تو اسے اس سوال کا جواب تو مل جائے گا جو چھوٹے ہوتے پوچھتا تھا کہ ''ننھی کہاں سے آئی ہے؟''

لیکن اسے یہ جواب شاید کبھی نہ مل سکے کہ وہ کہاں چلی گئی۔

کیونکہ مجھے بھی تو آج تک طاہرہ کے کہیں چلے جانے کا جواب نہیں مل سکا۔

البتہ ننھی کے کیوں چلے جانے پر اس کے ابو کی یہ بات جو تب میرے دلاسا دینے پر انہوں نے کہی تھی شاید اس کے سوال کا جواب ہو سکے ''آج سمجھ میں آیا اس میں میرا بھی قصور تھا۔ دوسری طرف دیکھنے کی بجائے کاش کہ اپنے حصے کا ڈھکن میں نے خود ہی ڈال دیا ہوتا۔''

سیارہ کچن کارنر

جویریہ کامران

خواتین قارئین کی دلچسپی اور پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے کھانوں کی تراکیب پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس میں آسان مگر معیاری اور نئی تراکیب پیش کی جائیں گی۔ ان تراکیب پر عمل کر کے نہ صرف آپ اپنے گھر والوں کو نت نئے ذائقہ دار کھانے فراہم کر سکتی ہیں بلکہ روایتی ڈشز پکانے کی بوریت سے بھی نجات حاصل کر سکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین تراکیب فراہم کر سکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی نئی اور معیاری تراکیب لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنہیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!

email: sayyaradigest@gmail.com

www.facebook.com/sayyaradigest

(تحریر: صائمہ عمران)

رمضان المبارک کے بابرکت مہینے کی آمد آمد ہے۔ اس مبارک مہینے کا نہایت جوش وخروش سے استقبال کیا جاتا ہے۔ رمضان کا مہینہ خواتین کے لئے مصروفیات کی نئی جہتیں لے کر آتا ہے۔ ماہ رمضان میں دیگر اقسام کے خاص اہتمام کے ساتھ نیکیوں کے حصول پر بھی خصوصی توجہ دی جانی چاہیے، اور ظاہر ہے اس کیلئے اضافی وقت درکار ہوتا ہے۔

اسی سلسلے میں ہم بھی چاہتے ہیں کہ آپ رمضان المبارک میں زیادہ سے زیادہ عبادت کا اہتمام کریں اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں آپ کی صحت بھی عزیز ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو ایسی recipes سکھائیں جن میں آپ کا وقت بھی کم صرف ہو اور اس کے ساتھ ساتھ آپ مرغن اور زیادہ تیل والی غذاؤں سے بھی بچے رہیں۔

ہم آپ کو ایسی تراکیب سکھا رہے ہیں جس کے لیے آپ کو گرمی میں چولہے کے آگے بھی کھڑا نہ ہونا پڑے گا۔ آپ پہلے سے ان کو تیار کر کے رکھیں اور افطار سے کچھ دیر پہلے اوون میں بیک کر کے مزیدار کھانوں سے لطف اندوز ہوں۔

اوون فرائیڈ چکن

اجزاء:

چکن Leg pieces:	ڈیڑھ کلو
دہی:	3/4 کپ
تیل:	ڈیڑھ کھانے کا چمچ
کٹی ہوئی لال مرچ:	ایک کھانے کا چمچ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پسی ہوئی کالی مرچ: ڈیڑھ چائے کا چمچ
نمک: حسب ذائقہ
پسا گرم مصالحہ: ایک چائے کا چمچ
پسا ہوا زیرہ: ایک چائے کا چمچ
ادرک لہسن (پسا ہوا): ایک کھانے کا چمچ
انڈے: دو عدد
بریڈ کرمز: حسب ضرورت
مکھن: 40 گرام

ترکیب: ایک پیالے میں دہی، ادرک، لہسن اور تیل کو مکس کریں۔ اس میں چکن کو میرینیٹ کریں۔ اب چار گھنٹوں کے بعد چکن کو باقی مصالحے لگائیں۔ انڈوں کو الگ پھینٹ لیں۔ اب چکن کو انڈے میں لپیٹیں پھر بریڈ کرمز میں اچھی طرح coat کریں۔ بیکنگ ٹرے کو مکھن سے چکنا کرلیں۔ چکن کے ٹکڑوں کو ٹرے میں رکھیں اور 180 ڈگری Celcius پر 45 منٹ کے لیے بیک کرلیں۔ تیار ہونے کے بعد چکن گولڈن براؤن اور کرسپی ہو جائے گی۔ سلاد اور فرنچ فرائز کے ساتھ نوش فرمائیں۔

.....

Cheese & Chutney Toast

اجزاء:

ڈبل روٹی کے سلائس: چھ عدد
مکھن: 3 کھانے کے چمچ
چیڈر چیز (کدوکش کرلیں): ایک کپ
ہرا دھنیا: تھوڑا سا
کالی مرچ (پسی ہوئی): حسب ذائقہ
چٹنی بنانے کے لئے:
ٹماٹر (باریک کاٹ لیں): ایک عدد
پیاز (باریک کاٹ لیں): دو کھانے کے چمچ
ہری مرچ (باریک کاٹ لیں): ایک کھانے کا چمچ
تیل: ایک کھانے کا چمچ
لال مرچ: ایک چائے کا چمچ
نمک: حسب ذائقہ

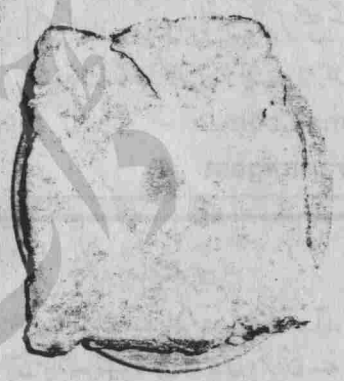

ترکیب: چٹنی بنانے کے لیے تیل گرم کریں اور چٹنی کی تمام اشیاء ڈال کر تھوڑا سا پانی ڈالیں اور ٹماٹر کے گلنے تک پکائیں۔ جب ٹماٹر گل جائیں اور پیاز نرم ہو جائے تو بھون کر اتار لیں اور ٹھنڈا کرلیں۔ اب cheese میں ہرا دھنیا اور کالی مرچ ڈال کر مکس کرلیں۔ ڈبل روٹی کے سلائس پر پہلے تھوڑا سا مکھن لگائیں پھر چٹنی کی تہہ لگائیں اوپر سے cheese ڈالیں اور 150 ڈگری Celcius پر دس منٹ کے لیے بیک کرلیں۔

.....

(تحریر: فاطمہ قیوم)

گرمیوں کے موسم میں عام طور پر یہ شکایت دیکھنے میں آئی ہے کہ لوگ بھوک نہ لگنے کی شکایت کرتے ہیں جبکہ پیاس بجھائے نہیں بجھتی۔ ایسے میں ضروری ہے کہ ایسی اشیاء کا استعمال کیا جائے جو طبیعت پر زیادہ بھاری بھی نہ ہوں اور صحت و ذائقہ میں بھی خوب ہوں۔ بھوک بڑھائیں اور بوجھل پن نہ ہونے دیں چنانچہ اس ماہ ہم آپ کو ایسی ہی مزیدار تراکیب فراہم کررہے ہیں۔

فروٹ یوگرٹ

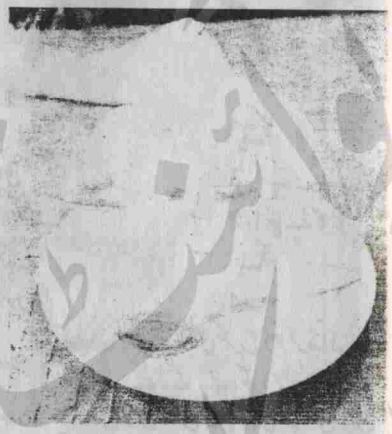

اجزاء:

دہی: ایک کلو
کنڈینسڈ ملک: ایک ڈبہ
پائن ایپل جیلی پاؤڈر: ایک پیکٹ
پائن ایپل کیوبز: ایک ڈبہ
تازہ کریم: ایک پیکٹ
جیلاٹن پاؤڈر: ایک کھانے کا چمچ

ترکیب: جیلاٹن پاؤڈر کو دو کھانے کے چمچ پانی میں مکس کرلیں اور ایک پین میں پانی گرم کر کے اس کے اوپر جیلاٹن کا برتن رکھ کر 2 منٹ تک پکائیں۔ پھر ایک بڑے پیالے میں دہی، جیلی پاؤڈر اور کنڈینسڈ ملک اچھی طرح کاٹنے کی مدد سے مکس کرلیں۔ اب پائن ایپل کے چھوٹے چھوٹے چنکس اور جیلاٹن ملا کر دوبارہ مکس کریں اور فرج میں جمانے کے لیے رکھ دیں اور خوب ٹھنڈا کرلیں۔ یاد رہے یہ جتنا زیادہ ٹھنڈا ہوگا اتنا ہی مزیدار ہوگا۔ گرمیوں میں یہ میٹھی اور ذائقہ دار ڈش بہت فرحت بخش رہتی ہے۔

.....

آم کی آئس کریم

اجزاء:

آم کا گودا: 1 کلو
کنڈینسڈ ملک: 1 ڈبہ
کریم: 1 پیکٹ
ملک پاؤڈر: 1 پیالی

ترکیب: ملک پاؤڈر کو تھوڑے سے پانی میں مکس کر کے گاڑھا سا دودھ بنالیں۔ اب بلینڈر میں تمام اجزاء کو ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں اور ایک ڈبے میں ڈال کر 24 گھنٹے کے لیے فریزر میں رکھ دیں۔ 24 گھنٹے بعد ڈبہ کھولیں۔ مزیدار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مینگو آئس کریم تیار ہے۔

.....

(تحریر: سائرہ محسن)

کیری کی چٹنی

اجزاء:

کیری:	آدھا کلو
چینی:	ایک پیالی
نمک:	حسب ضرورت
سبز الائچی:	دو عدد
لال مرچ:	آدھا چائے کا چمچ
لیموں:	ایک عدد
بادام (چھیلے ہوئے):	دس عدد
پانی:	ایک پیالی

ترکیب: کیری چھیل کر کدوکش کر لیں۔ بادام بھگو کر چھیل کر باریک کاٹ لیں۔ ایک پتیلی میں تمام اجزاء (سوائے لیموں کے) ڈال کر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ جب چینی اچھی طرح مکس ہو جائے تو اُتار کر ٹھنڈا کر لیں۔ اب اس میں لیموں کا رس ملا دیں۔ آخر میں بادام باریک کاٹ کر شامل کر لیں۔ صاف شیشے کی بوتلوں میں بھر کے رکھ دیں۔ مزیدار چٹنی تیار ہے۔

فالسے کا شربت

اجزاء:

فالسے:	ایک کلو
پانی:	3 کپ
کالا نمک:	1/2 چائے کا چمچ
چینی:	ایک کلو
لیموں:	4 عدد

ترکیب: فالسے اچھی طرح دھو کر صاف کر کے پانی ڈال کر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ اب کسی موٹے سوراخوں والی چھلنی میں ڈال کر مسل مسل کے گودا نکال لیں۔ بیج پھینک دیں۔ اب اس گودے میں چینی ڈال کر تھوڑی دیر کے لیے پکا لیں۔ چینی اچھی طرح مکس ہو جائے تو اُتار کر ٹھنڈا کر لیں اور لیموں کا رس اور کالا نمک ملا کر پلاسٹک کے ڈبے میں نکال کر فریزر میں رکھ دیں۔ جب ضرورت ہو ایک کھانے کا چمچ بھر کے جما ہوا گودا نکال لیں اور 1 گلاس ٹھنڈا پانی ملا کر شربت بنا لیں۔ مزیدار فالسے کا شربت کسی بھی وقت پیش کرنے کے لیے تیار ہے۔ گرمیوں میں یہ بہترین مشروب ہے۔

.....

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بزمِ شاعری

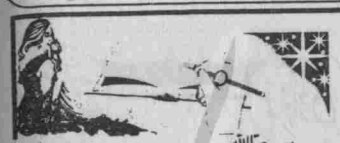

حمد

کیونکر نہ زباں پر ہو تحمید و ثنا تیری
دل محوِ نوا تیرا، جاں مدح سرا تیری
آوازِ اناالحق سے غافل ہوں تو کیونکر ہوں
ہر ایک سرِ مو سے آتی ہے صدا تیری
پھولوں کی مہک میں تُو انجم کی جھلک میں تُو
وہ رنگِ وفا تیرا یہ شانِ ادا تیری
کہسار و بیاباں میں گلشن میں خیاباں میں
خوشبو لئے پھرتی ہے ہر صبح صبا تیری
ظالم کی جفاؤں میں مظلوم کی آہوں میں
اندازِ جفاؤں تیرا تصویرِ غنا تیری
پیہ پردے میں چھپنے کے انداز نرالے ہیں
ہر ذرے کے دامن میں رقصاں ہے ضیا تیری
اس شانِ تغافل کو کہتے ہیں ادا تیری
ہم سے بھی گنہگاروں کو تیرا سہارا ہے
چھوڑے تو کرم تیرا پکڑے تو رضا تیری
(صوفی غلام مصطفیٰ تبسم)

نعت

حقیقت میں وہ لطف زندگی پایا نہیں کرتے
جو یادِ مصطفیٰ ﷺ سے دل کو بہلایا نہیں کرتے
زباں پر شکوۂ رنج و الم لایا نہیں کرتے
نبی ﷺ کے نام لیوا غم سے گھبرایا نہیں کرتے
یہ دربارِ محمد ﷺ ہے، یہاں ملتا ہے بے مانگے
ارے بھائی! یہاں دامن کو پھیلایا نہیں کرتے
یہ لمحہ ہے کہ بس قربان ہو جا ان کی چوکھٹ پر
یہ لمحے زندگی میں بار بار آیا نہیں کرتے
یہ ہے دربار آقا ﷺ کا، یہاں اپنوں کا کیا کہنا
یہاں سے ہاتھ خالی غیر بھی جایا نہیں کرتے
جو ان کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہیں اے حامد
کسی کے سامنے وہ ہاتھ پھیلایا نہیں کرتے
(حامد لکھنوی)

عیارِ زمانہ

نالۂ بلبل کو سنگ دل لوگ دلربا نغمے سے ملا دیتے ہیں
درد کے ماروں کا یوں درد اور بڑھا دیتے ہیں
کسی کی داستان حسرت سنتے ہیں تو جھوم اٹھتے ہیں
رستے ہوئے زخموں پہ کچھ نمک اور لگا دیتے ہیں
نازک مزاج ستمگر کچھ سننے کی تاب نہیں رکھتے
جورو جفا کے پتلے حق گوئی کی سزا دیتے ہیں
خود ساختہ دانشور، ادب نواز، نکتہ سنج کوتاہ بیں
بولہبیوں سے اپنا مقام گھٹا دیتے ہیں
نمود و نمائش بے جا تملق انسان کو خوار کرتا ہے
چاپلوسی خوشامد کے رسیا اپنا شرف گنوا دیتے ہیں
ہر عیب مباح ہر ظلم روا ہے ان کے لئے
زیر دستوں کو روند کر انہیں صلۂ وفا دیتے ہیں
اپنی کہتے ہیں اوروں کی سنتے ہیں خرد مند لوگ
یاوہ گو تک بندیوں کے رسیا مجلس کا وقار گھٹا دیتے ہیں
امن و آشتی باہمی یگانگت انسانیت کا طرہ امتیاز
دو رُخی قابل نفریں ایسے لوگ خود کو داغ دیتے ہیں
خوفِ خدا سے لرزتے کانپتے خدا کے نیک بندے
اپنے خالق کو یاد رکھتے ہیں اپنی ہستی مٹا دیتے ہیں
(قاضی محمد یوسف، مسقط)

غزل

شہرِ دل میں درد کی لہر اٹھی
آنکھ سے ٹپکا لہو، آنسو ہوا
اب زمانے سے ہوئے ہم بے نیاز
سب عدو ہیں میت بس اک تو ہوا
کوئی بھی اپنا نہیں اس بزم میں
پھر بھلا میں کیوں یہاں مدعو ہوا؟
دل میں اک طوفان سا اٹھنے لگا
جب کبھی بھی سامنا تجھ سے ہوا
وقت کی بندش سے جو ہوا آزاد
بس وہی فرخ تیرا ہمسر ہوا
(زاہدہ یوسفی فرخ)

چلے

کبھی وہ دور تھا فلموں میں بس "بہار چلے"
نئے زمانے میں "دینا" کا کاروبار چلے
ہم ایک بیوی کو تفریح کرا نہیں سکتے
جناب شیخ مگر لے کے چار، چار چلے
کہاں سے لائیں کہ مہنگا ہے آج خالص گھی
یہاں تو دال میں بس تیل کا بھگار چلے
پٹے جو ہم تو بچانے کوئی نہیں آیا
پڑے جو کھاٹ پہ، آتے ہیں غم گسار چلے
چلی نہ راہ نما کی خطابت و بکواس
سیاسی جلسے میں جوتے مگر ہزار چلے
جناب شیخ نے اس کو حرام کہہ ڈالا
جوئے میں چند روپے آپ جب کہ ہار چلے
سیاسی لوٹوں کا بازار گرم ہے بھائی!
بنانے لوٹے یہاں پر بہت کمہار چلے
ظریف! وقت بُرا آ گیا کسی پر اگر
تو اس کو ڈسنے کو پھر آستیں کے مار چلے
(پروفیسر محمد ظریف خان، کراچی)

بوڑھے ہڈ

ہمارا خون بھی ہمارے سامنے
ننگا ہو کے ناچنے لگا ہے
ہمارا خون بھی ہم پہ ہنسنے لگا ہے
گیلا لکڑ مچنے لگا ہے

.....

آج بڈھے کی آنکھوں سے بھی
آج پتھر کی آنکھوں سے بھی
لہو کے آنسو برس رہے ہیں
بوڑھے ہڈ بھی کھرچ رہے ہیں

.....

ہماری غیرت ہی آج ہماری
عزت کا گلا دبانے لگی ہے
یارو سوکھے درختوں سے بھی
ساوی ٹہنی پھٹنے لگی ہے

.....

آج ہماری عزت کے والی
ہمیں ننگا کر کے ہنسے
آج وہ وحشی کتوں کی طرح
ہماری عزت کے پیچھے بھاگے

.....

کون رب کے پاس جائے
رب کو جا کے بتائے
دل کا حال ہمارا
کہ تبسم دکھوں کا مارا
(اقبال تبسم، راولپنڈی)

زندگی

گلستاں ہوا سبزہ زار اور شبنم ڈھلی
بادِ نسیم چلی تو شوخ سی اک کلی کھلی
وہ نوواردِ چمن دلکش رنگیں و شاد تھی
شبِ ہجراں غم طوفاں سے بھی آزاد تھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دلربا اداؤں سے حسن چمن بڑھایا اس نے
چار سو پیامِ امن و محبت سنایا اس نے
کوئل و بلبل ساتھ اسکے نغمہ سرا تھیں
ہوائیں بھی قدم قدم پہ اسکی ہم نوا تھیں
جب تلک حقیقت زندگی آشکار نہ تھی
کوئی طوفاں کوئی مشکل اسے بار نہ تھی
نادانی میں نہ تھا ہجر کا غبار بھی نظر میں
اور نہ تھا حسن و عشق کا بیوپار بھی نظر میں
نظر باطن کھلی تو حقیقت یہ بے دار ہوئی
کہ زندگی گلستاں بے کس و بے اختیار ہوئی
یہ عالم بے کراں اور لاحق خوفِ تنہائی
ہر راہگزر پر تھی منتظر یاں دردِ رسوائی
جابجا تھے خوفِ زنداں کے بار اور یہ زندگی
فکر روزگارِ جہاں کے خار اور یہ زندگی
گردش آلام رہی یہ زندگی ہر گام پر
گرتی چلی گئیں سب کلیاں حسرتِ ناکام پر
بالآخر جس مٹی سے ہوئی تھی ناز سے پیدا
پھر اسی میں ہو گئی قضائے بے نیاز سے فنا

(عصمت اقبال عین، منگلا ڈیم)

غزل

لوگ گھروں سے نکل پڑے ہیں
قاتل ہر چوراہے پر کھڑے ہیں
ہزار رنگ بدلے زمانے نے اب
کمتر اب پھر معتبر ہوئے ہیں
اس کا رونا بجا ہے دوستو
میرے بھی تو کئی اپنے مرے ہیں
شجر سارے جنگل کے کٹے ہیں
گھونسلے پرندوں کے آ گرے ہیں
رہبروں کو روکو اگر روک سکتے ہو!
لوگ اب سوئے مقتل چلے ہیں
پتہ چلا اس وقت مجھے بھی
جب اپنے میرے جدا ہوئے ہیں
جن کی خاطر خواہشیں ترک کیں اپنی
وہی آخر ہم سے آ کے لڑے ہیں

(وسیم اختر، راولپنڈی)

غزل

فتنے کسی کی چال سے اٹھتے ہوئے دیکھے
کتنوں کے مقدر یوں بگڑتے ہوئے دیکھے
سنگلاخ چٹانوں سے تراشے ہوئے بدن
جذبات کے شعلوں سے پگھلتے ہوئے دیکھے
انگڑائی تیری تو بہ شکن تھی ہی کچھ ایسی
زاہد کے ہم نے ہونٹ لرزتے ہوئے دیکھے
میری یہ تمنا ہے عدو اور بھی تڑپے
تم کو میری خلوت سے نکلتے ہوئے دیکھے
اختر کی توبہ خطرے سے دوچار ہو گئی
جلوے جو سرعام مچلتے ہوئے دیکھے

(رشید اختر قادری)

غزل

بکھر رہی ہے میری ذات اسے کہہ دینا
کڑے ہیں ہجر کے لمحات اسے کہہ دینا
سوائے موسم غم اس کے شہر جائے تو
میرے دکھوں کی یہ بات اسے کہہ دینا
یہ وحشتیں یہ اُداسیاں یہ رت جگوں کے عذاب
سب اس کی ہیں عنایات اسے کہہ دینا
بہت طویل بہت کربناک ہوتی ہیں
جدائیوں کی ہر رات سے کہہ دینا

(ایس۔امتیاز احمد، کراچی)

غزل

غم چلے جائیں گے لیکن رنجشیں رہ جائیں گی
پیار مٹ جائے گا تو پھر نفرتیں رہ جائیں گی
تو نے گر بدلی نہ اپنی یہ پرانی زندگی
چار سو پھیلی ہوئی یہ وحشتیں رہ جائیں گی
طنزیہ لہجے کی باتیں یاد رہتی ہیں سدا
یاد ساری اس طرح کی صورتیں رہ جائیں گی
آج میں ہوں آبلہ پائی کے رستے پر رواں
کل کو مجھ کو ڈھونڈتی یہ منزلیں رہ جائیں گی
ایک دور ایسا بھی آئے گا بڑھیں گے فاصلے
ہاتھ ملتی دُور تک یہ قربتیں رہ جائیں گی
سیم و زر یہ گھر حویلی چھوڑ جائیں گے
اس جہاں کی اس جہاں میں دولتیں رہ جائیں گی
اتنا کھو جائیں گے ہم اس زندگی کی بھیڑ میں
خود سے ملنے کی ہمیں بھی حسرتیں رہ جائیں گی
اک پرانی ڈائری اور ناچتے گاتے حروف
خود سے ملنے کی یہی تو صورتیں رہ جائیں گی
جو کسی کی آنکھ کو بخشے گا امیدوں کے دیپ
اس کے چہرے پر ہی ساری رونقیں رہ جائیں گی
نفرتوں کا خاتمہ ہو گا فضا سے جب کنول
پھر فضا میں پیار کی سب نکہتیں رہ جائیں گی

(یاسمین کنول، سیالکوٹ)

برسات

اُڑتے ہوئے دیکھے بخارات ابھی یہ
لمحات میں ہو جائے گی برسات ابھی یہ
چھائے ہوئے بادل میں اٹی ہیں گھٹائیں
چھاجوں ابھی پڑ جائے گا مینہ وہ ہیں ہوائیں
ہو وقت پہ بارش تو خزانہ ہے کوئی یہ
ساون کا جسے کہیے زمانہ ہے کوئی یہ
لو ہوتی ہے بارش کہ میں ٹپ ٹپ کی صدائیں
جل تھل ابھی ہو جائے گا بہہ جائیں گی راتیں
بارش ہے بہت تیز پھسلتا ہے کوئی یہ
گڑھوں میں پڑا ہے تو نکلتا ہے کوئی یہ
پرنالوں کا ہے شور یہ کانوں میں گرجتا
بہہ جاتا ابھی شہر اگر اور برستا
چھٹ جائیں گے بادل یہ دھنک رنگ بکھر کر
ہو جائے گا نظارہ حسیں اور نکھر کر
اب جھولے جھلاتی ہوئی پریاں ہیں دھنک میں
فراٹے یہ بھرتی ہوئی کاریں ہیں دھنک میں
ہے تیز بہت آج یہاں نہر کا پانی
کچھ اور نظر آتی ہے دریا کی روانی
کھیتوں میں یہ بھیگے ہوئے موسم کا اثر ہے
انفاس میں ٹھنڈک ہے بڑی تیز نظر ہے
لو شام ہوئی اور نکل آئے ہیں تارے
دلکش ہیں بہت زخمی یہ فطرت کے نظارے

(ظفر زخمی)

نظم

بڑھتے قدم مت روکو
درندہ صفت یہ شکاری
بڑے ہیں ہوشیار
انہیں کیا معلوم کہ
ساری لڑکیاں
ایک جیسی نہیں ہوتیں
یہ جال پھینکتے ہیں
یہ گھائل کرتے ہیں
انہیں کیا معلوم
یہ مجبور لڑکیاں
کیا مقصد لے کر باہر نکلتی ہیں

ان کے ارادے کیا ہیں!
یہ جو خود کو مضبوط
ظاہر کرتی ہیں
کتنے پتھروں سے سر پھوڑتی ہیں
کتنے قلعے سر کر کے یہاں تک پہنچتی ہیں
قدم قدم پر شکاری
جھانسے دینے کو
تیار بیٹھے ہیں
یہ تو پہلے ہی کر چی کر چی ہیں
انہیں توڑ کر کیا ملے گا
یہ ان فصیلوں سے
جہاں ان کی حفاظت جان سے بڑھ کر ہوتی ہے
باہر جب نکلتی ہیں
ان کے حوصلے، ان کی قوت فیصلہ
سب کانچ کی مانند ہوتے ہیں
بڑی مشکلوں سے یہ ایک ایک قدم اٹھا کر
ڈولتی ہوئی
خود کو خوف اور جہالت کے سیاہ بادلوں سے نکالتی ہیں
تم کیا جانو کہ یہ نازک گڑیاں
تمہاری نظروں کے تیروں سے ہی پاش پاش ہو جاتی ہیں
انہیں دوبارہ انہی فصیلوں میں قید ہونا ہے
کچھ لمحے تو انہیں آزاد رہنے دو
انہیں خوش رہنے دو
انہیں بھی کچھ کرنے دو
ان کے بڑھتے قدم مت روکو
ان کو آگے بڑھنے دو
ان کو گر کچھ دے نہیں سکتے
ان سے کچھ لو بھی مت
ان کے بڑھتے قدم مت روکو
ان کو بھی کچھ کرنے دو
منزل پر پہنچنے دو

(مہر نسیم، لاہور کینٹ)

خاص اعلان

محترم قارئین! بزم شاعری میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعرہ کا تعارف بمعہ تصویر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل/نظم، پسندیدہ شاعر کی غزل/نظم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کوپن پُر کر کے سیارہ ڈائجسٹ: 244 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور پر ارسال کریں۔

یہاں اپنی تصویر منسلک کریں

کوپن برائے اس ماہ کا شاعر

نام:..... تعلیمی قابلیت:.....
عمر:..... پسندیدہ شاعر:.....
پسندیدہ غزل/نظم:.....
مشاغل:..... تاریخ پیدائش/برج:.....
شادی شدہ/غیر شادی شدہ:..... پتہ:.....
ای میل:.....

نوٹ: اپنی پسند ناپسند، شاعری کی ابتدا، مزاج، اور دیگر تفصیلات الگ صفحے پر درج کر کے بھیجئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حکیم راحت نسیم سوہدروی

گردے کے امراض

پاکستان سٹون بیلٹ میں واقع ہے، ہر سال تقریباً دس ہزار افراد گردوں کے امراض کے سبب ہلاک ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اس مرض کے بارے میں آگاہی اور اس سے بچاؤ کیلئے احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے!

پاکستان میں تیزی سے پھیلتے مرض اور اسکے علاج بارے معلوماتی تحریر

پاکستان میں گُردے کے امراض میں روز بروز تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے، ایک اندازے کے مطابق نوے لوگوں میں سے ایک گُردے کی پتھری میں مبتلا ہے جبکہ گُردے کے آخری سٹیج کے مریضوں کی تعداد ہر دس لاکھ میں سے چار ہزار تک پہنچ چکی ہے اس کی وجہ پتھری کے مریض ہیں۔ پاکستان سٹون بیلٹ میں واقع ہے، ہر سال تقریباً دس ہزار افراد گُردوں کے امراض کے سبب ہلاک ہو جاتے ہیں۔

گردے

انسانی جسم میں بیضوی شکل کے دو غدود ہوتے ہیں جو کمر کے نچلے حصے میں ریڑھ کی ہڈی کے ایک جانب آخری پسلی کے نیچے پائے جاتے ہیں۔ ان کا شمار اعضائے رئیسہ میں ہوتا ہے۔ گردے ایک فلٹر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے طور پر کام کرتے ہیں۔ ہر گُردہ میں تقریباً دس لاکھ خوردبینی نالیاں ہر وقت خون کو فلٹر کر کے پیشاب بنانے میں لگی رہتی ہیں۔ یہ پیشاب گردے کے ذریعہ حالبین مثانہ میں پہنچ جاتا ہے۔ جب 350 ملی لیٹر جمع ہو جاتا ہے تو پیشاب کی حاجت ہو جاتی ہے اور مجری بول سے خارج ہو جاتا ہے۔ جسم انسانی میں غذائی استعمال کے دوران کئی فضول اور بیکار زہریلے کیمیائی مادے، مرکبات تیار ہوتے ہیں جن کا اخراج ضروری ہے۔ طبعی پیشاب میں یوریا، نائٹروجن، کریاٹین، البیومن، یورک ایسڈ، حیاتین، ہارمونز، فائبرے اور کوسٹین جیسے نامیاتی مرکبات خارج ہوتے ہیں۔ غیر نامیاتی اجزاء میں سے کلورائیڈ، فاسفوریں بطور سوڈیم کلورائیڈ، سلفر، پوٹاشیم، سوڈیم، کیلشیم، میگنیشیم، آیوڈین، آرسینک اور سیسہ وغیرہ شامل ہیں۔ کائنات کا نظام توازن پر قائم ہے۔ اس طرح جسم انسانی ہو یا کوئی اور شے توازن پر قائم ہے۔ پہلے گُردوں کا فعل اخراج فضلات قرار دیا جاتا رہا ہے مگر جدید تحقیق کے مطابق گُردے اپنی کیمیا گری سے خون کے اندر پانی کا تناسب قائم رکھتے ہیں اور معدنی اجزاء کا صحیح توازن پیدا کرتے ہیں۔ قدرت نے ان کی تعمیر میں یہ کرشمہ بھی رکھا ہے کہ اگر ایک گُردہ ناکارہ ہو جائے اور اسے نکالنا ضروری ہو تو دوسرا گُردہ بہ سہولت اپنے فرائض سرانجام دے سکتا ہے۔

پتھری کس طرح بنتی ہے؟

خون یا بلغم کے ذرے یا جرثومے کے اطراف معدنی اجزاء جمع ہو کر پہلے رسوب ریت کے ذرات قلموں کی شکل اختیار کرتے ہیں جن سے پہلے چھوٹی پتھریاں بنتی ہیں جو جمنے سے بڑھ جاتی ہیں۔ یہ پتھری گُردوں یا ان کی نالیوں میں کہیں بھی بن سکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک وقت میں ایک پتھری بنے بلکہ کئی پتھریاں بھی بن سکتی ہیں۔ یہ سائز میں ریت کے ذرات سے لے کر لیموں تک بڑی ہو سکتی ہے۔ ریگ گردہ (ریت) چھوٹی پتھریاں حالبین سے گزر کر مثانہ میں پہنچ کر پیشاب کے ذریعے خارج ہو جاتی ہیں جبکہ بڑی پتھریاں حالب سے گزرنے کی تگ و دو میں شدید درد پیدا کرتی ہیں اور اس طرح پیشاب کے اخراج میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔

پتھری بننے کے اسباب

☆ پانی کے کم استعمال سے پیشاب گاڑھا ہو جاتا ہے اور نمکیات بہہ جانے کی بجائے جم کر پتھری بنا لیتے ہیں۔

☆ آلودہ پانی

☆ نقص تغذیہ

☆ کاہلی اور ورزش نہ کرنا

☆ حیاتین الف کی کمی

☆ حیاتین ڈی کا زیادہ استعمال

☆ پیشاب کو ارادۃً روکنا

☆ خون میں کیلشیم کی کمی

☆ کیمیائی ادویہ کا استعمال

☆ موروثی اور پیدائشی بھی ہو سکتی ہے

☆ نظام اخراج کے اعضاء میں عفونت

☆ خون میں یورک ایسڈ کی زیادتی

پتھری کی اقسام

گُردہ کی پتھریاں معدنی نمکیات سے بنتی ہیں۔ انہی نمکیات کے باعث مختلف اقسام بیان کی جاتی ہیں۔ تین عام اقسام یہ ہیں:

(۱) یورک ایسڈ کی پتھریاں:

یہ بھورے سرخ رنگ کی اور سخت ہوتی ہیں، پیشاب کے امتحان سے اس کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔

(۲) کیلشیم آگزیلیٹ کی پتھریاں:

رنگت میں سیاہ اور ساخت میں کھردری ہوتی ہیں۔ یہ بھی گُردہ میں بنتی ہیں اور کثیر الوقوع ساٹھ فیصد تک پائی جاتی ہیں۔ عام طور پر اکیلی ہوتی ہیں اور گُردہ میں پھنسی رہتی ہیں۔ ان سے بعض دفعہ گُردہ زخمی ہو جاتا ہے جس سے پیشاب میں خون آنے لگتا ہے۔

(۳) فاسفیٹ کی پتھریاں:

یہ زردی مائل، بیضوی شکل اور ساخت میں زیر ہوتی ہیں۔ عموماً مثانہ میں بنتی ہیں اور تین فیصد تک پائی جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ بعض اوقات دو تین مادے جمنے سے مرکب قسم کی پتھری بنتی ہے جن میں زینتھین، سمٹین اور قسم کی پتھری پائی جاتی ہے۔

علامات

گُردے کے مقام پر ہلکی ہلکی ٹیس اُٹھتی ہے، بار بار پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ جب پتھری اپنے مقام سے ہٹ جائے یا گُردے سے حالبین یا مثانہ کی طرف آ جائے تو شدید درد ہوتا ہے اور بعض اوقات قے آ جاتی ہے۔ کبھی پیشاب کے ساتھ خون ملا ہوا آتا ہے۔

تشخیص

پیشاب، ایکسرے اور الٹراساؤنڈ کی مدد سے قلموں اور پتھری کی تشخیص کی جا سکتی ہے۔

احتیاطی تدابیر

پانی کا استعمال ہر گھنٹے کے بعد ضرور کیا جائے۔ صرف پانی نہیں بلکہ غذائی پرہیز کو بھی اہمیت دی جائے۔

اگر پیشاب میں عمل تیزابی ہو تو گوشت اور دیگر لحمیاتی و پروٹینی غذا سے پرہیز کریں۔ سبزیوں اور پھلوں کا استعمال زیادہ کریں۔ اگر کیلشیم آگزیلیٹ زیادہ خارج ہو رہے ہیں تو پھل سبزیاں کم استعمال کریں اور لحمی غذائیں زیادہ لیں۔

یہ سمجھ لینا صحیح نہیں ہے کہ اگر ایک بار پتھری خارج ہو جائے تو دوبارہ نہیں بنتی۔ اگر پتھری کے اخراج کے بعد احتیاطی تدابیر اختیار نہ کی جائیں تو پتھری دوبارہ بن جاتی ہے۔

پتھری ہر عمر میں ہو سکتی ہے

پتھری کسی بھی عمر میں بننا شروع ہو سکتی ہے۔ پتھری خارج ہو تو اسے ضائع کرنے کی بجائے اس کا کیمیائی تجزیہ کرایا جائے تاکہ جن اجزاء سے بنتی ہے ان سے احتیاط کی جا سکے۔

علاج

طب مشرقی میں اس کا مؤثر علاج موجود ہے۔ عموماً ان تدابیر سے فائدہ ہوتا ہے:

☆ برگ چولائی سبز (چولائی کا ساگ) 50 گرام کاٹ کر آدھے گلاس پانی میں جوش دے کر صبح نہار منہ ہی پی لیا جائے۔

☆ برگ عجوبہ سبز (پتھر چٹ) ایک پتہ اور کالی مرچ سات عدد پیس کر چھان کر سہ پہر کو روزانہ ایک ماہ تک پی لیا جائے۔

سوزش گردہ (Nepritis)

گُردوں کا ایک عام وقوع پذیر مرض ہے۔ ہر گُردے میں تقریباً دس لاکھ نیفران (فلٹر) خوردبینی نالیاں ہوتی ہیں۔ خالی آنکھ سے یہ ریت کے برابر نظر آتے ہیں مگر خوردبین سے ایک بڑے سر والا کرم لگتا ہے۔ ہر فلٹر میں خون کشید کر کے پیشاب بنانے کے لیے جھلی ہوتی ہے۔ گُردوں کی سوزش اس جھلی کو کہتے ہیں۔ اس میں گُردے متورم ہو جاتے ہیں۔ گُردے بڑے حساس اور نازک اعضاء ہیں جن میں بعض اسباب مثلاً سمیات، چوٹ لگنا،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خواب کی بات

''ڈارلنگ! گزشتہ شب میں نے ایک انتہائی خوبصورت خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میری شادی دنیا کی ایک انتہائی حسین لڑکی سے ہوگئی ہے۔'' ایک نوجوان نے کہا۔

''تو کیا ہم دونوں خوش تھے؟'' لڑکی نے کہا۔

ترکی بہ ترکی

''ڈیئر! مجھے معاف کر دینا۔ میں آج کل کچھ غائب دماغ سا ہوگیا ہوں۔ مجھے یہ تو یاد ہے کہ گزشتہ شب میں نے پارٹی میں تمہیں شادی کی پیشکش کی تھی مگر مجھے یہ یاد نہیں آرہا کہ تم نے یہ پیشکش قبول کر لی تھی یا ٹھکرا دی تھی؟''

''مجھے خوشی ہے کہ تم نے یہ پیشکش کی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ میں نے ایک شخص کی پیشکش ٹھکرا دی تھی مگر مجھے یاد نہیں پڑتا کہ وہ کون تھا؟''

سمندر

عورت: تمہیں دیکھ کر مجھے سمندر یاد آجاتا ہے۔

مرد: تمہارا مطلب ہے میں پراسرار اور رومان پسند ہوں۔

عورت: نہیں..... تمہیں دیکھ کر میری حالت غیر ہو جاتی ہے۔

اخبار

''مجھے اس پر اعتراض نہیں کہ تمہارا بوائے فرینڈ ہر رات کیوں تمہیں ملنے آتا ہے۔'' باپ نے کہا۔ ''نہ ہی مجھے اس بات پر اعتراض ہے کہ تم لوگ ڈرائنگ روم میں گھنٹوں بیٹھے رہتے ہو لیکن کیا تم اس سے پوچھ کر بتا سکتی ہو کہ وہ روزانہ صبح جاتے وقت میرا تازہ اخبار اپنے ساتھ کیوں لے جاتا ہے؟''

☆☆☆

جراثیمی سمیات جو دوسرے مقامات پر پیدا ہو کر گردوں میں آجاتے ہیں، اس طرح گردے متورم (نیفرائٹس) ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ان سے خون کے سرخ خلیات اور دموی پروٹین گزرنے لگتے ہیں جو پیشاب کے معائنہ میں آجاتے ہیں۔ بعض اوقات یہ سوجے ہوئے گردے زیادہ پانی جذب کر لیتے ہیں جس سے ہاتھ پاؤں یا آنکھوں پر ورم آجاتا ہے۔ اس کی ایک قسم جراثیمی التہاب (اکیوٹ نفرائٹس) ہے۔

گردوں کا فیل ہو جانا

یہ مہلک ترین مرض ہے، اس میں گردوں کا عمل پچاس فیصد کم ہو جاتا ہے اور اگر احتیاطی تدابیر اور علاج نہ کیا تو یہ عمل مزید کم ہونے لگتا ہے۔ گردوں کا عمل مکمل نہ ہونے سے خون میں زہریلے مادے بڑھ جاتے ہیں جس سے یوریا، کریٹی نائن (Creatinine) کم خارج ہوتے ہیں اور خون میں ان کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ جسم میں پانی اور نمک کی زیادتی سے بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے، خون میں تیزابیت بڑھ جاتی ہے، کیلشیم اور وٹامن ڈی کی کمی ہو جاتی ہے، خون بنانے والے ہارمون اور ارتھروپائے ٹین کے نہ بننے سے خون کی کمی ہو جاتی ہے۔ پوٹاشیم کی زیادتی ہو جاتی ہے۔ ابتداء میں گردوں کے فیل ہونے کا پتہ نہیں چلتا۔ جب گردوں کا عمل پچیس فیصد سے کم ہونا شروع ہوتا ہے تو کمزوری کا احساس ہوتا ہے۔ جوں جوں گردوں کے عمل میں کمی آتی ہے تو کمزوری کا احساس بڑھتا جاتا ہے۔ جب گردوں کا عمل بہت کم دسواں حصہ رہ جائے تو بھوک بھی کم ہو جاتی ہے۔ جسم پر سوج (ورم) پڑ جاتی ہے اور بعض دفعہ قے آتی ہے۔

گردوں کے فیل ہونے کے اسباب

گردوں کے فیل ہونے میں بلڈ پریشر کا بڑھا رہنا، ذیابیطس، گردے کی سوزش (نیفرائٹس) اور گردوں کی پتھریاں، اس کے علاوہ شدید صدمے، گردوں کے عمل پر اثر پڑنا، انٹی بایوٹیکس کا بکثرت استعمال، کارٹی سون کا استعمال، پیشاب کی نالی میں سوزش سے پیشاب واپس گردوں میں جانا اور دیر سے یا غلط علاج سے بھی گردے تباہ ہو جاتے ہیں۔

گردے فیل ہونے یا ان کے عمل کی درستگی جاننے کے لیے خون میں یوریا اور کریٹینن کا ٹیسٹ ضروری ہے۔

ڈایالسسیس

ڈایالسسیس کے معنی الگ کرنے کے ہیں۔ یہ گردے فیل ہونے کا جدید علاج ہے۔ اس میں مشین کے ذریعے گردے صاف کئے جاتے ہیں اور جسم سے گندے زہریلے مادوں کا اخراج ہوتا ہے۔ صاف خون جسم میں واپس چلا جاتا ہے۔ یہ زہریلے مادے گردوں کے صحیح عمل نہ ہونے کی وجہ سے جسم میں داخل ہو جاتے ہیں۔

ڈایالسسیس کا عمل اس وقت تک کیا جاتا ہے جب تک گردوں کا عمل صحیح نہ ہو جائے یا ان کی جگہ صحت مند گردوں کی پیوندکاری نہ ہو جائے۔ ڈایالسسیس کا عمل مریض کے مرض کے مطابق ہوتا ہے۔ جو گردے کچھ کام کر رہے ہوتے ہیں ان کے لیے مہینے دو مہینے بعد لیکن جب زیادہ ناکارہ ہو جائیں تو بعض حالات میں مہینے میں دو بار بھی ڈائلیسس ہوتا ہے۔ بعض انتہائی صورتوں میں ہر ہفتہ یا ہفتہ میں دو بار بھی اس عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کا انحصار گردوں کی حالت پر ہے۔

تسمم بولی (Uraemia)

گردوں کے امراض میں ایک تسمم بولی ہے جسے انگریزی میں (Uraemia) کہتے ہیں۔ اس میں گردوں کے فعل میں خرابی کے باعث پیشاب کے ذریعے خارج ہونے والے بعض سمی مادے خون میں جمع ہو جاتے ہیں جس کے باعث خون میں ان کی نارمل مقدار بڑھ جاتی ہے۔ گردے آہستہ آہستہ پیشاب بنانے کے فعل کو کم کر دیتے ہیں یہاں تک کہ اگر کوئی تدبیر نہ کی جائے تو پھر بالکل ترک کر دیتے ہیں اور خون میں سمی مادے بڑھ جاتے ہیں اور یوں بلڈ یوریا (S.B.Uria) کی نارمل مقدار 40 سے بڑھ جاتی ہے۔ گردوں کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے تو ایس کریٹی نین (CreatnineS.) کی مقدار جو کہ 1.1 ہوتی ہے بڑھی ہوئی معلوم ہوگی۔

اس مرض میں چہرہ پر ورم آ جاتا ہے، کبھی پورے جسم پر آ جاتا ہے، بھوک متاثر ہو جاتی ہے، جی خراب ہوتا ہے، قے آتی ہے اور خون کے سرخ ذرات کی مقدار بھی کم ہونے لگتی ہے۔ مریض کو پیاس کی شدت ہوتی ہے، خوب پانی پیتا ہے مگر پیشاب بہت کم آتا ہے۔ سانس پھولتا ہے۔

اس مرض کا بڑا سبب آرام طلبی اور کیمیکلز کا استعمال ہے جس سے دوران خون سُست ہو کر اعضاء کی کارکردگی متاثر ہو جاتی ہے اور اس سے یہ مرض جنم لیتا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔

☆ لیموں کے رس میں شورہ قلمی ملا کر پلانا مفید ہے۔

☆ فارخشک چھ گرام ریوند چینی تین گرام آدھے گلاس پانی میں جوش دے کر چھان کر روز رات سوتے وقت پلانا بھی مفید ہے۔

☆ گردوں کی کارکردگی مؤثر بنانے کے لیے جوارش زرعونی عنبری صبح نہار منہ چھ گرام اچھی تدبیر ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاوید راہی

اجنبی میزبان

وہ آبادی یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے قدرت نے زمین کے سینے پر سینکڑوں طلسماتی گنبد پھیلا دیئے ہوں، برف کی مانند سفید چمکتے گھروں کے باہر مرد عورتیں بچے ذرق برق لباس زیب تن کئے دکھائی دے رہے تھے۔ روایتی ڈھول ڈھمکے کی تال پر مدھر نسوانی آوازوں کا جادو ماحول کو خواب ناک بنا رہا تھا۔

پراسرار میزبانوں کے ساتھ گزاری ایک یادگار رات کا قصہ

وزارت اطلاعات آزاد جموں و کشمیر میں مجھے کام کرتے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ میرے کام سے وزیراعظم آزاد کشمیر کافی حد تک خوش تھے فضل ادیب صاحب کے روزنامہ اعلان راولاکوٹ میں بطور نیوز ایڈیٹر آیا مگر کام کی نوعیت نہ سمجھ پایا اور واپس لاہور جانے کے لئے سوچ رہا تھا کہ آزاد کشمیر کے ایک منسٹر نثار چغتائی کی مہربانی سے روزی روٹی کا انتظام ہو گیا۔ نڑول کے گیسٹ ہاؤس میں رہنے کی جگہ مل گئی اور یوں میں کام پر لگ گیا۔ برسٹر سلطان محمود ان دنوں ملک سے باہر تھے اور میرے پاس کافی وقت ہوتا تھا۔ روزمرہ کے ضروری امور نمٹا کر اسمبلی سے واپس اپنے کمرے میں آ جاتا اور لکھنے پڑھنے میں وقت کا پتہ ہی نہ چلتا۔ کھانا سرکاری، رہائش سرکاری اور کوئی اضافی خرچہ نہیں تھا اس لئے تنخواہ پوری ہی بچ جاتی کیونکہ روزنامہ اعلان سے فارغ ہونے پر جو کچھ ملا اس سے اخراجات چل رہے

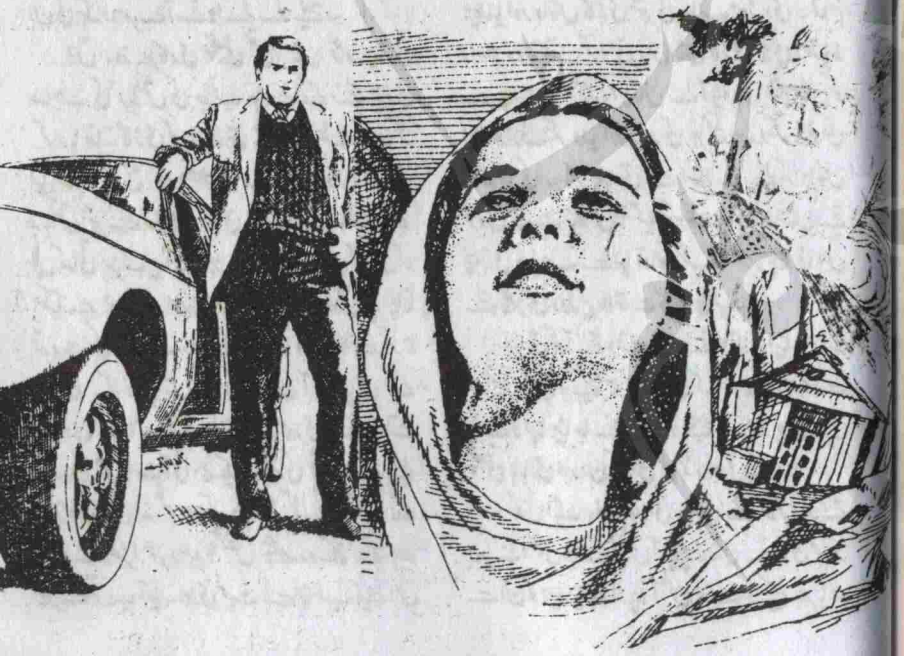

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے۔ آس پڑوس میں اتنی واقفیت ہو چکی تھی کہ میں خود کو اکیلا محسوس نہ کرتا۔ نزول گیسٹ ہاؤس میں جو سرکاری وغیر سرکاری مہمان ٹھہرائے جاتے تھے ان کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی اس لئے یہاں شور شرابے کی فضا قدرے نہ ہونے کے برابر تھی۔ میرے قریب ہی اے۔ پی۔ پی کا آفس تھا میں اکثر وہاں شام کو جا بیٹھتا یوں خبروں سے بھی آگاہی ہوتی رہتی جو ایک صحافی کے لئے انتہائی اہم درجہ رکھتی تھی۔ مظفر آباد میں وہی لوگ آباد تھے جو ایک دوسرے کو تقریباً روز ہی ملتے اور آشنائی کی حد تک واقف تھے۔ میں یہاں آکر چہل قدمی کا عادی ہو گیا تھا۔ صبح شام میرا معمول تھا کہ میں دریائے چندرا بھاگا (چناب) کے ایک خاص مقام پر آبیٹھتا اور دونوں دریاؤں کو آپس میں گتھم گتھا ہوتے دیر تک دیکھتا رہتا۔ آزاد کشمیر میں زیادہ تر لوگ سیر و سیاحت سے لطف اندوز ہونے چند روز کے لیے آتے اور پھر ان کی جگہ دوسرے آنے والے لے لیتے۔

اس روز سرکاری چھٹی تھی، میں نثار چغتائی صاحب کی رہائش کی جانب جانے کے لئے تیاری کر رہا تھا۔ گاڑی کو رات ہی میں نے فٹ فاٹ کر لیا تھا تاکہ صبح کی مشقت سے بچ جاؤں ان کی رہائش شہر سے خاصی دور تھی۔ دریا کے ساتھ ساتھ بل کھاتی سڑک پر آگے بڑھنے کا لطف وہی محسوس کر سکتا ہے جو خنک اور معطر ہواؤں کے دوش پر چلتا قدرت کی دلفریب رعنائیوں کی حمد و ثناء کا ورد کرتا مدہوشی کے عالم میں گم ہو۔ میں آس پاس کے نظاروں سے اس وقت چونکا جب میری پوری طاقت ایک پیر میں سمٹ آئی، بریک لگنے کی چیخ ارد گرد پھیلے پہاڑوں میں مدغم ہو کر دم توڑ گئی۔ سڑک کے کنارے کھڑا عمر رسیدہ شخص مجھے روکنے کے بعد میرے قریب آیا۔ بڑی محبت سے مخاطب کیا۔ اس بزرگ کا لہجہ مقامی تھا۔ ”بیٹا معاف کرنا اس وقت مجھے تمہاری مدد کی سخت ضرورت ہے۔ میری بیٹی زچگی کے آخری مراحل میں مبتلا ہے اور ہسپتال جانے کے لئے کوئی سواری ہے نہیں، شاید چھٹی کی وجہ سے۔ آپ جو بھی معاوضہ چاہو میں دینے کے لئے تیار ہوں۔“ اس بزرگ نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے چند پل سوچا، پھر اس بزرگ سے زچہ کی بابت پوچھا تو اس نے سڑک سے چند قدم دور درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میری بیٹی وہاں موجود ہے۔ ٹھیک ہے بابا! آپ لے آئیں انہیں۔“ بابا جی شکریہ کہتے ہوئے درختوں کی طرف چلے گئے۔ چند پل کے انتظار کے بعد وہ دونوں آتے دکھائی دیئے۔ عورت چادر میں پوری طرح لپٹی ہوئی تھی اور صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ کرب انگیز صورت حال میں مبتلا ہے۔ میں نے پچھلا دروازہ کھول کر دونوں کو بحفاظت بیٹھایا اور واپس گاڑی شہر کی جانب موڑ دی۔ تمام راستہ وہ خاتون کراہتی رہی میں گاڑی بڑی احتیاط سے چلاتا ہوا انہیں ہسپتال لے آیا وہاں ایم ایس کو اپنا تعارف کروایا اور زچہ کی ہر ممکن مدد کرنے کی استدعا کی۔ پھر بابا جی سے اجازت لے کر واپس نزول گیسٹ ہاؤس آ گیا کیونکہ جو وقت میں نے چغتائی صاحب سے لیا تھا وہ کب کا گزر چکا تھا اس لئے پھر کسی روز پر ملاقات کا سوچ لیا۔

بابا جی کو آتے وقت میں نے کاغذ پر اپنا نام پتہ اور نمبر وغیرہ دیتے تاکید کی تھی کہ اگر میری ضرورت پڑے تو اپنا بیٹا جانتے رابطہ کر لیجئے گا۔ اور یوں میری چھٹی بابا جی اور ان کی بیٹی کی نذر ہو گئی۔

کوئی ایک ہفتہ بعد ہی بابا جی مجھے تلاش کرتے میرے اسمبلی والے آفس آ پہنچے۔ میں نے بڑی محبت سے ان کو بیٹھایا اور اپنے آفس بوائے کو کیفے ٹیریا جو

صرف سرکاری افسران وزراء اور ایسی ہی شخصیات کے لئے اسمبلی میں وقف ہوتا ہے، سے کھانے پینے کی اشیاء اور چائے وغیرہ منگوائی۔ لڑکے کے جانے کے بعد بابا جی مخاطب ہوئے۔ ”بیٹا مجھے اللہ تعالیٰ نے نواسہ اور نواسی عطا کی ہے، تمہاری بہن کی خواہش ہے کہ ان کی منائی جانے والی خوشی میں آپ نے ضرور شرکت کرنی ہے۔“ بابا جی کی پُرخلوص دعوت کو میں نے بغیر کسی تکرار کے یوں قبول کر لیا جیسے بابا جی سے میرا کوئی گہرا ناطہ اور رشتہ ہے۔ جاتے ہوئے بابا جی نے مجھے تاریخ اور جگہ بتائی کہ میں تمہارا اسی جگہ انتظار کروں گا جہاں ان کو گاڑی میں بیٹھایا تھا۔ ان کی تقریب میں تین دن کا وقفہ تھا اس لئے میں مطمئن ہو کر اپنے کاموں میں اُلجھ گیا۔ البتہ دونوں بچوں کے لئے ایک ایک گرم سوٹ اور بابا کی بیٹی کے لئے ایک جوڑا اور بابا جی کے لئے گرم مفلر خرید کر پیک کروایا لیا تاکہ میں خالی ہاتھ نہ جاؤں۔

مقررہ دن آفس سے چھٹی کر کے اپنے کمرے میں آیا اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد تیار ہو کر لائے ہوئے کپڑے وغیرہ گاڑی میں رکھے اور اس راستہ پر چل پڑا جو چغتائی صاحب کے قصبہ کی طرف جاتا تھا۔ گاڑی بل کھاتے راستوں کو پیچھے چھوڑتی آگے بڑھ رہی تھی۔ میری نظریں برابر آس پاس کا جائزہ لے رہی تھیں کیونکہ دوسری بار اس سڑک پر جا رہا تھا اس لئے راستہ شناسا نہ ہونے کی بنا پر میری رفتار اتنی زیادہ نہ تھی کہ میں بابا جی کو پیچھے چھوڑ جاتا پھر دور ہی سے مجھے سڑک کے کنارے دو تین لوگ دکھائی دیئے۔ قریب پہنچ کر میں بابا جی کو پہچان گیا میں نے گاڑی بند کی اور اُتر کر ان سے ملا، بابا جی نے ان دونوں سے میرا تعارف کروایا، بیٹا یہ میرا بیٹا محمد یوسف ہے اور یہ میرا داماد بخت آور۔ وہ دونوں بڑے تپاک سے ملے پھر ہم چاروں گاڑی میں آبیٹھے بابا جی آگے جبکہ وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ایک بار بھی میرے ذہن میں یہ بات نہ آئی کہ میں ان غیر شناسا لوگوں کے ساتھ بے دریغ، بے ڈریوں جا رہا ہوں جیسے میرا ان لوگوں سے کوئی خون کا رشتہ ناطہ ہو۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد بابا جی نے ہاتھ کے اشارے سے نیچے پہاڑوں کے درمیان کھلے میدان میں چھوٹے چھوٹے گھروں سے آراستہ آبادی کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ آبادی یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے قدرت نے زمین کے سینے پر سینکڑوں طلسماتی گنبد پھیلا دیئے ہوں، برف کی مانند سفید چمکتے گھروں کے باہر ادھر ادھر تھرکتے لوگ جن میں مرد عورتیں بچے ذرق برق لباس زیب تن کئے دکھائی دے رہے تھے۔ روایتی ڈھول ڈھمکے کی تال پر مدھر نسوانی آوازوں کا جادو ماحول کو خواب ناک بنا رہا تھا۔ گاڑی کو ایک سجے سجائے گھر کے آگے بابا جی نے ہاتھ کے اشارے سے روکنے کا کہا اور ہم سب گاڑی سے باہر آ گئے۔ بہت سے لوگ جن میں خواتین اور بچے بھی شامل تھے میرے استقبال کے لئے جمع ہو گئے۔ ایک سے ایک بڑھ کر حسین چہرے وہاں دکھائی دے رہے تھے۔ پہلی بار بابا جی کی بیٹی اپنے دونوں بچوں کو اٹھائے میرے قریب آئی میں نے پہلے اس کے سر پر شفقت سے پیار دیا پھر دونوں بچوں کو باری باری اٹھا کر پیار کیا۔ کافی صحت مند تھے دونوں بہن بھائی۔ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں مجھے شاید اس بات کا احساس ہی نہیں رہا تھا کہ یہ دونوں بچے مشکل سے دس روز کے بھی نہیں تھے مگر یوں دکھائی پڑے جیسے کئی کئی ماہ کے ہوں۔ پھر میں نے گاڑی سے بچوں کے کپڑے انکی ماں کا سوٹ اور بابا جی کا مفلر نکال کر دیا اور ان سب کی معاونت میں

چلتا ہوا، بڑے سے سجے سجائے پنڈال میں آن بیٹھا۔ خوشی کی تقریب جاری تھی۔ چاروں طرف خوشیاں رقص کر رہی تھیں ۔ طرح طرح کے کھانے تیار ہو رہے تھے ۔ لڑکیاں روایتی انداز میں بجائے جانے والے سازوں کی لے پر تھرکتی مچلتی رقص کر رہی تھیں ۔ ان کے رقص کا انداز ایسا تھا جیسے چینی جاپانی لڑکیاں جمناسٹک کا کرتب پیش کر رہی ہوں پورے جسم کو گھما کر پھیرا کر ایسے ایسے زاویے پیش کر رہی تھیں کہ آنکھوں کو یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

رات گئے تک کھانے پینے اور رقص و سرور کا ہلہ گلہ جاری رہا پھر آہستہ آہستہ بھیگتی رات کے ساتھ ساتھ اس محفل میں آہستگی آتی گئی۔ جب سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے تو میں نے بھی بابا جی سے اپنے سونے کی جگہ کا پوچھا۔ بابا جی مجھے ساتھ لے کر ایک چھوٹے سے گھر میں آگئے جہاں آرام دہ بستر اور ضروریات زندگی سے آراستہ ہر سہولت موجود تھی ۔ مشروبات کی لذت ۔کھانے کا ذائقہ چاروں جانب تھرکتے ہوئے جسموں کا جادو۔ پتہ نہیں میں کب تک خواب خرگوش کے مزے لوٹتا رہا۔ جس آواز پر میں ہڑبڑا کر اٹھا وہ کئی چھوٹے بڑے لڑکوں کی مشترکہ آواز تھی جو شکل سے بھیڑ بکریاں چرانے والے مقامی لگتے تھے۔ ان میں سے کچھ میری گاڑی کی چیکنگ میں جتے ہوئے تھے باقی میرے اردگرد حیرت سے کھڑے تک رہے تھے۔

اب میں پوری طرح بیدار ہو چکا تھا لیکن حیرانی کی بات یہ تھی کہ رات جہاں ایک بہت بڑی آباد کاری اور ہلہ گلہ تھا اب چاروں جانب چھوٹے بڑے ٹیلے اور چراگاہ نظر آرہی تھی اور ادھر ادھر چرتی بھیڑ بکریاں اور گائے بھینس دکھائی دے رہی تھیں ۔ میرا سر بھاری اور تمام رات زمین پر پڑے رہنے اور ٹھنڈ کے باعث پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا، میں گرتا پڑتا گاڑی تک آیا۔ بڑی مشکل سے اسے کانپتے ہاتھوں اور سہمے ہوئے ذہن سے سٹارٹ کیا۔ بچوں کو حیرت زدہ چھوڑ کر اوپر تک بڑی مشکل سے پہنچا۔ پورا جسم ڈر کے مارے کانپ رہا تھا، میں چاروں جانب خوفزدہ نظروں سے دیکھتا یوں بھاگا جا رہا تھا جیسے درخت پہاڑ اور اردگرد کے مناظر سب جن بھوت بنے مجھ پر قہقہے لگا رہے ہوں۔

گاڑی میں آگے بڑھتے شہر اور آبادی کے نشانات نے میرے احساسات کو سنبھال دیا اور میں نے ایک ہوٹل میں رُک کر منہ دھویا چائے پی اور خود کو سنبھالتا ہوا واپس نزول گیسٹ ہاؤس آکر اپنے بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ کئی روز تک میری حالت غیر رہی پھر آہستہ آہستہ میں زندگی کی گہما گہمی کی طرف واپس آگیا۔ کئی ایک لوگوں سے اس واقعہ کا ذکر کیا ہر کسی نے یہی کہا راہی صاحب آپ کسی اچھے ماہر نفسیات سے رابطہ کریں۔ میں ہر کسی کو پورے یقین سے یہ بتاتا کہ میں خود جن بابا اور اس کی بیٹی کو ہسپتال چھوڑ کر آیا تھا، میں نے خود جا کر ایم ایس سے ان کے بارے میں تصدیق بھی کی۔ واقعی اس خاتون کے ہاں بیٹے بیٹی کی نارمل پیدائش ہوئی تھی اور وہ زچہ اپنے بچوں سمیت ڈسچارج کی گئی تھی ۔ مگر میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں کہ اس روز بابا جی مجھے جس بستی میں لیکر گئے وہ اب کہاں ہے۔ اس مقام پر ہموار میدان اور ٹیلوں کے سوا کچھ نہیں، مقامی افراد کے مطابق وہاں کبھی کوئی آبادی تھی ہی نہیں۔ لیکن میں اس روز کے واقعات کو کیسے جھٹلا سکتا ہوں جنہیں میں نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ دیکھا تھا اور اس رات کی پوری تفصیل میرے ذہن پر نقش تھی۔ پھر بھی کوئی میری اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں۔ آپ کو کیا لگتا ہے؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صاحب جی

ڈاکٹر درخشاں انجم

اسے اپنے باپ کے کرتوتوں کا تو علم نہیں تھا۔ اس نے ساری عمر اپنے باپ کو اپنی ماں پر الزام تراشی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اب پتہ نہیں واپسی پر باپ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے، اس نے آس پاس پڑی ہوئی گولیاں اٹھا کر اکٹھی کئی گولیاں کھا کر اپنی زندگی خود ختم کر لی۔

ایک عورت کی کتھا، جس نے کسی کیلئے اپنا سب کچھ تیاگ دیا تھا

موسم گرما کی گرم ترین رات کا آخری پہر تھا۔ اماوس کی سیاہ رات کا آنچل اب تار تار ہوا ہی چاہتا تھا۔ ستاروں کی مدھم پڑتی لو صبح کی آمد کا اعلان کر رہی تھی۔ اس پہر ہوا میں ذرا جو خنکی آئی تو تمام ذی روح کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔

خورشید بھی ابھی ذرا دیر کو نیند کی آغوش میں گئی ہوں گی کہ فون کی پہلی بیل نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ دل بڑی تیزی سے پہلو میں دھڑک اٹھا۔ شاید وہ انہونی ہو ہی گئی تھی جس نے کئی روز سے انہیں جگا رکھا تھا۔ اعصاب چٹخے جا رہے تھے۔

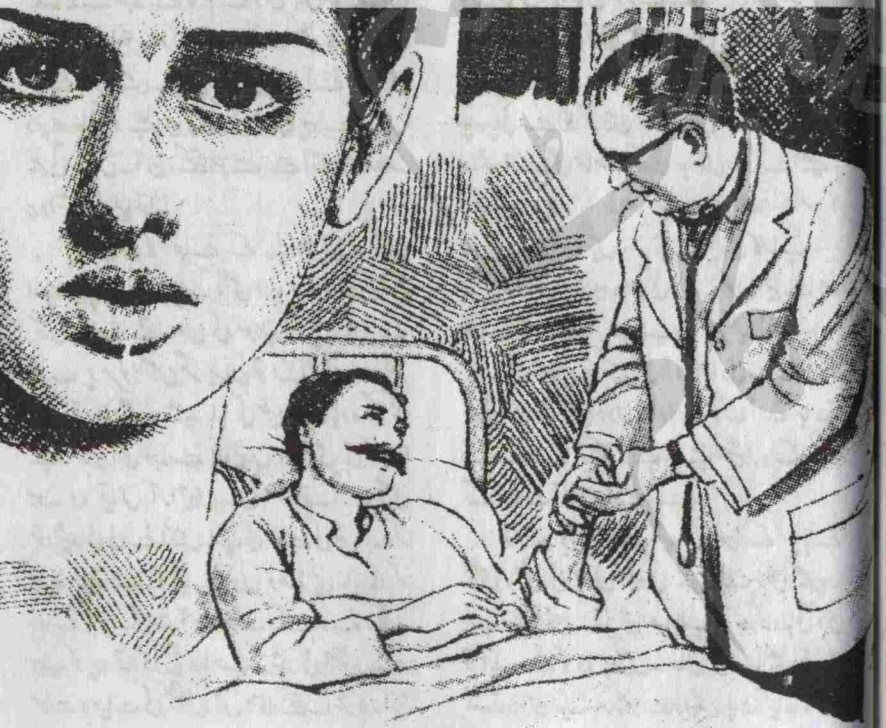

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سرہانے پڑا ہوا ریسیور اٹھا کر کانوں سے لگایا ہی تھا کہ اسد کی بھرائی ہوئی آواز نے انکے خیالات کی تصدیق کردی۔

''امی.....امی جی.....'' دوسری طرف بالکل خاموشی تھی۔ وہ بھی پریشان سا ہوگیا۔ ''جی..... بیٹا'' اسد کے دوسری بار ہیلو کرنے پر انہوں نے تھوک نگلتے ہوئے بمشکل کہا تو جیسے اس کی جان میں جان آئی۔ ''پاپا..... امی جی!..... ہمیں چھوڑ گئے۔'' ''اِنَّا لِلّٰہ.....'' بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔

''آپ فائزہ اور سارہ کو اُٹھا دیں۔ ہم کچھ ضروری کارروائی کے بعد انہیں لے کر آ رہے ہیں۔'' اسد کو بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ امی جی اب تک بڑے ضبط سے کام لے رہی تھیں حالانکہ ان کا دل تو بڑا ہی نازک تھا۔ ذرا ذرا سی بات کو دل پر لے بیٹھتی تھیں۔ بچوں کو سکول سے آنے میں کبھی دیر ہو جاتی تو جلے پیر کی بلی کی طرح پورے گھر میں پھرتی رہتیں۔ آج کتنے حوصلے سے اتنا بڑا صدمہ برداشت کرلیا تھا۔

وہ بیٹیوں کو اٹھانے کے لیے مڑیں تو انہیں اپنے پیچھے ہی کھڑا پایا۔ ابھی ان پر حالات واضح نہیں ہوئے تھے۔ ان کی سوالیہ نظریں ماں کے چہرے پر مرکوز تھیں مگر یہاں تو ایسی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید بابا کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی ہے۔ شاید اسی وجہ سے بھائیوں نے امی جی کو بلایا ہو۔ وہ قیاس آرائیوں میں مصروف تھیں جبھی خورشید بی بی نے انہیں باپ کی موت کی خبر دے کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ دونوں دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ آہستہ آہستہ لوگ اکٹھے ہونے لگے۔ سب کو پتہ تھا کہ شیخ صاحب گزشتہ کئی ہفتوں سے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ آخر کار آج جان کی بازی ہار ہی گئے۔ مرد حضرات نے باہر کے کاموں کی ذمہ داری سنبھالی۔ کچھ عورتیں بڑی بیٹھک میں چٹائیاں دریاں بچھا کر بیٹھ گئیں جہاں میت رکھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ کچھ عورتیں خورشید بی بی کے لئے جگہ بنا کر وہیں لے کر بیٹھ گئیں۔ تب ہی ایمبولینس پہ ان کی میت آ گئی۔ عورتیں چیخیں مار کر خورشید بی بی سے گلے لگیں مگر وہ تو بالکل خاموش تھیں۔ رو رہی تھیں نہ کچھ بول رہی تھیں۔ بس چپ چاپ آنے جانے والوں کا منہ دیکھ رہی تھیں۔

''ہائے ہائے اسے کیا ہو گیا ہے؟'' کچھ عورتیں ان کی طرف لپکیں۔ ''اسے رُلایا جائے'' ..... ''شاید..... سکتہ طاری ہو گیا ہے۔'' لوگ قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔

شیخ صاحب کو بیچ میں چارپائی پر ڈال دیا گیا۔ تب خالہ کلثوم نے اسے پکڑ کر شیخ صاحب کی چارپائی سے لگا کر بین کرنا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ اسے بھی مخاطب کرتی جاتیں۔ ''اے جھلیے! دیکھ..... دیکھ..... یہ مر گیا..... تیرے..... سر کا تاج..... تیرا سائیں..... تیرے بچوں کا باپ..... مر گیا..... تو..... بیوہ ہو گئی۔ اب کون تیرے ناز اٹھائے گا..... تیرا ''صاحب جی'' مر گیا۔''

مگر ان پر تو کسی بھی آہ و زاری، سینہ کوبی کا کوئی بھی اثر نہیں ہوا۔ سارا دن لوگ آتے جاتے رہے۔ روتے سسکتے رہے۔ بیٹے بیٹیوں کے گلے لگ کر لوگ آنسو بہاتے رہے۔

خورشید بی بی عرف شیداں ان کے سرہانے بیٹھی ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھیں۔ جب خالہ کلثوم نے ''تیرا صاحب'' کہہ کر دہائی دی تو ایک لمحے کو وہ چونکیں۔ حال کی دنیا میں آتے آتے ذہن ایک بار پھر سے واپس پلٹ گیا۔ پھر وہ

تھیں اور ان کا ماضی۔

ایک بڑی سی حویلی، نہایت شفیق باپ، ماما لٹاتی ماں، جان چھڑکتے تین بھائی۔ وہ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں۔ وہ سب مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ ان کے والد مظفر حسین، چار بھائی، دو بہنیں تھیں۔ دو چاچا اور ایک بہنوئی دوران ہجرت ہی سکھوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ دو بھائی اور دو بہنیں جان بچا کر پاکستان آنے میں کامیاب ہوئے۔ دیگر عزیز رشتہ دار ادھر ہی رہ گئے تھے۔ انہوں نے ان لوگوں کو یہاں آنے سے روکا بھی تھا لیکن مظفر حسین کو پاکستان کی سرزمین سے اتنا عشق تھا کہ انہوں نے کسی کی بات پر توجہ نہ دی اور اپنی پوری جائیداد اپنے ننھیال والوں کے حوالے کر کے خالی خولی یہاں چلے آئے۔ بہت دن تک کافی تکلیفیں اٹھائیں۔ بعد میں سرکار کی طرف سے سر چھپانے کے لئے کچھ جگہ مل گئی۔ باقی دونوں بھائیوں نے سب کچھ اپنی کمائی سے بنایا۔ انکا خاندان تقسیم سے قبل ہی ایکسپورٹ امپورٹ کا کام کیا کرتا تھا۔ یہاں بھی دونوں بھائیوں نے مل کر اپنی ساکھ بنا لی۔ ابا اکثر اپنے لنگوٹیے یار میدے (حمید) چاچا کو یاد کرتے تھے جو ہجرت میں ان کے ہمسفر رہے تھے مگر پاکستان آ کر انہیں کبھی نہیں ملے۔ سارے کیمپ، فلاحی ادارے، ہسپتال، سب جگہیں چھان لیں مگر انہیں ملنا تھا نہ ملے۔

خزاں کی آمد آمد تھی۔ سرسبز پیڑ پودوں میں زردیاں سی گھلنے لگی تھیں۔ ہوا کی خنکی میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ پرندوں کے گیتوں میں شوخیاں نہیں رہی تھیں بلکہ آنے والے اُداس موسموں کا ایک انجانا سا خوف تھا۔

اس حویلی کے مکینوں نے ابھی تک اپنے آپ کو موسموں کے مطابق نہیں ڈھالا تھا۔ اب بھی شام ڈھلے سب بڑے سے لان میں سنگی بنچوں پر آ بیٹھتے۔ شام کی چائے یہیں پی جاتی تھی۔ کبھی پاس پڑوس والے بھی آ بیٹھتے پھر مہمان تو اکثر لگے ہی رہتے تھے۔ لان کا یہ حصہ قدرتی خوبصورتیوں سے مالا مال تھا۔ ایک طرف ڈھیر سارے درختوں کے جھنڈ تھے۔ دوسری طرف رنگ برنگے پھولوں کے نایاب پودے ایک بڑا سا فوارہ تھا۔

گھریلو معاملات سے کسی تعلیمی، سیاسی گفتگو کا آغاز یہیں سے ہوتا تھا۔ بحث مباحثے بھی یہیں شروع ہوتے اور یہیں ختم ہوتے۔ شیداں کو یہ موسم ذرا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ دھول اُڑاتی ہوائیں، اُداسی سمیٹے ہوئے شامیں مگر چھوٹی چاچی کو یہ موسم بڑا اچھا لگتا تھا۔ بقول ان کے اس موسم کا بھی اپنا ایک حسن ہوتا ہے۔ پیروں کے نیچے آ کر ڈھیروں ڈھیر چرچراتے پتے، بے رنگ سے شب و روز تمام ذی روح کو ایک دن فنا ہو جانے کا احساس دلاتے ہیں۔ ہر موسم اسی قادر مطلق کا بنایا ہوا ہے، جب ہم بہار کے موسم میں ڈھیروں ڈھیر خوشیاں سمیٹتے ہیں تو خزاں کا یہ اُداس موسم بھی ہنس کھیل کر معمول کے مطابق گزارنا چاہیے، جبھی وہ ہمیشہ ہر موسم کا کچھ وقت ادھر ہی گزارتیں خواہ گرمیوں کی جھلستی ہوئی شامیں ہوں یا یخ بستہ سردیوں کا موسم۔

چائے پیالیوں میں انڈیلی جا چکی تھی۔ گفتگو کا آغاز ہوا ہی چاہتا تھا جب ہی مظفر حسین کسی کے ساتھ آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ''رشیدہ! دیکھ تو کون آیا ہے'' خوشی ان کے لہجے سے پھوٹ رہی تھی۔ سب حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے مگر چہرے پر شناسائی کی کوئی جھلک نہ پا کر وہ سب تذبذب میں پڑ گئے۔ ''ارے..... یہ اپنے.....

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے..... وہ میدے کا بیٹا ہے۔'' مظفر حسین نے خود ہی ان کی مشکل آسان کر دی۔ شاید اس وقت یہ بہت چھوٹا تھا۔ ''حمید بھائی کہاں ہیں؟'' اماں نے ان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تو ابا کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ ''وہ ہم میں نہیں رہا، سکھوں کے ہاتھوں مارا گیا۔'' یہ سن کر سب کو بہت افسوس ہوا کافی دیر تک خاموش رہنے کے بعد آہستہ آہستہ سب کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ نام، پتہ، تعلیم اور نہ جانے کیا کیا کچھ پوچھا جانے لگا۔

وہ اوکاڑہ کی ایک نواحی بستی میں رہتے تھے اور اپنی والدہ کے کہنے پر انہیں کئی مرتبہ یہاں بھی ڈھونڈنے آ چکے تھے۔ پتہ نہیں ان کی باتوں میں کہاں تک سچائی تھی۔ ابھی بھی وہ مظفر حسین کے کسی جاننے والے کے ساتھ پھرتے پائے گئے تھے۔ ان سے علیک سلیک کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ وہ شیخ حمید کے بیٹے ہیں۔

شکل تو اللہ کی بنائی ہوئی تھی لیکن خوش گفتاری اور خوش لباسی نے انہیں نمایاں کر رکھا تھا۔ گفتگو طویل ہوئی۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ ابھی انہوں نے شادی نہیں کی۔ والدہ کی بیماری اور دو بہنوں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے تھے۔ دوران گفتگو سب ہی نے محسوس کیا کہ وہ جتنا مہذب بننے کی کوشش کر رہے ہیں شاید حقیقت میں ویسے نہیں تھے۔ لاکھوں کروڑوں پر تان آ کر ٹوٹتی تھی ان کی۔ پتہ نہیں وہ ان لوگوں پر اپنا رُعب جمانا چاہتے تھے یا رشیدہ بی بی کے ساتھ بیٹھی جماعتی لیتی شیداں بی بی کو مرعوب کرنا مقصود تھا۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے ان کی طرف ریشمی ڈور پھینکنا شروع کر دی تھی جو شروع سے ہی ان کی باتوں میں کافی دلچسپی لے رہی تھیں۔ ویسے بھی شیداں بی بی کو ان کی طرح صاف گو اور کھلے ذہن کے لوگ پسند تھے۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ امین حمید جو شیخ امین بھی کہلاتے تھے، ان کی آمد مظفر ہاؤس میں بڑھتی گئی۔ کبھی اکیلے کبھی والدہ کے ساتھ کبھی کسی جاننے والے کے ساتھ اور خورشید بیگم کی آنکھوں کی چمک میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ چہرے پر گلاب بکھرنے لگے۔ پہلے ہی کیا کم تھیں حسن و جمال میں کہ ان کی محبت نے اس خوبصورتی میں اور بھی چار چاند لگا دیئے۔

جب مظفر حسین کو اپنے چہیتے دوست کے پوت کے کرتوتوں کا علم ہوا تو بہت پچھتائے۔ انہیں اس طرح بلاتکلف آنے جانے کی اجازت ہی نہیں دینی چاہیے تھی۔ ادھر بیٹی کی بھی اچھی خاصی خبر لی جو پل کی پل میں ان کی محبت میں گوڈوں گوڈوں ڈوب گئی تھی۔ امین کو بھی رشتے کی نزاکت کا احساس دلایا کہ شیداں ان کے بھانجے رفیق کی منگ ہے جو ان دنوں تعلیم کے سلسلے میں باہر مقیم تھا۔ انہیں اپنی بہن کی پریشانی کا غم تھا۔ ابھی وہ اسی مسئلے میں الجھے ہوئے تھے کہ ایک دن عصمت بی بی اپنے بیٹے امین کے لئے خورشید کو مانگنے آ پہنچیں۔

''دیکھیں بھابی جی! خورشید بچپن سے میرے بھانجے سے منسوب ہے۔ ہم اسے کسی اور سے بیاہنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔'' ان کے سرد لہجے نے عصمت بی بی کو ایک لمحے کے لئے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ''وہ بچپن کی بات تھی بھائی صاحب! اب تو زمانہ کافی بدل گیا ہے۔'' کافی دیر کی خاموشی کے بعد وہ گویا ہوئیں ''پھر یہ بچوں کی پسند کا معاملہ بھی تو ہے۔''

''زمانہ بدل گیا ہے لیکن ہم اور ہماری اقدار نہیں بدلے۔ ہم خاندانی لوگ ہیں۔'' اس بار ان

کے لہجے میں بہت تمکنت تھی۔

''ہم یہ کب کہہ رہے ہیں کہ آپ خاندانی نہیں۔ حمید بھی آپ کے قریبی دوست ہی تھے اور یہ..... امین'' ..... ''بس بھابی جی بس.....'' انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر انہیں مزید کچھ بولنے سے روک دیا۔ ''میں حمید کو جانتا ہوں آپ کو نہیں..... امین آپ کے دوسرے شوہر سے ہے، حمید کا بیٹا نہیں۔ آپ نے یہاں آ کر دوسری شادی کر لی تھی لیکن وہ آپ کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ میں نے پوری تحقیق کی ہے۔''

''دیکھیں بھائی! آپ حد سے گزر رہے ہیں۔'' اپنی بے عزتی پر وہ تلملا اُٹھیں۔ ''حقیقت بہت تلخ ہوتی ہے بی بی۔ آپ جائیں ورنہ مزید سچ آپ نہیں سن سکیں گی۔'' مظفر حسین بھی جلال میں آ گئے تھے۔ وہ بڑبڑاتی نکل گئیں کہ کہیں کوئی اور حقیقت نہ کھل جائے۔

ادھر اپنے کمرے میں بیٹھی خورشید بی بی رنگ برنگے خوابوں کے جال بن رہی تھیں۔ کچھ دن سے ان کے مہمان خانے میں آنے پر پابندی لگ گئی تھی۔ ان دونوں ماں بیٹوں کے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک اپنے والدین کے چہرے پر کچھ تلاش کرتی رہیں مگر وہاں تو سوائے چٹانوں کی سی سختی کے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید..... بات نہیں بنی۔ اماں سے پوچھا تو انہوں نے سختی سے ناں کہہ دیا ''وہ ہمارے قابل نہیں تھے۔'' اور خورشید بی بی کے دل کے آنگن میں جیسے اچانک ہی خزاں کا موسم آ گیا ہو۔ ادھر مظفر حسین نے بھانجے کو جلد از جلد آنے کی تاکید کر کے بہن کو نکاح کی تیاری کا حکم دے دیا۔ خورشید بی بی کی خاموشی تو اس دن رنگ لائی جب انہوں نے سب کے سامنے رفیق کے ساتھ نکاح سے انکار کر دیا۔

مظفر حسین دل تھام کر وہیں بیٹھ گئے۔ رشیدہ بیگم کے کاٹو تو لہو نہیں۔ بھائی آنکھوں میں اس کے لئے نفرتیں سمیٹے باپ کو سنبھالنے میں لگ گئے۔ نکاح خواں و دیگر افراد ایسی نافرمان اولاد کو لعنت و ملامت کرتے چلے گئے۔

مظفر حسین کو زبردست قسم کا دورہ پڑا تھا۔ کیا پتہ تھا نازوں کی پالی یہ بیٹی یوں ان کی عزت سربازار نیلام کر جائے گی۔ جلدی سے انہیں ہسپتال لے جایا گیا۔ وہ بھی بھائیوں کے پیچھے لپکیں مگر انہوں نے غصے میں اس زور کا جھٹکا دیا کہ دُور جا گریں۔

دو دن تک آئی سی یو میں رہنے کے بعد جب انہیں ہوش آیا اور طبیعت کچھ بہتر ہوئی تب انہوں نے امین کو اور انکی والدہ کو بلوا بھیجا۔ شیداں بی بی تو وہیں موجود تھیں۔ ڈاکٹروں کو کہہ سُن کر نکاح خواں کو بلوا بھیجا۔ جیسے ہی وہ سب پہنچے انہوں نے مولوی صاحب کو نکاح پڑھانے کا کہا۔ سب ایک دم سے سٹپٹائے شاید اس اچانک صورتحال کے لیے تیار نہیں تھے۔ امین نے کچھ کہنا چاہا مگر ان کے بھائیوں کے خطرناک تیور دیکھ کر ہمت نہ ہوئی۔ نکاح ہو گیا۔

یہ سب کچھ اتنی جلدی میں ہوا کہ کسی کو کچھ اور سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ رشیدہ بی بی الگ حواس باختہ تھیں۔

باپ کے اشارے پر دونوں بھائیوں نے انہیں یوں ہی خالی خولی رخصت کر دیا اور ہمیشہ کے لیے ان پر حویلی کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ بیٹی کو رخصت کر کے اسی رات مظفر حسین بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

خورشید بی بی محبت کے نام پر سب کچھ چھوڑ کر امین کے سنگ چلی تو آئیں مگر یہاں انکی سواگت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ عصمت بی بی علیحدہ انہیں خونخوار نظروں سے گھور رہی تھیں۔ امین صاحب کا الگ موڈ بگڑا ہوا تھا۔ دو نندیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ جیٹھ صاحب امین صاحب کو اس اچانک افتاد پر برا بھلا کہہ رہے تھے۔ ڈربے نما کمرے کے چھوٹے سے صحن میں وہ کتنی ہی دیر کھڑی رہیں۔ کسی نے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔ وہ کچے صحن میں خود ہی نیچے بیٹھ گئیں۔ تب امین کو خیال آیا اور اسے لئے ہوئے سامنے والے کمرے میں لے آئے جہاں ایک بان کی چارپائی کے علاوہ دو بہت پرانی اور بھدی کرسیاں پڑی تھیں۔ اسے چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ خود سامنے کرسی پر بیٹھ گئے۔ ماتھے پر ان گنت شکنوں کا جال لئے کتنی ہی دیر اسی طرح بیٹھے رہے۔ شاید بولنے کو الفاظ ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ منتظر رہیں۔

''یہ اچھا نہیں ہوا خورشید! یہ بھی بھلا کوئی تک ہے، چاچا نے زبردستی بلوا کر آناً فاناً نکاح پڑھوا دیا۔ نہ کچھ سوچنے کا موقع دیا نہ سمجھنے کا..... اس طرح ہوتی ہیں شادیاں؟..... کیا کہا تھا تم نے ان سے؟.....'' وہ اسے ہی موردِ الزام ٹھہرا رہے تھے اور وہ ڈوبتے دل کے ساتھ محبت کا یہ رُخ دیکھ رہی تھیں جس نے سنگ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں اور کہا تھا کہ وہ اگر کسی اور کی ہوگئی تو وہ زندہ نہیں رہ سکیں گے۔..... لیکن یہ..... یہ کیا وہ تو زندہ تھے۔ اسی طرح۔ مر تو وہ رہی تھیں محبت کا یہ رُخ دیکھ کر۔ باہر صحن میں ساس سینے پر دوہتڑیں مار رہی تھی۔ ''ہائے میرا بچہ..... لٹ گیا برباد ہو گیا۔ خالی خولی بیٹی..... نہ جانے کیا لچھن تھے..... میرے بیٹے کو تھما دیا۔

''امین..... آپ نے خود ہی کہا تھا..... کچھ بھی ہو..... تم انکار کر دینا..... پھر..... پھر میں سنبھال لوں گا۔'' شدتِ غم سے ان کی آواز گھٹ گھٹ کر نکل رہی تھی۔ دھواں دھواں چہرے کے ساتھ وہ انہیں انکے سامنے انکے ہی وعدے قسمیں یاد دلا رہی تھیں۔

''میں نے اتنی جلدی کرنے کو تو نہیں کہا تھا۔ چاچا چاچی کو اعتماد میں لے کر تمہیں اطمینان سے یہ بات کرنی چاہیے تھی۔'' اسے روتے دیکھ کر امین نے پینترا بدلا۔ ''چلو اب جو ہونا تھا ہو چکا یہ رونا دھونا بند کرو۔ بس اماں کے دل میں گھر کرنے کی کوشش کرو اور جو کہوں وہ کرو۔'' اور وہ رات جو آرزوؤں اور اُمنگوں کی ہوتی ہے وہ رات یونہی بے کیف سی گزر گئی۔ صرف امین کے لیکچر سنتے ہوئے کہ کس سے ملنا ہے، کس سے نہیں ملنا ہے، بھائی بہنوں کی خدمت کرنی ہے، اماں کو خوش رکھنا ہے۔ وہ انہیں اپنے والدین کی نافرمانی کی سزا سمجھ کر جی صاحب جی کہہ کر ان کی ہر بات پر طنزیہ سر ہلاتی رہیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ضرور اس بات پر ٹوکیں گے کہ صاحب جی نہیں امین کہو مگر وہ تو واقعی صاحب جی ہی کا کردار ادا کر رہے تھے۔ نہ کوئی تسلی نہ بھروسہ نہ خوشی کے دو بول۔ وہ تو بس کنیز ہی بنی رہیں۔

کتنے موسم بیتے مگر وہ شیخ امین پر اپنا اعتماد بحال نہ کر سکیں۔ وہی طعنے وہی مشکوک نگاہیں حالانکہ کبھی بھی وہ اس کال کوٹھری سے باہر نہیں نکلیں۔ کہیں آنا جانا نہیں کیا۔ نہ گھر پر ہی کوئی آتا۔ پتہ نہیں محلے دار عزیز رشتہ دار کوئی کیوں نہیں آتا تھا انکے یہاں۔ آہستہ آہستہ یہ راز بھی کھلتا گیا کہ یہ مشکوک لوگ تھے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے پھرتے پھراتے کچھ عرصے سے ادھر آ بسے تھے۔

قدرت نے ان کی جھولی میں چار پھول ڈالے۔ دو بیٹے دو بیٹیاں..... صبح سویرے جو وہ

اٹھتیں، صفائی ستھرائی، کھانے پکانے سے لے کر بکریوں، مرغیوں کے کام بھی ان کے ذمے لگا دیئے گئے۔ رات گئے تک بھی کام پورا نہ ہوتا۔ سال میں دو جوڑے اور دو وقت کی روٹیاں دے کر شیخ امین اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو جاتے۔ کبھی انہیں یہ بھی خیال نہیں آیا کہ یہ بھی گوشت پوست کا انسان ہے۔ بیمار ہو تو دوائی علاج بھی چاہیے انہیں۔ کبھی ست ہی ہو بیٹھتیں تو کاہلی کا طعنہ ملتا۔ کبھی دو پل آرام کے نصیب نہ ہوئے انہیں۔ سخت محنت، متوازن خوراک کی کمی اور سب سے بڑھ کر محبت کی کمی نے انہیں ایک کرخت سی دیہاتن عورت بنا دیا تھا۔ حوادثِ زمانہ کے تھپڑوں نے سارے رنگ و روپ چھین لئے۔ کچھ بھی تو نہیں بچا تھا اب ان کے پاس۔ نہ خوش مزاجی نہ خوش لباسی۔

بیٹیاں بڑی ہونے لگیں تو امین کے ماتھے کی سلوٹوں میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے بس یہی سننے کو ملتا..... ''دیکھنا بیٹیوں کا خیال رکھنا کہیں تمہاری ہی طرح نہ نکلیں۔'' تیزے کی نوک کی طرح زہر میں بجھے ہوئے جملے ان کے وجود کو چھلنی کرنے لگتے تو وہ آسمان کی طرف سر اٹھا کر خدا سے پوچھتیں کہ اور کتنی سزا انہیں کاٹنی ہے۔ راتوں کو اکثر اُٹھ اُٹھ کر تصور میں اپنے باپ کی قبر پر جا کر معافی مانگتیں۔ ہچکیاں لے لے کر رو پڑتیں۔ بچوں نے کتنی دفعہ باپ کو راتوں کو ماں کے رونے کے متعلق بتایا تھا۔ باپ کہتا ''تیری ماں بہت بڑی ڈرامے باز ہے۔ تم لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹنے کو ڈرامے بازیاں کرتی ہے۔ اس کے فریب میں مت آنا۔'' وہ بچوں کے نازک ذہنوں میں بھی نفرتیں بھرنے سے باز نہ آتے۔

ایک خاندان کی کسی تقریب میں خالہ کلثوم نے انہیں دیکھ لیا۔ ویسے بھی وہ بہت کم ہی ایسی محفلوں میں آیا جایا کرتی تھیں۔ جہاں بہت ضروری ہوتا وہیں امین اسے ساتھ لے جاتے تھے۔ پہلے پہل تو وہ اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرتی رہیں مگر خالہ بھی اپنے نام کی پکی تھیں۔ موقع پا کر ان کے سامنے ہی آ کھڑی ہوئیں۔ ''خورشید..... کیا بات ہے.....؟ ..... چھپ کیوں رہی ہو مجھ سے پتر؟'' اس کی چوری پکڑی گئی تھی۔ اب تو جواب دینا ہی تھا ''جی خالہ جی! میں ٹھیک ٹھاک اپنی سنائیں آپ۔'' اس وقت ان کی گھبراہٹ دیدنی تھی۔ اپنا بھرم کھلتے ہوئے کتنا عجیب سا لگ رہا تھا۔ انہوں نے اسکے بھدے سے سوٹ زیورات کے نام پر دو آرٹیفیشل چوڑیوں اور بندوں پر نظر ڈالتے ہوئے انکی طرف نگاہ کی..... ''ہاں پتر میں تو ٹھیک ہوں..... پر.....'' ''پر کیا خالہ جی؟.....'' انہوں نے گھبرا کر ان کے جھریوں بھرے چہرے کو دیکھا۔ وہ جلد سے جلد اپنے گھر والوں کی خیریت جاننا چاہ رہی تھیں..... کہیں..... شاید..... اماں..... یا بھائی..... پتہ نہیں۔ پل کے پل میں کیسے کیسے خیالات آنے لگے۔

''پر مجھے..... تُو..... ٹھیک نہیں لگتی دھیئے۔'' انہوں نے اس کے سراپے کو ایک نظر دیکھتے ہوئے لفظ تُو پر زور دیتے ہوئے اسے جلد ہی پریشانیوں سے نکال دیا۔ تب اطمینان کی سانس اس کے سینے سے خارج ہوئی۔ گو کہ اس نے اپنی طرف سے خالہ کلثوم کو بہت اطمینان دلایا تھا مگر انہوں نے بھی تو اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کئے تھے۔ خورشید بی بی جتنا اپنے آپ کو چھپا رہی تھیں اس سے زیادہ کہیں ان کا چہرہ ان کے جھوٹ کی گواہی دے رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں ان کے حلیے نے ایک زمانے کی خبر دے دی تھی۔ جیسے ہی وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہٹیں کسی جاسوس کی طرح شیخ امین ان کے سر پر آ ٹپکے اور کہنے لگے ''کہاں تھیں تم؟ میں کتنی دیر سے تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔'' پھر جاتے ہوئے خالہ کلثوم پر ان کی نظر پڑی تو چہرے کا زاویہ اور بھی بدل گیا۔ ''اچھا تو یہ تمہیں مل گئی تھیں۔ کیا کیا پٹیاں پڑھائیں اس نے تمہیں؟ اپنے بھانجے رفیق کا بھی ذکر کیا ہوگا۔'' وہ آپ ہی آپ قیاس آرائیاں کرتے رہے اور وہ فق ہوتے چہرے کے ساتھ خالہ کو جاتے دیکھتی رہیں۔ شکر ہے کہ وہ کافی آگے نکل گئی تھیں۔ سنا کچھ نہیں تھا۔ خالہ کلثوم سے ملاقات جہاں اس کی بے کیف زندگی میں بہار کا جھونکا ثابت ہوئی وہیں امین کے دل میں پھانس سی چبھ گئی۔ شکی مزاج تو پہلے ہی تھے۔ بار بار خورشید کے چہرے پر ان کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے لگے مگر وہاں تو حسرتوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

وہ ایک خوشگوار شام تھی۔ بچے اپنا ہوم ورک کرنے میں مصروف تھے۔ وہ ابھی ڈھیر سارے برتن مانجھ کر اٹھی تھیں۔ اب ہاتھوں اور ناخنوں کے کناروں پر بیٹھی ہوئی کالک صاف کرنے کے لئے بچوں کا یونیفارم لے کر دھونے بیٹھی تھیں۔ پہلے پہل تو یہ ان کے لئے بڑا صبر آزما مرحلہ ہوتا تھا۔ لکڑیاں جھونک جھونک کر پکانا، پھونکیں مار مار کر آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔ پھر کالی کالی دیگچیوں، توے اور کڑاہیوں کو مانجھنا، پھر ان پر مٹی کا لیپ چڑھانا۔ اب تو اس روٹین کی عادی ہو گئی تھیں۔ اپنی شاہانہ زندگی کو تو وہ خود محبت کے دھوکے میں پاؤں تلے روند آئی تھیں۔ کسی سے کیا کہتیں۔ وہ ہنستا کھیلتا ماضی تو کب کا ریگ زار بن چکا تھا۔ دروازے پر دستک کی آواز سن کر بچے دوڑے۔ یہ انہیں کا کام ہوتا تھا۔ وہ یہی سوچ کر اپنے کام میں مگن رہیں کہ شاید کوئی اڑوس پڑوس والے بچوں کے دوست ہوں گے۔ تب ہی ڈیوڑھی میں بہت سی آوازیں اُبھریں۔ کوئی بچوں سے ان کے نام پوچھ رہا تھا تو کوئی ان کے والد کا نام لے رہا تھا۔ آج کل حالات صحیح نہیں تھے۔ وہ گھبرا کر پیڑھی سے اُٹھیں مگر آنے والوں کو دیکھ کر ساکت رہ گئیں۔ وہ سب بھی تو انہیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ماں جی جو..... ان کی حالت زار کو دیکھ کر ایک لمحے کو گنگ سی ہو گئی تھیں یکلخت آگے بڑھیں اور سینے سے لگا لیا اور خورشید بی بی کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ اتنا روئیں اتنا روئیں کہ چپ کرانا مشکل ہو گیا۔ وہ ان کے قدموں سے لپٹ لپٹ کر معافیاں مانگتی رہیں۔ ''اماں مجھے معاف کر دو، مجھے ابا کی اور آپ کی بددعائیں لگ گئی ہیں، بھائی مجھے معاف کر دو..... مجھے سب کی آہ لگی ہے۔ آپ سب کی۔ سب کا دل دکھایا تھا نا اس لئے..... دیکھ لو مجھے کیسی سزا ملی ہے۔''

''ماں باپ اولاد کو بددعائیں کب دیتے ہیں!'' ماں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ''مگر..... ماں جی! والدین کی نافرمانی کی سزا خدا ضرور دیتا ہے۔'' وہ روتے ہوئے بولیں ''میں ابا سے کیسے معافی مانگوں..... اماں مجھے بتا دیں..... بتا دیں ورنہ میں یونہی نجانے کب تک اپنی خطاؤں کی صلیب پر لٹکی رہوں گی۔'' رو رو کر وہ بے حال تھیں۔ ''نہ رو میری دھی! نہ رو۔ تو ان کے لئے دعائیں کیا کر۔ قرآن پاک پڑھا کر۔ غریبوں کو کھانا کھلایا کر اور ان کے لئے کیا بھی کیا جا سکتا ہے!'' انہوں نے اپنی دانست میں صحیح مشورہ دیا تھا۔ ''دعائیں تو کرتی ہوں، قرآن پاک بھی پڑھتی ہوں، ان کے نام سے ختم بھی دیتی ہوں..... پر..... کھانا.....'' وہ کہتے کہتے رُک گئیں یا اپنا آپ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس سے زیادہ گرانا اچھا نہیں لگا۔ بچے بھی حیرت سے انہیں دیکھے جا رہے تھے۔

''ارے بھئی بچوں کی چیزیں وغیرہ لاؤ۔'' بھائی بھاوج نے موضوع بدلا۔ وہ دونوں گاڑی سے بہت سارا سامان اُٹھا لائے۔ وہ حیرت زدہ سی دیکھتی رہی۔ بچوں کے کپڑے، کھلونے، ان کے اور امین کے ڈھیروں سوٹ۔

''ابھی اور ڈھیر ساری چیزیں رہتی ہیں۔ تیرا سارا جہیز کا سامان، زیورات..... مجھے کلثوم نے جب سے تیرے بارے میں بتایا تھا تب ہی بے قراری لگ گئی تھی۔ تجھے مکان بھی تو لے کر دینا ہے ورنہ اتنا سارا سامان کدھر رکھا جائے گا!''

رشیدہ بی بی اپنی رو میں بولتی جا رہی تھیں اور انہیں محسوس ہوا جیسے ان کے گناہوں میں تخفیف ہو رہی ہو اور ان کی ذلت کی اس زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہو۔

وہ ان کی زندگی کی پہلی خوشیوں بھری شام تھی۔ امین بہت خوش تھے۔ بچے ڈھیر ساری چیزیں پا کر اٹھلائے پھر رہے تھے پر کیا دولت میں اتنی کشش ہوتی ہے؟ کیا اسے انہیں مادی چیزوں کی خاطر اتنا عرصہ ''رولا'' گیا تھا؟ ان پر جھوٹے شک و شبے کر کے خوشیوں کے سارے دروازے بند کر دیئے گئے تھے! وہ کافی دیر تک سوچتی رہیں۔

ان کے حصے کی جائیداد کی رقم سے تینوں بھائیوں نے مل کر انہیں امین کی پسند سے ایک اچھا سا مکان اسی علاقے میں لے دیا اور سامان سے بھر دیا۔ شیخ امین کا نام جواب تک اسناد اور فائلوں وغیرہ میں محفوظ تھا اب باہر آ گیا تھا۔ اب وہ شیخ صاحب کہلانے لگے۔ امین کا لفظ بھی اب کم ہی استعمال ہونے لگا۔ خورشید بی بی بھی اب خورشید بیگم کہلانے لگی تھیں۔ ان کے میکے والوں نے انہیں ان کے پرانے جون میں آنے میں ان کی کافی مدد کی تھی۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ شیخ صاحب پیسے سے پیسہ پیدا کرنے میں ایسے مصروف ہوئے کہ سوائے پیسے کے انہیں کچھ یاد ہی نہ رہا۔ مکان کو توسیع دینے کے لئے خورشید بیگم کے تمام زیورات بیچ دیئے گئے۔ اس وعدے پر کہ دو پورشن کرائے پر لگا کر انہی پیسوں سے پھر زیورات بن جائیں گے۔ وہ کڑھ کر رہ گئیں۔ بس اتنا اطمینان تھا کہ اب وہ بے سہارا نہیں۔ میکے والوں کا ہاتھ ان کے سر پر ہے۔

ایک دن کالج سے واپسی پر زارا کو کسی نے اغواء کر لیا۔ اغواکاروں نے 5 لاکھ تاوان کا مطالبہ کیا تو شیخ صاحب کی سیٹی گم ہو گئی۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ ایک دو لاکھ میں بات بن جائے۔ خورشید بیگم کا تو برا حال تھا۔ اغواکاروں کی ہدایت پر کسی کو بھی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ شیخ صاحب نے کسی کو کہیں فون کرنے سے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ ''شیخ صاحب ساری چیزیں انہیں دے دیں۔ یہ زیورات بھی پیسے بھی اگر نہیں پورا ہوتا تو یہ مکان بھی بیچ دیں مگر میری زارا کو بچالیں۔'' وہ مچل مچل کر شیخ امین سے کہہ رہی تھیں اور رو رو کر بُرا حال تھا۔ بس وہ ''ہاں ہاں..... دیکھتا ہوں..... دیکھتا ہوں.....'' کہہ کر وقت کو طول دیتے رہے۔ اغواکاروں کا دیا ہوا وقت گزرتا رہا۔ وہ مزید وقت لیتے رہے پھر ان کا رابطہ بھی ختم ہو گیا۔ اگلی صبح ان کے دروازے پر زارا کی لاش ملی۔ اس صدمے نے کتنے دن تک کے لئے ان کے حواس سلب کر دیئے۔ جب اپنے آپ میں آئیں تو وہی خاموش خاموش خالی خالی نظروں سے دیکھتی ہوئی خورشید بی بی تھیں۔

شیخ صاحب نے اب کام پر جانا چھوڑ دیا تھا۔

اب بیٹی کا صدمہ لے کر سارا دن گھر میں پڑے رہتے۔ شام کے وقت یاروں دوستوں میں بیٹھ کر رات گئے تک تاش کھیلتے رہتے۔ شاید ان کے لئے غم غلط کرنے کا یہی اچھا طریقہ تھا۔ بعض اوقات رات رات بھر تاش کی محفل جمی رہتی۔ کوئی جیتتا کوئی ہارتا۔ بس خورشید بی بی کو ہر دم نماز روزے کی تاکید کرتے رہتے۔ ساتھ ساتھ صبر کی تلقین بھی۔

ہونی پر صبر تو کیا جا سکتا تھا مگر یہ جو کچھ بھی ہوا تھا ایک انہونی حقیقت تھی۔ یہ تو رقم بٹورنے کے لئے ایک ڈرامہ رچایا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے میکے والوں اور عزیز دوستوں سے انہوں نے کافی رقم وصول کی تھی۔ صرف گھر میں سب کو کہیں فون کرنے سے منع کیا ہوا تھا جبکہ خود خورشید بیگم کے گھر والوں سے رقم کے انتظام کا مطالبہ کر چکے تھے۔ جیسے ہی شیخ امین کا فون ان کے میکے میں آیا، چار لاکھ کی رقم تو انہوں نے انہیں بھجوا دی مگر بڑے سالے ظفر نے اپنے ایک ایس پی دوست سے مل کر اس واقعے کی کافی تحقیق کروائی تو بات واضح ہو گئی تھی۔

گھر کی بات تھی۔ اپنی ہی عزت اچھالنے والی بات تھی۔ اگر زارا کو انہوں نے مارا ہوتا تو ضرور کیس کر دیتے۔ جس جگہ اسے لے جا کر رکھا گیا تھا وہ ایک پرانا سا گندم کا گودام تھا۔ ڈھیروں ڈھیر غلے کے آس پاس کیڑے مار گولیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اسے اپنے باپ کے کرتوتوں کا تو علم نہیں تھا۔ اس نے ساری عمر اپنے باپ کو اپنی ماں پر الزام تراشی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اب پتہ نہیں واپسی پر باپ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے، اس نے آس پاس پڑی ہوئی گولیاں اٹھا کر اکٹھی کئی گولیاں کھا کر اپنی زندگی خود ختم کر لی۔ اس وقت اغوا کار انہیں گندم سٹور سے ملحق چھوٹے سے کمرے میں بند کر گئے تھے۔ وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ شیخ امین کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ پریشان ہوئے کہ ایسا تو انہوں نے نہیں چاہا تھا پر اب کیا ہو سکتا تھا۔ انہیں کی ہدایت پر راتوں رات اس کی لاش دروازے پر رکھوا دی گئی۔

☆.....☆.....☆

اس رات شیخ امین کی طبیعت اچانک ہی خراب ہو گئی۔ تاش کی محفل بھی چھوڑ کر اٹھ آئے۔ ویسے جب سے دولت کی دیوی ان پر مہربان ہوئی تھی اکثر ناسازیٔ طبع کا بہانہ بنا کر ہفتوں ہفتوں سوپ، یخنی، پنجیری وغیرہ بنوا کر کھاتے رہتے تھے۔ خدمت داری الگ ہوتی۔ پر اس بار واقعی انہیں کچھ ہوا تھا شاید پچھتاوے نے حقیقت میں آ گھیرا تھا۔ دو تین روز تک گھریلو نسخے وغیرہ استعمال کرتے رہے مگر مرض بڑھتا گیا۔ جوں جوں دوا کی..... والی بات ہو گئی۔ تب انہوں نے ہسپتال جانے کا سوچا۔ خورشید بیگم کے میکے بھی خبر کر دی گئی۔ سارے آن کی آن میں پہنچ گئے۔ اس وقت وہ ہسپتال جا چکے تھے۔ ''اے..... خورشیدے!..... سچ مچ طبیعت خراب ہوئی بھی ہے یا پھر کوئی ڈرامہ رچایا ہے امین نے؟'' بھاوج صاحبہ آتے ہی پھٹ پڑیں۔ ''کیسا ڈرامہ.....؟'' خورشید کی بے یقین نظریں بھاوج کو ٹٹولنے لگیں۔ تب ہی بھائی نے بیگم کو گھورا پھر وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئیں۔ مگر خورشید بیگم کو ایک بے قراری سی لگ گئی تھی۔ آخر کو سوتے وقت تک انہوں نے ان سے اگلوا کر دم لیا اس شرط پر کہ یہ راز ان کے سینے میں ہی دفن رہے گا۔ حقیقت حال سن کر تو انہیں جیسے سکتہ ہی ہو گیا۔ دولت کی خاطر ایک باپ اپنی بیٹی کو اغواء بھی کروا سکتا تھا! وہ سوچتے سوچتے بار بار سر جھٹک دیتیں۔ نہیں..... نہیں..... مگر حقیقت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زندہ قبر

ایس۔ امتیاز احمد

دوسری جنگ عظیم کی ایک خوفناک کہانی..... ہیروشیما جل کر خاک ہو گیا مگر وہ لوگ زندہ رہے.....!

(سمندر پار سے یادگار تحریر)

سارجنٹ جارج ٹرمبل کو 6 اگست 1945ء کی صبح حسب معمول ایک جاپانی کارپول نے لات مار کر جگایا اور بیگار کے لئے تیار ہو جانے کا حکم دیا۔

جارج ٹرمبل امریکی ہوا باز تھا۔ کچھ ہفتوں پہلے ٹوکیو پر بمباری کے دوران جاپانی طیارہ شکن توپوں نے اس کے بمبار کو گرا لیا تھا، جارج نے چھاتے کے ذریعے چھلانگ لگائی۔ زمین پر قدم رکھتے ہی اسے جاپانیوں نے گرفتار کر لیا اور چند روز بعد اسے ہیروشیما شہر کے قریب جنگی قیدیوں کی چھاؤنی میں بھجوا دیا گیا۔

اس چھاؤنی کے قریب جاپانی زیر زمین فوجی مراکز تعمیر کر رہے تھے، جاپانی فوج اس وقت پسپائی

کہاں تک جھٹلائی جا سکتی تھی!

کئی دن تو مختلف قسم کے ٹیسٹ وغیرہ ہوتے رہے۔ طبیعت ٹھیک ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی پھر بھی گھر کی فکر لگی تھی۔ پتہ نہیں کب تک طبیعت سنبھلے گی۔ اس وقت تک تو یہ سسرال والے تباہی پھیر جائیں گے۔ انہیں یہی فکر کھائے جا رہی تھی۔ گھر پر اب اماں تو تھیں نہیں جو نظر رکھتیں۔ اماں کے بعد تو رکھوالی کے لئے گھر میں وہ خود ہی بیٹھ گئے تھے۔ اب پتہ نہیں خورشید بیگم کیا کیا اور کتنا کتنا منگواتی ہوں گی۔ کیا کیا خرچ ہو رہا ہوگا! اسی سوچ وفکر کے درمیان اگلے دن جو رپورٹ ملی تو پھر یہ ساری سوچیں ہوا ہو گئیں۔ انہیں جگر کا کینسر ہو گیا تھا۔ وہ بھی اب زندگی کی آخری سٹیج پر تھے۔ ہفتہ ڈیڑھ تو علاج معالجہ بڑی تندہی سے ہوتا رہا مگر جب جگر گل گل کر اُلٹیوں کے ساتھ باہر آنے لگا تو ساری اُمیدیں دم توڑ گئیں۔ اب وہ معافی مانگنا چاہتے تھے سب سے جن کو دھوکہ دیا جن کا دل دکھایا تھا جن سے ناجائز پیسے بٹورے تھے۔ غنودگی کے عالم میں معافی اللہ معافی اور نہ جانے کیا کیا کہتے رہے مگر اب شاید معافی تلافی کا وقت گزر چکا تھا۔ خورشید آخری وقت تک ان سے ملنے نہیں گئیں۔ لوگوں نے بہتیرا کہا لیکن وہ تو جیسے زندگی موت کے جذبوں سے کہیں دور پہنچ چکی تھیں۔

☆.....☆.....☆

اور اب جب وہ مُردہ حالت میں بھی ان کے سامنے پڑے تھے ان کی خاموشی نہیں ٹوٹ رہی تھی۔ اماں، بھائی الگ شرمندہ تھے کہ انہیں کم از کم خورشید کو رخصت کرتے ہوئے ان پر گھر کے دروازے تو بند نہیں کرنے چاہیے تھے۔ وہ نادان تھیں، دنیا کی ہوا نہیں لگی تھی انہیں، کمسن تھیں۔ آج انہیں پہلی بار اپنے شوہر مظفر حسین پر بھی غصہ آ رہا تھا جنہوں نے آناً فاناً ہسپتال ہی میں ان کا نکاح پڑھوا دیا تھا۔ باقی تو سب دانا تھے پھر کیوں ایسا ہوا؟ انہیں تو گاہے گاہے اس کی خبر گیری کرنی چاہیے تھی۔ بیٹوں کو سمجھا بجھا کر بہن کے پاس بھیجنا چاہیے تھا۔ آج وہ اپنا احتساب کرنے بیٹھی تھیں۔ بھاوج علیحدہ اپنی زبان کے پھسل جانے پر قصوروار نظر آ رہی تھی۔ وہی بعد از مرگ واویلا والی بات تھی۔ ہونی ہو چکی تھی۔ اب لکیریں پیٹنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

تب ہی کلمۂ شہادت کے زوردار نعرے پر ایک بار ان کا ذہن ماضی سے حال کی دنیا میں پلٹ آیا۔ عورتیں سمٹ سمٹا کر کھڑی ہو گئیں۔ جگہ تنگ تھی۔ کھاٹ کو دروازے سے سیدھا نکالنے کے لیے خواتین سے مزید پیچھے ہٹنے کی گزارش کی جا رہی تھی۔ جب ہی خورشید بیگم بڑی تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھیں اور سیڑھیاں چڑھتی اوپر بھاگیں۔ جب تک لوگ چارپائی بڑے پھاٹک سے باہر نکال چکے تھے۔ چشم زدن میں وہ بریف کیس، فائلیں، شیئرز، چیک بک اور جانے کیا کیا لئے آتی دکھائی دیں۔ ''ٹھہریں صاحب جی!'' سب نے پلٹ کر حیرت سے انہیں دیکھا۔ جانے والوں کو روکا نہیں کرتے! کسی نے انہیں متنبہ بھی کیا مگر وہ سب سے بے نیاز سب کچھ وہیں سے پھینکے گئیں ''یہ بھی لے جائیں صاحب جی!..... یہ..... بھی..... یہ بھی.....'' نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس کھل گیا اور سبز، سرخ اور نیلے نوٹوں کی گڈیاں ہر طرف بکھر گئی تھیں۔ دھڑام..... دھڑام..... چیزیں اوپر سے گرتی رہیں۔ لوگ ترحم بھری نظروں سے انکی طرف دیکھتے ہوئے واپس ہونے لگے..... شاید..... پاگل ہو گئی ہے۔

.....❁.....❁.....

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے دوچار تھی۔ جنرل میک آرتھر پیسی فک کے ان جزیروں کو یکے بعد دیگرے فتح کرتے چلے جا رہے تھے جن پر جاپان کا قبضہ تھا، امریکی لڑاکا جہاز جاپان کے مختلف ٹھکانوں پر ہر روز زبردست بمباری کر رہے تھے۔ جاپانی فوجی افسروں کو خدشہ تھا کہ امریکی فوج عنقریب جاپانی علاقے میں اُتار دی جائے گی اور وہ اس صورتحال سے نمٹنے کے لئے مناسب اقدام کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک اقدام مختلف مقامات پر خوراک اور فوجی ساز وسامان کے زیرزمین مراکز تعمیر کرنے سے متعلق تھا۔ ہیروشیما جاپان کا ایک اہم شہر اور صنعتی مرکز تھا۔ چنانچہ وہاں بھی ایک زیرزمین مرکز قائم کیا جا رہا تھا۔

یہ مرکز ڈیڑھ سو فٹ کی گہرائی میں تعمیر کیا جا رہا تھا۔ اس میں چند سرنگیں اور چند کمرے تعمیر کئے جا چکے تھے۔ اور اس میں کھانے پینے کی کافی اشیاء بھی پہنچائی جا چکی تھیں۔ اس گہرائی تک پہنچنے کے لئے ڈیڑھ سو فٹ گہرا ایک چوکور کنواں کھود کر اس میں پھرکی اور رسہ کی مدد سے چلنے والی ایک لفٹ لگائی گئی تھی۔ اب اس ٹھکانے کی زمین پر تعمیر کا کام جاری تھا۔ قیدیوں کی چھاؤنی میں موجود برطانوی اور امریکی قیدیوں سے اس کے لیے بیگار لی جا رہی تھی۔ جاپان کے وہ تمام افراد جو کام کرنے کے قابل تھے، جنگ سے متعلق کاموں میں مصروف تھے، چنانچہ تعمیرات سے متعلق جسمانی مزدوری کے لئے جنگی قیدیوں کے علاوہ جاپان کی دیہی علاقوں کی کسان عورتوں سے بھی بارہ بارہ گھنٹے بیگار لی جاتی تھی۔ گنتی کے چند جاپانی افسر اور سپاہی جو مکمل طور پر ہتھیاروں سے لیس رہتے تھے اور بڑے ہی ظالم تھے جنگی قیدیوں اور کسان عورتوں کی نگرانی پر معمور تھے۔

سارجنٹ جارج ٹمبل جس جاپانی افسر کی نگرانی میں کام کرتا تھا، اس کا لیفٹیننٹ سی ماہیراٹا تھا۔ وہ افسر ہونے کے باوجود کمر میں پستول باندھنے کی بجائے رائفل ہاتھ میں لے کر چلنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ اسے اپنی رائفل کی سنگین جنگی قیدیوں کے جسموں میں چبھانے میں زیادہ مزہ آتا تھا۔ گزشتہ ایک ہفتہ سے سارجنٹ جارج اور تین جاپانی دوشیزائیں توشیکا ہیلن اور میری زیرزمین مراکز تک پہنچنے والی لفٹ کے آس پاس لکڑی کی دیوار کی تعمیر میں مصروف تھے۔ تینوں لڑکیاں اس زمانے کی جاپانی کسان عورتوں کی طرح ان پڑھ، فرمانبردار اور سخت مشقت کرنے والی تھیں لیکن وہ ان سے بے تحاشا مشقت کرانے والے لیفٹیننٹ ہیراٹا سے نفرت کرتی تھیں اور انہیں سارجنٹ جارج سے ہمدردی تھی۔

ابھی صبح کے آٹھ بج کر پچاس منٹ ہوئے ہوں گے، جارج کی پوری قمیص پسینہ سے بھیگ گئی تھی۔ وہ کنویں سے کچھ فاصلے پر پڑے ہوئے لکڑی کے بڑے بڑے ٹکڑے اٹھا کر کنویں کے قریب لا رہا تھا جہاں تین لڑکیاں ان ٹکڑوں کو باڑھ میں لگا رہی تھیں۔ ایسا ہی ایک لکڑی کا ٹکڑا اٹھا کر جارج کنویں کی طرف جا رہا تھا کہ ہیراٹا چپ چاپ اس کے پیچھے آیا اور ''ہو۔ ہو۔ ہو'' کرتے ہوئے اس کے سامنے کود پڑا۔ اپنی رائفل کی سنگین سے جارج کے جسم میں گدگدی کی۔ جارج کے ہاتھ سے لکڑی کا بھاری ٹکڑا چھوٹ گیا اور اس کا پیر پھسل گیا۔ ہیراٹا یہ دیکھ کر ہنسنے لگا۔ جارج کو بہت غصہ آیا اور اس نے اچانک آگے بڑھ کر ہیراٹا کی ناک پر ایک گھونسہ دے مارا۔ ہیراٹا کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی اور وہ قریبی مٹی کے ڈھیر پر گر پڑا۔

ہیراٹا فوراً کھڑا ہو گیا اور اپنی رائفل سنبھال کر جارج پر ٹوٹ پڑا۔

رائفل کا دھکا لگنے سے جارج پیچھے جھک گیا۔ اس کی پیٹھ میں لکڑی چبھ گئی جو کنویں کے قریب تعمیر ہونے والی باڑھ میں لگی ہوئی تھی۔

ہیراٹا نے جارج کے پاؤں سے اپنا پاؤں دبا کر اسے کنویں میں پھینکنا چاہا، جارج مشکل سے اپنا توازن برقرار رکھ کر ہیراٹا سے نبرد آزما ہو گیا۔

اچانک ٹوشیکا چلائی۔

''امریکی بمبار.....!''

اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

ہیراٹا اور جارج دونوں آسمان کی طرف دیکھنے لگے، ایک امریکی بمبار B-29، آسمان میں کافی بلندی پر پرواز کر رہا تھا لیکن کوئی محفوظ مقام کی جانب نہیں دوڑا اور سائرن بھی نہیں بجایا گیا۔ ہیروشیما پر اب تک بہت کم بمباری ہوئی تھی اور بہت کم بم شہر پر برسے تھے چنانچہ بمبار کی پرواز سے کچھ تجسس تو ضرور پیدا ہوا لیکن اس نے کوئی خوف پیدا نہیں کیا۔

اچانک بمبار سے کوئی عجیب سی چیز پھینکی گئی۔ کچھ نیچے آنے کے بعد اس چیز پر ایک چھاتہ کھل گیا اور وہ شے قیدیوں کی چھاؤنی سے کچھ ہی فاصلے پر تین سو سال پرانے قلعے ہیروشیما پر پڑی، یہ بم تھا۔ اتنے قریب بم گرتا دیکھ کر سب لوگ محفوظ مقامات کی تلاش میں بھاگنے لگے۔ ہیراٹا اور تین لڑکیاں بھی خوفزدہ ہو گئے۔ ہیراٹا لفٹ کی چھت کے بغیر پنجرے میں کود پڑا۔ تینوں لڑکیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ ہیراٹا لفٹ کا رسہ کھینچ کر اسے چلانے لگا۔ جارج ابھی اوپر ہی رہ گیا تھا۔ لفٹ کا پنجرہ زمین پر پہنچ کر ایک دھماکے کے ساتھ رُک گیا۔ ہلکی سی روشنی میں بیٹھ کر وہ سب دھماکے کی آواز کا انتظار کرنے لگے۔ چند لمحے بیت گئے۔ بعد میں روشنی کی ایک زبردست لہر کنویں کو روشن کر گئی اس کے ساتھ زمین زور زور سے ہلنے لگی۔ کنویں کی دیواروں سے چھوٹے بڑے پتھر اکھڑ کر ان کے سروں پر گرنے لگے۔ وہ سب لفٹ سے نکل کر زیرزمین مکان میں داخل ہونے کے لئے بنائی ہوئی سرنگ میں گھس گئے۔ کچھ لمحوں بعد ایک زبردست دھماکا ہوا اور انہوں نے دیکھا کہ لفٹ کے پنجرے کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ اوپر سے بے تحاشا مٹی اور لفٹ کے چڑھنے اور اُترنے کا پورا ڈھانچہ زمین پر گر پڑا۔ سرنگ میں داخل ہونے کا راستہ اس ملبے سے بالکل بند ہو گیا اور سرنگ میں مکمل تاریکی چھا گئی۔

تھوڑی دیر میں تمام آوازیں مدھم پڑتے پڑتے بالکل خاموش ہو گئیں۔

اب ان لوگوں کو ہوش آیا اور وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایک دوسرے کو دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کرنے لگے۔

سارجنٹ ٹمبل اچانک بول پڑا ''یہ بم بہت خطرناک تھا۔''

لیکن اسے اس کا علم نہیں تھا کہ بم واقعی کتنا بھیانک تھا۔ جنگ کی تاریخ کا یہ پہلا ایٹم بم تھا جو 6 اگست 1945ء کی صبح سوا آٹھ بجے پھینکا گیا تھا اور اس سے پورا ہیروشیما ملبہ بن کر رہ گیا تھا۔ اس بم نے پچھتر ہزار سے زائد انسانوں کی جان لی تھی۔

جارج کو اپنی بات کا کوئی جواب نہ ملا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر میں اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئیں اور اس نے دیکھا کہ ہیراٹا ہیلن، میری اور ٹوشیکا سرنگ میں الگ الگ ایک دوسرے سے دُور دُور خاموش بیٹھے تھے۔ ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سب کی نظریں سرنگ کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ حفاظتی دستوں کی کلہاڑیوں کی آوازیں سننے اور روشنی دیکھنے کے منتظر تھے۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اب جارج کو یقین ہو گیا کہ کسی حفاظتی دستے کی آمد کی امید بیکار ہے۔ ''جس بم کی روشنی ڈیڑھ سو فٹ کی گہرائی تک اتنی صاف نظر آئی ہو وہ یقیناً کوئی معمولی بم نہیں ہو سکتا۔'' اس نے سوچا۔

چاروں جاپانیوں نے اپنی زبان میں کچھ بات کی۔ ٹوشیکا نے بعد میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جارج سے پوچھا ''یہ کیا تھا؟ تم ہوا باز ہو، تمہیں تو علم ہو گا!''

''مجھے علم نہیں۔'' جارج نے کہا۔

''تمہارے خیال میں کوئی حفاظتی دستہ یہاں آئے گا؟''

''مجھے نہیں معلوم لیکن میرا خیال ہے کہ اوپر زمین پر سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا ہو گا۔ پھر ہم کو اس کنویں میں اُترتے کسی نے دیکھا بھی نہیں۔ وہ تو یہی خیال کریں گے کہ اندر کوئی نہیں ہے چنانچہ وہ بلاوجہ تو ڈیڑھ سو فٹ کی گہرائی تک کھدائی کرنے سے رہے۔'' پھر اس نے سوال کیا۔

''کیا یہاں سے نکلنے کا کوئی اور راستہ نہیں؟''

''شاید نہیں۔'' ٹوشیکا بولی۔ پھر اس نے ہیراٹا سے جاپانی زبان میں بات چیت کی۔ بعد میں وہ انگریزی زبان میں بولی ''نہیں ہیراٹا کہتا ہے کہ باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ نہیں۔''

جارج نے ماچس کی تیلی جلائی۔ اس نے دیکھا کہ ہیراٹا اور تین لڑکیاں اسے عجیب نظروں سے گھور رہے تھے۔

''تم لوگ کیا سوچ رہے ہو؟'' وہ بول پڑا ''بم پھینکنے والا طیارہ میں نہیں اُڑا رہا تھا۔ میں تو تمہارے ساتھ ہی رہا ہوں۔''

ایک تیلی جل جانے پر اس نے دوسری تیلی جلائی۔

''تیلیاں جلا جلا کر انہیں ضائع کرنا عقل مندی نہیں۔'' ٹوشیکا نے کہا۔ ''سرنگ کے ایک طرف کے سرے پر ایک ''فانوس'' ہے لیکن ان سب باتوں سے کیا فائدہ؟ یہاں صرف تین کمرے ہیں اور ہم زیادہ سے زیادہ یہی تو کر سکتے ہیں کہ اس کمرے کو پسند کر لیں جس میں ہم مرنا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا!''

بہرحال جارج نے فانوس روشن کیا۔ اب انہیں ٹھیک طرح سے احساس ہوا کہ وہ کس بُری طرح پھنس گئے ہیں۔ سرنگ کے دروازے پر بڑے بڑے پتھر، لکڑی کے ٹکڑوں اور کنکریٹ کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کی ایک بے ڈھپ سی دیوار بن گئی تھی۔ فانوس کی روشنی کنکریٹ کی دیواروں، چھت اور زمین پر پڑی۔ سامنے کی دیوار میں ایک تنگ سی گلی نظر آئی۔ جارج فوراً اس کی طرف لپکا۔

اچانک ہیراٹا نے اس کا راستہ روکا۔ ہیراٹا گہری سانس لے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ وہ زور سے بولی۔

''بی 29!''

''اب ان باتوں کو مت دہراؤ۔'' جارج نے کہا۔

''لیکن ہیراٹا اپنی رائفل سنبھالتا ہوا جارج کی طرف لپکا۔''

جارج نے ہیراٹا کا وار خطا کر دیا اور اس کی ایک ٹانگ پکڑ کر اُچھال دیا۔ ہیراٹا کے ہاتھ سے رائفل گر گئی اور وہ دونوں زمین پر گتھم گتھا ہو گئے۔

اس دوران ٹوشیکا، میری اور ہیلن نے اپنی زبان میں جلدی سے بات چیت کی اور بعد میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے ملبہ سے لکڑی کے ٹکڑے نکالے اور ہیراٹا اور جارج کی طرف دوڑیں۔ ہیراٹا انہیں اپنی طرف آتا دیکھ کر بولا ''شاباش لڑکیو! اس کے سر پر وار کرنا۔''

لڑکیوں نے دونوں کے سروں پر ضرب لگائی اور وہ دونوں بیہوش ہو گئے۔

دونوں کو جب ہوش آیا تو ٹوشیکا ہیراٹا کے سینے پر سنگین تانے کھڑی تھی اور جارج کے قریب میری اور ہیلن ڈنڈے اٹھائے کھڑی تھیں۔

ہیراٹا کو ہوش میں آتا دیکھ کر ٹوشیکا بلند آواز میں جاپانی زبان میں کچھ کہنے لگی۔ ہیراٹا نے بھی ایک بار زور سے کچھ کہا۔

لیکن ٹوشیکا نے سنگین اس کی گردن پر دبا کر اسے خاموش کر دیا۔ ٹوشیکا جب بولتی رہی، اس وقت تک میری اور ہیلن ڈنڈے اٹھائے ''ہے'' ''ہے'' بولتی رہیں۔

ہیراٹا کو لیکچر پلانے کے بعد ٹوشیکا نے جارج سے کہا ''تم بھی ہماری بات کو سمجھ گئے نا؟''

''نہیں ہمارے سکول میں جاپانی زبان نہیں سکھائی جاتی۔'' جارج نے جواب دیا۔

ٹوشیکا نے پھر ٹوٹی پھوٹی انگریزی کا سہارا لیا اور بولی ''میں نے ابھی ہیراٹا سے کہا کہ ہم نے آپ دونوں کو کیوں بیہوش کر دیا تھا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمیں ایسا کرنا پڑا لیکن آپ دونوں کی لڑائی ہمیں برباد کر دے گی۔ ہم سب یہاں زندہ قبر میں دفن ہیں اور آپ دونوں نادان لڑکوں کی طرح لڑ رہے ہیں۔ آپ لوگوں کو اب دشمنی بھلا کر یہاں سے باہر جانے کا راستہ تلاش کرنا ہے جو سب سے اہم معاملہ ہے۔''

''یعنی ہم جنگ بند کر دیں؟'' جارج بولا ''لیکن اس بات کا کیا بھروسہ کہ ہیراٹا جنگ بندی کی خلاف ورزی نہیں کرے گا؟''

''وہ ایک جاپانی افسر ہے۔'' ٹوشیکا نے کہا۔

''میں ایک امریکی افسر ہوں۔'' جارج نے کہا۔ اگر وہ مجھ سے جھگڑا نہیں کرے گا اور میرے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرے گا تو مجھے جنگ بندی منظور ہے۔''

ٹوشیکا نے اس کا جاپانی زبان میں ترجمہ کیا۔ ہیلن اور میری نے سر ہلا کر تصدیق کی، ہیراٹا نے بھی سر ہلایا۔

ذرا سا سکون مل جانے کے بعد سارجنٹ جارج ٹرمبل نے زندہ قبر سے باہر جانے کے ممکنہ راستے کی تلاش شروع کی لیکن ایسا کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ سوائے ان دو دراڑوں کے جو بم کے دھماکوں کی وجہ سے کنکریٹ کی دیوار میں پڑ گئی تھیں۔ خوش قسمتی سے ان دراڑوں اور لفٹ کے کنویں میں گرنے والے ملبے سے ہوا کی آمد و رفت ہو رہی تھی۔ اس کی چھت میں پڑے ہوئے ایک شگاف سے پانی ٹپک رہا تھا جو شاید برسات کا پانی تھا۔ جارج نے اس پانی کو جمع کرنے کے لیے ایک بالٹی رکھ دی۔

اس زیر زمین مرکز میں تین بڑے کمرے تھے جو ایک دوسرے سے تین فٹ اونچی سطح پر تعمیر کئے گئے تھے۔ ان کے درمیان آنے جانے کے لیے سرنگیں تھیں جن میں آدمی پیٹ کے بل گھسٹ کر جا سکتا تھا۔ یہ کمرے محفوظ رسدگاہوں کے طور پر تعمیر کئے گئے تھے لیکن ابھی تک ان کمروں کو دیگر زیر زمین مراکز سے جوڑا نہیں گیا تھا۔

تین کمروں میں سے درمیانی کمرہ چاول کی بوریوں، مگر مچھ اور کیکڑوں کے گوشت کے بکسوں اور دوسری اشیاء سے بھرا پڑا تھا۔ اس کے علاوہ اوزار، کھانا کھانے کی چیزیں، بارود، رائفلوں کا

بکس، ایک ہزار گیلن کیروسین، چھت کو سہارا دینے کے لیے لکڑی کے بڑے بڑے ٹکڑے وغیرہ بھی پڑے تھے۔ جارج نے ان اشیاء کا جائزہ لیا اور بعد میں وہ اس کمرے میں آیا جہاں چاروں جاپانی بیٹھے تھے۔

جارج نے ٹوشیکا سے کہا ''سب سے کہہ دو کہ یہاں اناج بڑی مقدار میں موجود ہے البتہ پانی کا مسئلہ رہے گا لیکن یہ کوئی بڑی بات نہیں یہاں ہم برسوں تک زندہ رہ سکیں گے۔''

ٹوشیکا نے اس کا ترجمہ کیا اور بعد میں جارج نے کہا ''ہمیں معلوم نہیں کہ حفاظتی دستے یہاں کب آئیں گے، کسی نے ہمیں لفٹ میں اُترتے دیکھا ہے یا نہیں! یہ بھی ایک سوال ہے۔ بہرحال اگر دیکھا بھی ہے تو وہ یہ سوچ سکتے ہیں کہ ہم مر کھپ گئے ہوں گے۔ ایسے حالات میں ہمیں یہاں سے نکلنے میں کافی وقت لگ سکتا ہے۔ یہاں بیکار بیٹھے رہنے اور خیالات میں گم رہنے سے تو بہتر ہے کہ ہم کسی نہ کسی کام میں مصروف رہیں ورنہ تو ہم پاگل ہو جائیں گے۔

ٹوشیکا نے پھر ترجمہ کیا۔ ہیلن اور میری مسکرائیں۔ ہیراٹا نے تھوک دیا۔ اس نے اپنی گود میں پڑی ہوئی رائفل کو ہاتھ لگایا اور اس طرح اس نے جارج کو یاد دلایا کہ وہ اب بھی ایک جاپانی افسر کا قیدی ہے۔

جارج نے دیکھا اور بولا ''میرا خیال ہے کہ ہمیں جنگ بندی کی پہلی کسوٹی بھی کر لینی چاہیے۔''

اس نے کمال مستعدی سے رائفل چھین لی اور اس سے تمام کارتوس نکال لئے اور رائفل ہیراٹا کو واپس کر دی۔

ہیراٹا گالیاں بکتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ رائفل اٹھائی پھر اسے دیکھا اور پھر اسے زمین پر پٹخ دیا اور پیر پٹختا ہوا کمرے میں چلا گیا۔

جارج اور تینوں لڑکیاں فوراً اس کے پیچھے گئے۔ ہیراٹا مایوس ہو کر ایک بکس پر بیٹھا تھا۔ ٹوشیکا نے جارج سے کہا ''ابھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں، ہمیں اپنا کام کرنا چاہیے۔''

پہلا کام تمام ساز و سامان کی گنتی کرنے کا تھا۔ کمرے میں کاغذ قلم، رجسٹر وغیرہ موجود تھے۔ تینوں لڑکیاں یکے بعد دیگرے چیزوں کی گنتی کرتی گئیں اور جارج کو لکھواتی گئیں۔

چند گھنٹوں کے بعد انہوں نے پہلی بار کھانا کھایا بعد میں وہ بکسوں پر تارپولین بچھا کر سو گئے۔

وہ سب جانے کتنی دیر سوتے رہے، بہرحال کتے کے بھونکنے کی آواز سُن کر وہ جاگ پڑے.....!

''یہاں کتا کیسے آن دھمکا؟'' جارج بول پڑا۔

کتا چھوٹے قد اور سفید رنگ کا تھا۔ اس کی گردن میں پٹہ پڑا ہوا تھا۔ سب کو جاگا ہوا دیکھ کر کتا اپنی دُم ہلانے لگا۔

کتا جس راستے سے اندر آیا ہے اس سے شاید ہم باہر جا سکیں۔ ہمیں دوبارہ اس راستے کو تلاش کرنا چاہیے۔ سب نے سوچا۔

پھر وہ سب تلاش میں لگ گئے۔ کافی تلاش کے بعد انہیں سب سے اونچے کمرے سے لفٹ کے کنویں کے ملبے میں وہ راستہ نظر آیا جہاں سے کتا آیا تھا۔ لکڑی کے ٹکڑوں کے درمیان کے حصے میں کچھ جگہ رہ گئی تھی۔

یہ ایک بالشت جگہ تھی۔ یہ شگاف ایک فٹ کے بعد دوسری سمت میں مڑ گیا تھا۔ جارج نے پہلے بھی ایسے شگاف دیکھے تھے لیکن وہ ایسے تھے کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انسان اس سے گزر نہ سکتا تھا۔

غالباً یہ شگاف تھوڑے سے فاصلے کے بعد بند ہو جاتے تھے۔ ایک بالشت بھر کے شگاف پر کتے نے آتے ہی پیشاب کیا تھا۔ اس سے جارج نے اندازہ لگایا کہ کتا اسی راستے سے اندر آیا تھا۔

کتے کو تھوڑا سا گوشت کھانے کو دیا گیا پھر جارج نے ٹوشیکا سے کہا کہ جاپانی اور انگریزی زبانوں میں ایک رقعہ لکھے کہ جنگی قیدیوں کی چھاؤنی کے قریب زیرزمین مرکز میں پانچ افراد 6 اگست سے پھنسے ہوئے ہیں۔

جب یہ رقعہ لکھ لیا گیا تو اس کتے کے گلے میں پڑے ہوئے پٹے سے یہ رقعہ باندھ دیا گیا۔ بعد میں اس نے پٹے سے ایک لمبی رسی باندھی پھر کتے کو مذکورہ شگاف کے قریب لا کر اندر دھکیلنے کی کوشش کی۔ کتا اندر جانے پر آمادہ نہ تھا۔ سب نے مل کر اسے اندر دھکیل دیا۔

کتا شگاف میں گم ہو گیا۔ جارج کے ہاتھ میں جو رسی تھی وہ آہستہ آہستہ جھٹکوں کے ساتھ کھلتی جا رہی تھی۔ رسی ستر فٹ تک کھلنے کے بعد اچانک ایک زور کا جھٹکا لگا اور رسی بالکل ڈھیلی ہو گئی۔ جارج نے رسی کھینچی تو وہ واپس آنے لگی۔ ذرا سی دیر میں رسی کا ٹکڑا اور اس کے ساتھ پٹہ اور پٹے سے بندھا ہوا رقعہ واپس آ گیا۔ کتا پٹہ تڑوا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

تیسرے روز یعنی 9 اگست کو دوسرا ایٹم بم ناگاساکی پر پھینکا گیا اور وہاں بھی ہیروشیما جیسی تباہی مچی لیکن زیرزمین مرکز میں محبوس ان پانچ افراد کو اس کا کوئی علم نہ تھا۔ وہ اب بھی محافظ دستوں کے کلہاڑوں اور پھاوڑوں کی آوازوں کے منتظر تھے۔

جارج اپنی گھڑی دیکھ کر تاریخوں کا حساب رکھ رہا تھا۔ ہیراٹا بیزار شکل لئے گھومتا تھا۔ وہ دیگر چار افراد سے قطعی تعاون نہ کرتا اور خیالات میں کھویا رہتا تھا۔

اس شام ٹوشیکا نے جارج کے پاس آ کر کہا ''ہیراٹا نے تمہیں سلام کہا ہے اور اس مقام کی تنہائی کی پیدا کردہ بوریت، یکسانیت اور دہشت کو دور کرنے کے لیے وہ ایک کھیل تجویز کرنا چاہتا ہے۔''

''وہ کیا؟'' جارج نے دریافت کیا۔

''اگر تم آمادہ ہو تو آج رات کھانا کھانے کے بعد تم سے ''طمانچوں کا کھیل'' کھیلنا چاہتا ہے۔''

''یہ کون سا کھیل ہے؟'' جارج نے معلوم کیا۔

''اس کھیل کے لئے زمین پر رسوں سے چھ فٹ کی رنگ بنائی جاتی ہے۔ دونوں کھلاڑی اس رنگ میں آمنے سامنے بیٹھتے ہیں۔ دونوں اپنا بایاں ہاتھ اپنی کمر کے پیچھے رکھتے ہیں اور دائیں ہاتھ سے باری باری ایک دوسرے کو طمانچے مارتے ہیں۔''

''اس میں ہار جیت کا فیصلہ کیسے ہوتا ہے؟''

''جو فرد پہلے غصہ کرے اور طمانچہ کے بجائے مکہ مار دے یا بائیں ہاتھ کو استعمال کرے وہ ہار جاتا ہے۔ اگر کوئی فرد رنگ سے باہر گر جائے تو بھی ہارا ہوا تسلیم کیا جاتا ہے۔''

''مجھے یہ کھیل منظور ہے!'' جارج نے کہا۔

رات کے کھانے کے بعد ٹوشیکا، ہیلن اور میری کی موجودگی میں جارج اور ہیراٹا کے درمیان یہ انوکھا میچ شروع ہوا۔

دس منٹ کے بعد دونوں کے گال لال ہو گئے اور دونوں کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ دونوں کے دماغ پھرنے لگے۔ جارج نے اچانک

ہیراٹا کا ایک طمانچہ خطا کر دیا چنانچہ وہ رنگ سے باہر گر گیا۔

''جارج نے بازی جیت لی!'' ٹوشیکا نے فیصلہ سنایا لیکن ہیراٹا ابھی کھیل جاری رکھنا چاہتا تھا۔ وہ جارج کی طرف لپکا۔ ایک بار پھر وہ دست بدست لڑائی لڑنے لگے۔ دو منٹ تک یہ لڑائی جاری رہی بعد میں جارج نے ایک زوردار مکہ ہیراٹا کی ناک پر مارا جس سے ہیراٹا کی ناک لہولہان ہو گئی۔ اس طرح لڑائی ختم ہوئی۔

دن گزرتے گئے۔ اس دوران جاپان نے شکست تسلیم کر لی اور جنگ بند ہو گئی لیکن ان پانچ افراد کو اس کا کچھ علم نہ تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے سامنے کئی مسائل اُٹھتے چلے گئے اور ان کے حل بھی ملتے گئے۔ ان میں ایک مسئلہ فضلہ رفع کرنے سے متعلق تھا۔ دو دن میں وہ ایک بار پاخانے کی بالٹی نیچے کے کمرے میں لے جاتے اور اس کمرے کی زمین کے دو انچ کے ایک شگاف میں ڈال کر اس پر تھوڑا سا پانی چھڑک دیتے تھے۔ شگاف کے نیچے کی زمین غالباً بہت نرم تھی چنانچہ فضلہ اس میں جلد جذب ہو جاتا تھا۔

ایک اور مسئلہ 21 اگست کی نصف شب کے بعد کھڑا ہوا۔ جارج کچھ آوازیں سن کر اچانک جاگ گیا اور اس نے چوہا دیکھا جو کمرے میں اچھل کود کر رہا تھا۔ کتے کے بعد اب چوہے کی آمد کچھ تعجب خیز نہ تھی لیکن تھوڑی دیر بعد لفٹ کے کنویں سے ایک اور چوہا آیا۔ بعد میں تیسرا آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں چوہے آن دھمکے۔

ہیراٹا، ہیلن، ٹوشیکا اور میری بھی جاگ گئے۔ تینوں لڑکیاں خوفزدہ ہو کر فانوس اٹھا کر ایک ایک کونے میں دبک گئیں۔ ہیراٹا اپنی رائفل کے ساتھ سپاہیانہ انداز سے کھڑا تھا۔

انہیں پتہ نہ تھا کہ اس وقت پورے ہیروشیما پر ہزاروں چوہوں نے ہلہ بول دیا تھا۔ جنگ کے زمانے کے پیدا کردہ قحط کی وجہ سے چوہوں کو کھانے کو کچھ نہ ملا تھا چنانچہ اب وہ بھوکے ہونے کے سبب درخت اور پتے، نرم لکڑی اور کپڑا کھانے کے علاوہ جانوروں اور انسانوں پر بھی حملہ آور ہو رہے تھے۔ انہی میں سے بے شمار چوہے زیرزمین مرکز میں گھس آئے تھے۔

جارج نے اپنے قریب آتے ہوئے ایک چوہے کو لات رسید کی اور وہ چوہا لنگڑا ہو کر دوسرے چوہوں کے درمیان جا پڑا۔ دوسرے چوہے فوراً اس پر ٹوٹ پڑے اور وہ چند ہی لمحوں میں بھوکے چوہوں کی خوراک بن گیا!

ہیراٹا اپنی رائفل سے چوہوں کو مار مار کر لاتوں سے دوسرے چوہوں کے درمیان پھینک رہا تھا۔ اچانک اس کا پیر ایک مرے ہوئے چوہے پر پڑا اور وہ پھسل گیا۔ بے شمار چوہے اس کے جسم پر چڑھ گئے۔ ہیراٹا زور زور سے چیخنے لگا اور ہاتھ پاؤں زمین پر پٹخنے لگا۔ پھر وہ زمین پر پہلو بدلنے لگا۔ اس سے چند چوہے مارے گئے لیکن اس کے جسم پر چوہوں کا حملہ شدید سے شدید تر ہونے لگا اور چوہے اس کے جسم کے مختلف حصوں کو کاٹنے لگے۔

ہیلن یہ دیکھ کر چیخ پڑی۔

''جلدی سے فانوس دینا۔'' جارج چیخا۔

''ٹوشیکا نے فانوس اس کی طرف پھینکا۔ جارج نے اسے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس نے فانوس کو بیس فٹ کے فاصلے پر چوہوں کے درمیان پٹخ دیا۔ فانوس پھٹ گیا۔ اس میں سے مٹی کا تیل زمین پر بہنے لگا اور جلنے لگا۔ جلتے ہوئے گوشت کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بدبو کے ساتھ دھواں اُٹھنے لگا۔ چوہے بھاگنے لگے۔

تھوڑی دیر میں آگ بجھ گئی۔ زمین پر سینکڑوں چوہے مُردہ پڑے تھے۔ چند چوہے ابھی زندہ تھے۔ جارج نے لڑکیوں سے کہا ''تمہیں ڈر لگے یا متلی آئے بہرحال تمہیں ان چوہوں کو کچل دینا ہے۔ دیکھنا ایک بھی چوہا بچنے نہ پائے!''

وہ پانچوں رائفلیں اور ڈنڈے لے کر آدھ جلے لیکن زندہ چوہوں پر پل پڑے اور تھوڑی دیر میں تمام چوہوں کا قلع قمع کر دیا۔

اب ان سب مُردہ چوہوں کو رفع کرنے کا مسئلہ درپیش آیا۔ تھوڑی سی سوچ کے بعد جارج کے کہنے پر انہوں نے ایک بڑا بکس لیا اور اس میں سیمنٹ اور پانی کا آمیزہ ڈالا پھر تمام چوہوں کی لاشیں اس بکس میں بھر دیں اور اوپر تھوڑا اور سیمنٹ ڈال دیا گیا۔

دو دن میں سیمنٹ سوکھ گیا اور چوہوں کے خلاف جنگ کی یادگار کے طور پر بکس اور زمین پر آگ کے نشانات رہ گئے۔

ہیراٹا کے علاوہ جارج کو بھی چوہوں نے کاٹ کھایا تھا۔ تینوں لڑکیوں نے مل کر ان کی مرہم پٹی کر دی۔ تین دن تک دونوں کی طبیعت خراب رہی بعد میں وہ دوبارہ تندرست ہو گئے۔

چوہوں سے جنگ کے بعد وہ سب مایوس ہو گئے کیونکہ چوہوں کی آمد کے بعد ان کو یقین ہو گیا کہ ان کو بچانے کے لیے کھدائی نہیں ہو رہی ہے۔ اگر کھدائی جاری ہوتی تو چوہے اندر نہیں آ سکتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس زیرِ زمین مرکز کے ملبے کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اس میں کوئی انسان نہ ہوگا۔

چند روز بعد جارج نے کہا کہ اب محافظ دستے کی آمد کی توقع کرنا بیکار ہے۔ اگر باہر نکلنا ہے تو ہمیں خود راہ تلاش کرنا ہوگی اور ہمیں تمام کوششیں کرنا ہوں گی۔ ان میں سب سے بہتر راستہ یہ ہے کہ سب سے اونچے کمرے کی چھت میں شگاف ڈال کر وہیں سے اوپر کھدائی کر کے زمین پر پہنچا جائے۔

جارج کی اس تجویز کی ہیلن اور ہیراٹا نے مخالفت کی۔ ہیراٹا کا کہنا تھا کہ تمام تعمیر کنکریٹ کی ہے اور اس میں سے راہ نکالنا ناممکن ہے۔ ہیلن کا اختلاف اس سے مختلف تھا۔ اس نے جارج سے چند سوالات کیے۔ جارج نے اعتراف کر لیا کہ اسے ایسی کھدائی کا تجربہ نہیں ہے۔ ہیلن نے اس خطرے کا اظہار کیا کہ کسی تجربے کے بغیر چھت میں کھدائی کرنے سے ممکن ہے پوری چھت بیٹھ جائے۔

ٹوشیکا نے جارج کی تجویز سے اتفاق کیا۔ میری نے اپنی رائے محفوظ رکھی۔ بہرحال طے یہ پایا کہ اس قسم کی کھدائی کے سوا یہاں سے نکلنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں چنانچہ خطرہ ہونے کے باوجود کھدائی شروع کی جائے۔ سب اس بات پر بھی متفق ہوئے کہ اس طرح محنت و مشقت میں لگے رہنے سے وقت بھی گزرے گا اور بیکار کے خیالات میں گم رہنے سے دماغی توازن برقرار نہ رہنے کا خدشہ بھی ٹل جائے گا۔

دوسرے دن سے کام شروع کر دیا گیا۔ ایک دن کی محنت سے چھت تک پہنچنے کے لیے مچان تیار کیا گیا۔ بعد میں جارج اس مچان پر چڑھ گیا۔ اس نے چھت پر ایک چھوٹا سا دائرہ بنایا اور کلہاڑی سے کھدائی شروع کی۔ تینوں لڑکیاں نیچے کھڑی اوزار دیتی رہیں اور چھت سے گرنے والی مٹی کی صفائی کرتی رہیں۔ جارج انہیں مصروف رکھنے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے جان بوجھ کر مختلف چیزیں مانگتا رہا۔ ہیراٹا اس کام میں تعاون نہیں کر رہا تھا۔

پہلے روز بمشکل ایک انچ کا چوتھائی حصہ کنکریٹ توڑا جا سکا۔ ہفتہ کے اختتام تک دو انچ کھدائی ہو سکی۔ اب ہیلن اور میری کا جوش و خروش جواب دے گیا۔ اس کے بعد جارج کو ڈائنامائیٹ یاد آیا۔ زیرِ زمین مرکز میں ڈائنامائٹ کافی مقدار میں موجود تھا۔ اس نے تھوڑا سا بارود لیا۔ تینوں لڑکیاں خوفزدہ ہو گئیں اور انہوں نے بارود کے استعمال سے چھت گر جانے کے خدشہ کا اظہار کیا۔ بہرحال جارج اپنے ارادے پر اٹل رہا۔

وہ مچان پر چڑھ گیا۔ اس نے وہاں بارود، فیوز اور رسی رکھ دیئے۔ تینوں لڑکیوں اور ہیراٹا کو اس نے دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ پھر اس نے فیوز کو ایک تیلی سے جلا دیا۔ وہ جلدی سے مچان سے اُتر گیا اور دوسرے کمرے کی طرف لپکا لیکن اس سے پہلے کہ وہ دوسرے کمرے میں پہنچتا، بارود کا دھماکہ ہو گیا۔ اس کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے دھماکہ وقت سے پہلے ہو گیا تھا۔ وہ ایک دھکے کے ساتھ دوسرے کمرے میں جا گرا اور بیہوش ہو گیا۔

جب وہ ہوش میں آیا تو ہیراٹا، ہیلن، ٹوشیکا، میری اسے گھیرے ہوئے کھڑے تھے۔ سب کی نظروں میں نفرت بھری تھی۔ جارج کے جسم پر ہلکی چوٹیں آئی تھیں۔

"مجھے افسوس ہے" اس نے رُک رُک کر کہا۔ "دوسری بار میں زیادہ ہنرمندی سے کام لوں گا۔"

"دوسری بار ایسا نہ ہو سکے گا۔" ٹوشیکا نے کہا۔

ہیراٹا نے دونوں لڑکیوں کو پٹی پڑھا دی تھی کہ وہ ہم کو جان سے مار دینے کے لیے ایسا کر رہا ہے۔"

جارج نے اب ہیراٹا کو غور سے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ رائفل گولی چلانے کے لیے تیار تھی اور سنگین چڑھائی ہوئی تھی۔

جارج نے محسوس کیا کہ ہیراٹا اس کی ناکامی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے لڑکیوں کے ذہنوں پر مسلط ہو گیا ہے اور ان بکسوں کو کھلوا لیا ہے جو اب تک بند تھے۔ ان میں کارتوس تھے۔

ہیراٹا نے ٹوشیکا سے کچھ کہا۔ ٹوشیکا نے اسے بتایا "ہیراٹا کہہ رہا ہے کہ تم نے چوہوں سے اس کی جان بچائی ہے اس لئے وہ تمہیں جان سے تو نہیں مارے گا لیکن تم اب بھی جنگی قیدی ہو اور تمہارا افسر ہیراٹا ہے۔"

"اس سے کہہ دو کہ موقع ملتے ہی میں اس سے رائفل چھین لوں گا اور اسے پیٹ دوں گا۔" جارج نے کہا۔

ٹوشیکا بولی "میں ایسا نہیں کہہ سکتی، ہیراٹا کا حکم ہے کہ تم اپنا کام جاری رکھو۔"

"کیا میں دوبارہ بارود لے سکتا ہوں؟" جارج نے پوچھا۔ ٹوشیکا نے ہیراٹا سے یہ سوال کیا۔ ہیراٹا کے علاوہ ہیلن اور میری نے بھی غصہ سے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ انکار کرتا ہے۔" ٹوشیکا نے کہا۔

"اس سے کہو کہ صرف کلہاڑی سے کام نہیں چلے گا۔"

ٹوشیکا نے جاپانی میں اس کا ترجمہ کیا۔

ہیراٹا یہ سن کر مسکرایا۔

جارج کو تعجب ہوا۔ اس نے فوراً ٹوشیکا سے پوچھا "تم نے اس سے کیا کہا؟"

"یوں سمجھ لو کہ ضرورت پڑنے پر تم بارود لے سکو گے۔" ٹوشیکا بولی "فی الحال زیادہ باتیں

کرنے کی ضرورت نہیں۔"

جارج ہیلن کی نگرانی میں سب سے اونچے کمرے میں گیا۔ ہیلن کے پاس ہیراٹا کی دی ہوئی رائفل تھی۔ جارج نے چھت کی طرف نظر کی۔ بارود پھٹنے کے باوجود چھت میں ایک شگاف بھی نہ پڑا تھا۔

دوسرے روز سے ہیراٹا نے لڑکیوں کو رائفلوں اور سنگینوں کے ساتھ پریڈ کرانا شروع کیا۔ اس نے انہیں نشانے بازی کی تعلیم دی اور لکڑی، پرانے کپڑے اور پیکنگ کے لئے استعمال کی جانے والی گھاس وغیرہ سے ایک پتلا بنایا اس پر F.D.R (فرینکلن ڈیلانو روز ولٹ) لکھا۔ روزولٹ امریکہ کے صدر تھے۔ ایٹم بم کے استعمال سے چند روز پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا اور ہیری ٹرومین نئے صدر بنے تھے۔ ہیراٹا کو شاید اس کا علم نہ تھا یا اسے نئے صدر کا نام معلوم نہیں تھا اس نے ایف۔ ڈی۔ آر لکھے ہوئے پتلے پر نشانہ بازی کی تعلیم دینی شروع کی۔ مرکز چونکہ ہر طرف سے بند تھا اس لئے گولیوں کی آواز گویا بارود کا دھماکہ معلوم ہوتی تھی۔

جارج اس دوران مچان پر بیٹھا کھدائی میں مصروف رہا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ وہ ہیراٹا پر اچانک حملہ کر دے لیکن پھر اس نے سوچا کہ ہیراٹا ایسے کسی حملے یا اس بہانے سے اسے جان سے مار دینا چاہتا ہے۔ اس نے سوچا کہ کھدائی آگے بڑھنے پر اسے ہیراٹا کی جسمانی مدد کی بھی ضرورت پڑے گی۔

چند روز اور بیت گئے!.....

جارج کا کام ابھی چند فٹ سے آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ اب کنکریٹ میں شگاف پڑ چکا تھا لیکن اس سے آگے والے پتھر بہت ہی سخت تھے گو کہ یہ پتھر صحیح طرح سے لگے ہوئے نہ تھے تاہم وہ ایک دوسرے سے بہت سختی سے ملے ہوئے تھے اور ان کو الگ کرنے کے لیے اگر بارود کا استعمال کیا جاتا تو ان کے ایک ساتھ سر پر ٹوٹ پڑنے کا احتمال تھا۔

ایک روز چھت کے ایک شگاف سے جس سے ہر روز تھوڑا تھوڑا پانی ٹپکتا رہتا تھا، معمول سے زیادہ پانی اُبلنے لگا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کنویں کے اوپر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔

پہلے تو وہ اتنے بہت سے پانی سے خوش ہوئے اور اس سے انہوں نے غسل کیا لیکن بعد میں انہوں نے دیکھا کہ نچلے کمرے میں پانی ٹھہرنے لگا ہے اور نچلے اور درمیانی کمروں کے بیچ پر پانی بھرنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ چھت سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اس کا کچھ حصہ جھکا ہوا نظر آنے لگا۔ درمیانی کمرے میں بھی ڈیڑھ فٹ پانی جمع ہو گیا۔

جارج نے کمرے میں پڑا ہوا لکڑی کا ایک سٹول اُٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ اس سے نہ اُٹھ سکا۔ اس نے ٹوشیکا سے کہا "اپنے لیفٹیننٹ سے کہو کہ اس چھت کو سہارا دینے کے لئے اس کے نیچے لکڑی کا سٹول رکھنا ضروری ہے اس سے کہو کہ وہ اس کام میں میری مدد کرے۔"

ٹوشیکا نے ہیراٹا سے جو رائفل لیے مگر خوفزدہ ہو کر چکر لگا رہا تھا، جارج کی بات کہی۔ اس نے غصہ سے کچھ کہا۔

"یہ کیا کہتا ہے؟" جارج نے دریافت کیا۔

"جہنم میں جاؤ" ٹوشیکا نے کہا۔

"تو پھر تم تینوں لڑکیاں میری مدد کرو۔" جارج نے کہا۔ چنانچہ ان چاروں نے مل کر ایک بڑا سا لکڑی کا سٹول اٹھا کر چھت کے نیچے رکھا اور جارج نے ہتھوڑے سے چھت میں شگاف کر دیا۔

ہیراٹا اچانک جارج کی طرف لپکا.....

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''امریکی کتے.....!!'' وہ چیخا۔ اس کے ہاتھ میں سنگین لگی رائفل تھی۔

جارج ایک طرف کود پڑا اور وہاں پڑا ہوا پھاوڑا اُٹھالیا۔

ہیراٹا رائفل تانے جارج کی طرف بڑھا۔ جارج نے پھاوڑا آگے بڑھا دیا اور سنگین کا وار خطا کر دیا لیکن اس کا پھاوڑا ہیراٹا کی گردن میں اُتر گیا اور ہیراٹا کی چیخ نکل گئی.....

اس کے ہاتھ سے رائفل گر گئی۔ جارج نے اپنا پھاوڑا کھینچ لیا۔ ہیراٹا زمین پر پانی میں گر پڑا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن دوبارہ گر گیا اور پھر کبھی نہ اُٹھ سکا۔

کمرے میں پانی گھٹنوں تک آ گیا تھا.....

''ہم ممکنہ اقدام کر چکے ہیں۔'' جارج نے لڑکیوں سے کہا۔

''اب یہاں کچھ کرنا باقی نہیں رہا۔ اوپر کے کمرے میں چلو۔'' وہ تین دن تک خوفزدہ حالت میں اوپر کے کمرے میں رہے۔ وہ بار بار درمیانی کمرے کی طرف جانے والی سرنگ کو دیکھتے تھے۔ انہیں خوف تھا کہ اس کمرے سے پانی کا ریلا اس کمرے میں آ جائے گا۔ چوتھے روز ایسا محسوس ہوا کہ بارش رُک گئی ہے۔ وہ سرنگ سے ہو کر درمیانی کمرے میں گئے۔ وہاں چھت سے معمول سے زیادہ پانی ٹپکنا بند ہو گیا تھا۔ کمرے میں جمع ہونے والا پانی بھی نچلے کمرے میں بہہ گیا تھا۔ ہیراٹا کی لاش پھول کر کپا ہو گئی تھی اور سرنگ کے قریب پڑی تھی۔ جارج نے تینوں لڑکیوں کی مدد سے ایک بکس میں سیمنٹ بھر کر لاش کو دفن کر دیا۔

بارش کے پانی کی نکاسی کے بعد جارج نے تینوں لڑکیوں سے کہا ''اب ہمارے بچاؤ کا ایک ہی راستہ ہے۔ وہ ہے چھت کی کھدائی۔ ہمیں اگر یہاں سے جلدی نکلنا ہے تو ہمیں چوبیس گھنٹے کام کرنا ہوگا۔ ہم سب چھ چھ گھنٹے کی شفٹ میں کام کریں گے۔''

جب جارج نے اپنی شفٹ کا کام پورا کر دیا تو اسے محسوس ہوا کہ اس طرح کام نہیں چل سکتا چنانچہ اس نے دوبارہ بارود کے استعمال کا فیصلہ کیا۔

اس مرتبہ اس نے چھت میں پڑے ہوئے آٹھ انچ گہرے شگاف میں بارود بھرا اور اس کی رسی اتنی لمبی رکھی جو درمیانی کمرے تک جا سکتی ہو۔ اس نے درمیانی کمرے میں جا کر رسی جلائی۔

دھماکہ ہوا۔ چند بڑے بڑے پتھر گرنے کی آواز آئی۔ ایک دن میں انہوں نے تین دھماکے کئے۔ اس کے ساتھ وہ نیچے گرنے والے ملبے کی صفائی بھی کرتے گئے اور بارود بھرنے کے لئے اور کھدائی کرنے کے لئے دیواروں میں پاؤں جمانے کے لئے کیلیں لگانے کا کام اور اس کے علاوہ مچان کو بھی بلند کرنے کا کام جاری رہا۔

انہوں نے 14 ستمبر سے کھدائی شروع کی تھی۔ وہ ہر روز بارود اور کلہاڑیوں کی مدد سے چھت سے آٹھ فٹ کی کھدائی کرنے لگے۔ اب دن میں ان کے دو ہی اہم کام رہ گئے تھے۔ کھدائی اور سونا یا کھانا۔ وہ جب جی چاہتا کھا لیتے تھے۔ صفائی کی کسی کو پرواہ نہ تھی۔ تینوں لڑکیاں دھول اور مٹی سے اٹھڑ کر بھوتنیاں سی لگتی تھیں۔ جارج کا بھی یہی حال تھا۔ وقت گزرنے پر پتھر کم اور دھول اور مٹی زیادہ گرنے لگی۔

کھدائی کے بائیسویں روز جارج اکیلا مچان کی چوٹی پر بیٹھا کام کر رہا تھا۔ مچان اب کافی بلندی تک پہنچ چکی تھی۔

جارج کھدائی میں مصروف تھا کہ اچانک اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر مٹی گرنے لگی جو معمول سے زیادہ تھی۔ وہ خوفزدہ ہو گیا۔ چند ثانیوں کے بعد مٹی کی بارش تھم گئی اور جارج نے کچھ عجیب سا محسوس کیا۔ پہلے تو وہ پریشان ہو گیا پھر اس نے دیکھا کہ فانوس نہ ہونے کے باوجود روشنی آ رہی ہے۔ اس نے اوپر دیکھا۔ اس کے سر سے چند فٹ اوپر ایک شگاف تھا اور اس سے سورج کی روشنی آ رہی تھی۔

اس نے بلند آواز میں نعرہ لگایا۔

"ٹوشیکا..... ہیلن..... میری..... جلدی آؤ، ہم زمین تک پہنچ گئے ہیں!"

پھر وہ شگاف تک پہنچ کر کلہاڑی سے اسے چوڑا کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں تینوں لڑکیاں کیلوں کی مدد سے اوپر آ گئیں۔

جارج نے شگاف کے کنارے پر ہاتھ جمائے اور پورا زور لگا کر اوپر اونچا ہوا۔ اس کا سر اور شانے باہر نکل آئے۔ ایک اور جھٹکا لگانے پر وہ شگاف سے زمین پر آ گیا۔ سورج کی تیز روشنی کی وجہ سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

جارج نے شگاف میں ہاتھ ڈال کر ہیلن، میری اور ٹوشیکا کو باہر نکالا۔ جب انہوں نے اپنے قرب و جوار میں نظریں گھمائیں تو وہ حیران رہ گئے۔ وہ جس ہیروشیما سے واقف تھے وہ روئے زمین سے مٹ چکا تھا۔ انہیں ہر طرف ملبے کے ڈھیر نظر آئے۔ تقریباً تمام عمارتیں مسمار ہو چکی تھیں۔ کہیں کہیں کوئی عمارت نظر آئی بھی تو محض ڈھانچے کی صورت میں۔

وہ چاروں جس جگہ باہر آئے وہاں سے ملبے کی صفائی ہو چکی تھی اور جارج نے اس جگہ کو فوراً پہچان لیا۔ بم گرنے سے پہلے یہ بیس بال کا میدان تھا۔

دُور سے چند امریکی سپاہی اس طرف آ رہے تھے۔ وہ دھول سے اٹے ہوئے چار انسانوں کو زمین سے باہر نکلتے دیکھ کر ششدر رہ گئے!

امریکی سپاہی قریب آئے۔ جارج ان کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ جنگ ختم ہو چکی ہے اور امریکہ فتحیاب ہو چکا ہے۔

اس نے سپاہیوں سے سب سے پہلے یہ سوال کیا کہ "آج کیا تاریخ ہے؟"

سپاہیوں نے بتایا "16 اکتوبر"

"اوہ! تو ہم دو مہینے اس زندہ قبر میں رہے۔" اس نے شگاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

امریکی سپاہی مارے حیرت کے ان چاروں کے چہروں کو تکنے لگے۔

جارج، ہیلن، ٹوشیکا اور میری کو فوجی ہیڈکوارٹر لے جایا گیا۔ وہاں انہوں نے اپنی انوکھی داستان سنائی۔ تینوں لڑکیوں کو ہیروشیما ریلیف بورڈ کے حوالے کر دیا گیا۔

بہادر جنٹ جارج ٹرمبل کو چند دن بعد امریکہ بھجوا دیا گیا جہاں دیگر سپاہیوں کے ساتھ اسے بھی فوج سے چھٹی دے دی گئی۔ جاپانی لڑکیاں اپنے اپنے گاؤں کو چلی گئیں۔

جارج نے ان لڑکیوں سے خط و کتابت کی۔ ہیلن اور میری نے پہلے ہی خط کے جواب میں لکھا..... "ہم اس واقعے کو بھول جانا چاہتے ہیں اس لئے ہمیں مزید خط نہ لکھے جائیں۔"

ٹوشیکا سے تین سال تک خط و کتابت جاری رہی بعد ازاں اس کی منگنی پلینگ کے ایک تاجر سے ہو گئی اور یوں خط و کتابت کا سلسلہ ختم ہوا۔

جارج ٹرمبل اس وقت سول انجینئر ہے۔ اس نے ایک نرس سے شادی کر لی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اب بڑی سے بڑی کھدائی سے بھی نہیں گھبراتا۔